بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ

جنوبی ہند

جس میں

ہندومسلم سیاسی تعلقات کی پانچسو سالہ تاریخ کے علاوہ

زمانہ قدیم سے لیکر انگریزی قبضہ تک ملک کے کل حالات دکھلائے گئے ہیں

از

محمود خاں محمود

مصنف

تاریخ سلطنتِ خداداد (میسور) وناول حیدر علی

مطبوعہ برقی کوثر پریس بنگلور

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول ڈاک

۵۱۳۹

ملنے کا پتہ

محمد سراج الدین بک سلر و پبلشر ڈکنسن روڈ - بنگلور

اُن اربابِ نظر کے نام

جو

ملک میں ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہیں

محمود

فہرستِ مضامین

تاریخ وجیانگر

فہرس تصاویر

ماخذ

فارسی و اردو تاریخیں

۱۔ تاریخ عطائی
۲۔ تاریخ برنی
۳۔ تاریخ وصاف
(ترجمہ از محمد علی بی۔ اے)
۴۔ تاریخ فرشتہ۔ مطبوعہ نولکشور
۵۔ برہان ماثر
۶۔ سیر المتاخرین
۷۔ تحفۃ الاخبار
۸۔ تزک والا جاہی
۹۔ تاریخ بیجانگر
(مولوی بشیر الدین احمد)
۱۰۔ معبر
(حکیم سید شمس اللہ قادری حیدر آباد)
۱۱۔ ملیبار (")
۱۲۔ تاریخ سلطنت خدا داد

انگریزی تاریخیں

۱۔ فرگاٹن ایمپائر از سیول
۲۔ نیو رلوبی فرگاٹن ایمپائر از سوری نارائن راؤ بی۔ اے
۳۔ میسور گزیٹیر از ہیودن راؤ
۴۔ تاریخ میسور از کرنل ولکس
۵۔ میسور گزیٹیر از رئیس
۶۔ دی بگننگس آف سوتھ انڈین ہسٹری از ڈاکٹر ایس کرشنا سامی ائر
۷۔ دی اراویدو ڈینا سٹی از رورنڈ ہراس
۸ سوتھ انڈیا اینڈ ہر محاڈن انویڈرس از ڈاکٹر ایس کرشنا سامی اینگار
۹ سوتھ انڈیا از پین
۱۰ تاریخ ہند از جے۔ سی۔ آلن
۱۱ تاریخ ہند از سر ولیم ہنٹر
۱۲ " کرشنا سوامی اینگار
۱۳ آرین رول ان انڈیا
۱۴ امپیریل گزیٹر آف انڈیا
۱۵ ماڈرن میسور
۱۶ ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن (از ہیگ)
۱۷ میتھک سوسائٹی جرنلس مختلف نمبر
۱۸ جنوبی ہند کے تمام ڈسٹرکٹ گزیٹیرس

دیباچہ

تاریخ جنوبی ہند اردو زبان کے تاریخی لٹریچر میں ایک جدید اضافہ ہے۔ اب تک اردو زبان میں اس ملک کی کوئی مکمل تاریخ موجود نہ تھی۔ یوں تو اکثر و بیشتر سفرناموں اور فارسی تاریخوں میں جن کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے متفرق طور پر اس ملک کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن ان سے صحیح طور پر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ مدارس کی مروجہ تاریخوں میں صرف شمالی ہند کی تاریخ نہایت وضاحت سے لکھی گئی ہے۔ جنوبی ہند کی تاریخ لکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کتابوں میں جنوبی ہند کا ذکر دو چار صفحوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ وہ بھی نہایت درجہ ناکافی اور تشنہ۔ اس لئے عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس ملک کی تاریخ ابھی تک ایک رازِ سربستہ ہے۔

جس وقت میں نے تاریخ سلطنتِ خداداد لکھنے کے لئے کتابیں فراہم کرنا شروع کیا۔ مجھے اس سلسلہ میں چند ایسی کتابیں ملیں جن میں اس ملک کا حال کچھ کچھ تھا۔ اُسی وقت خیال آیا کہ کوشش کیجائے تو ایک مبسوط تاریخ ضرور لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ تاریخ سلطنتِ خداداد ختم کرنے کے بعد میں اس طرف متوجہ ہو گیا۔

اور وہ تمام کتابیں فراہم کیں جن کے نام "فہرست ماخذ" میں دئے گئے ہیں۔ تقریباً پانچ سال کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ آپ کے پیش نظر ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ذلت کے گڑھے میں گھر جاتی ہے۔ تاریخ مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونکتی ہے۔ زندگی کا ولولہ پیدا کرتی اور پڑھنے والوں کو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ تاریخ ہی سے قومیں بنتی ہیں۔ تاریخ ہی سے قوموں کے عروج و زوال کا پتہ ملتا ہے۔ تاریخ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف نے کن موقعوں پر صحیح راہ اختیار کی اور کہاں لغزش کھائی۔ تاریخ صحیح راستے کی راہنما ہوتی ہے اور لغزش سے بچاتی ہے۔ قوموں کو زندہ رکھنے کے لئے تاریخ سے بڑھکر اور کوئی علم نہیں۔ تاریخ ہی قومی روایات کو زندہ اور محفوظ رکھتی ہے

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الابصار

گزشتہ نسلوں کے حالات یقیناً آئندہ نسلوں کیلئے موجب عبرت و بصیرت ہو سکتے ہیں (قرآن حکیم)

تاریخ کی اس اہمیت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ تاریخ ہمیشہ اپنے واقعات کو دھراتی رہتی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج ہندوؤں کے ایک طبقہ میں پھر وہی جوش و خروش پایا جاتا ہے جو آج سے چھ سو سال پیشتر تھا۔ آج پھر وہی آواز ملک میں گونج رہی ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ اور مسلمانوں کو کوئی حق نہیں کہ اس ملک کو اپنا سمجھیں۔ مسلمان ملک میں صرف اس شرط پر رہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی جداگانہ

قومیت کو چھوڑ کر ہندو قومیت میں جذب ہو جائیں۔ اور ہندو اکثریت کی غلامی میں رہیں۔ اس کے خلاف مسلمان اسلامی عالمگیر برادری سے کٹ کر ہندو اکثریت میں مدغم ہونا پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ ملک میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ ہستی تسلیم کرلیجائے جو کہ انہیں فی الحقیقت حاصل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ زمانہ اس مسئلہ کو کس طرح حل کریگا؟

جو مسئلہ آج پیش نظر ہے یہی مسئلہ جنوبی ہند میں سوا چھ سو سال پیشتر بھی موجود تھا۔ اور اس نے مدّتِ دراز تک دونوں قوموں کو علیحدہ اور ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا رکھا تھا۔ آخر تلوار نے فیصلہ کر دیا کہ ملک کس کا ہے۔ خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ آخرکار دونوں قوموں کے ہاتھوں سے تلوار چھین لی گئی۔ اور دونوں ایک تیسری قوم کی غلام بن گئیں۔ ملک ہندوؤں کا رہا نہ مسلمانوں کا، امید تھی کہ غلامی کا احساس دونوں کو کسی ایک صحیح راہ عمل کے تلاش کرنے میں مدد دیگا۔ جس سے ملک آزاد ہو سکے گا۔ لیکن اس کے بجائے یہ نظر آ رہا ہے کہ اختلاف کی خلیج بدستور حائل بلکہ دن پردن زیادہ وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اور خدا جانے اس کی وسعت کہاں تک پہونچے گی۔

ہندو مدت تک اس ملک پر حکمران رہے۔ جب ان میں آپس کی نا اتفاقیاں پھیل گئیں تو انہوں نے مسلمانوں کو حملہ کرنے کی دعوت دی۔ مسلمان اس ملک میں آ گئے۔ اس کے بعد ہندو ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور وہ پھر متحد ہو کر مسلمانوں کو ملک سے نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لئے ملک پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہو گیا۔ اور اب اس بات کو صدیاں گذر چکی ہیں۔

قدرت کا قانون اٹل ہوتا ہے۔ کسی قوم یا جماعت میں حکومت ہمیشہ نہیں رہتی۔ قوموں سے جب وہ صلاحیت فنا ہو جاتی ہے جو حکمرانی کیلئے ضروری ہے تو قدرتِ الہٰی ان پر کسی اور کو مسلط کر دیتی ہے۔ اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ قدرت نے ہندوؤں سے جو سلوک کیا تھا وہی سلوک بعینہ مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا۔ مسلمانوں میں نااتفاقی پھیل گئی۔ ملک ان کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا اور انگریز مسلط ہو گئے۔

مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بيدك الخير۔ انك على كل شئ قدير ؏

(یعنے:۔ اے مالک سلطنت تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں سب خوبی ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے)

ملک پر انگریزی قبضہ ہوتے ہی ہندو مسلمانوں میں محکوم و حاکم کی تفریق مٹ گئی اور دونوں قومیں غلام بنکر رہ گئیں۔ عرصہ کی غلامی کے بعد اب حصول آزادی کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن اس آزادی کے راستہ میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہے وہ ہند و مسلم مسئلہ ہے۔ جو پھر بدقسمتی سے پیدا ہو چکا ہے۔ اور دیکھئے کب تک انہیں غلام بنائے رکھتا ہے۔

ممکن ہے کہ ارباب نظر اس تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ کا کوئی حل سوچ لیں۔ میرا کام صرف تاریخی واقعات کو پیش کرنا ہے۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر یہ میری ناچیز تصنیف قدر دانی کی نگاہ سے دیکھی گئی تو سمجھونگا کہ میری حقیر خدمات قبول ہو گئیں۔

ناچیز

محمود

بنگلور ۱۵ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء

جنوبی ہند کی تقسیم
(زبانوں کے لحاظ سے)
تلنگو زبان
تلنگو زبان
بنگلور
میسور
مدراس
تامل زبان
ترچناپلی
مدورا
بحیرہ عرب
خلیج بنگالہ
بحر ہند
سیلون
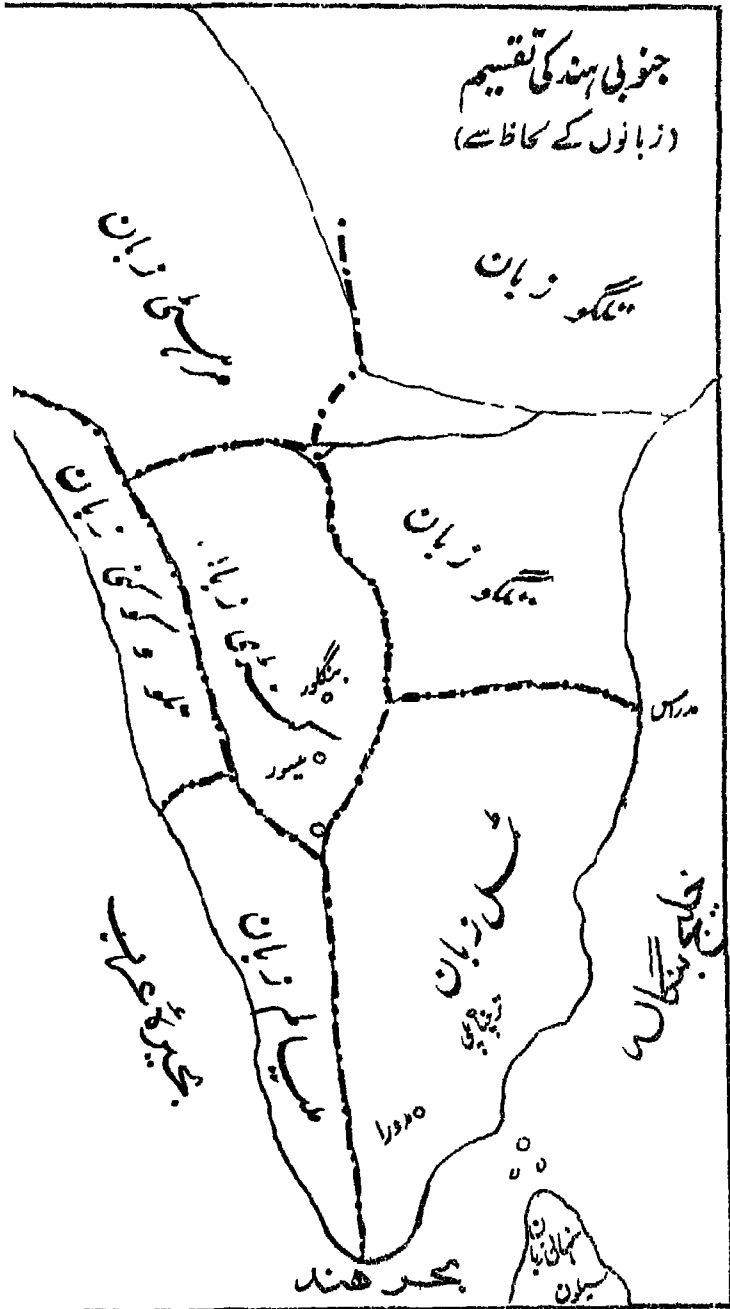
محمود، مصنف کتاب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوبی ہند

قدیم تاریخ

جغرافی حالت

ماہرینِ ارضیات نے جہاں تک پتہ لگایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند برّ اعظم ایشیا کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ایک اور برّ اعظم کا حصہ ہے جس کا نام لیموریا تھا۔ اور جسکی وسعت موجودہ جنوبی افریقہ سے لیکر موجودہ آسٹریلیا تک تھی۔ اس کے ثبوت میں وہ جنوبی آفریقہ، ملایا اور جزائر بحر الکاہل اور جنوبی ہندوستان کی آب وہوا اور پیداوار میں یکسانیت کو پیش کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شمالی ہند سے جنوبی ہند کی آب وہوا اور پیداوار وغیرہ بالکل مختلف ہیں۔ رفتہ رفتہ کرۂ ارض کے تغیر و تبدّل نے برّ اعظم لیموریا کو سمندروں میں چھپا دیا اور صرف جنوبی ہند کا قطعہ باقی رہگیا۔

حدودِ اربعہ

(جزیرہ نمائے ہند کا یہ حصّہ جس کو جنوبی ہند کہا جاتا ہے تین طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اسکے مشرق میں خلیج بنگالہ، جنوب میں بحرِ ہند اور مغرب میں بحیرۂ عرب موجیں مار رہا ہے۔ اب صرف شمالی سمت ایسی ہے جو کسی قدر وضاحت کی محتاج ہے۔

(اگلے زمانے میں اس تمام ملک کو جو بندھیاچل کے پہاڑ سے نیچے ہے۔ دکن یعنے جنوبی ملک کہا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں دکن ملک کے اس حصّے کا نام رکھا گیا ہے۔ جس کا بڑا حصّہ ریاستِ حیدرآباد میں شامل ہے۔ اور جنوب میں دریائے کرشنا اس کی حدبندی کرتا ہے اس لئے مورخین اور اہلِ جغرافیہ نے دریائے کرشنا کو اس ملک کی صحیح شمالی حد قرار دیا ہے اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے جنوبی ہند صحیح طور پر وہ ملک ہے جو شمال میں دریائے کرشنا سے شروع ہو کر جنوب میں راس کماری پر جاکر ختم ہوتا ہے۔)

قدیم تاریخ

ملک کے اس حصّے کی قدیم تاریخ بھی اسی طرح قعرِ گمنامی میں پڑی ہوی ہے جس طرح شمال کی۔ ہاں۔ کہیں کہیں چند آثار قدیمہ مل گئے ہیں۔ جن سے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن صحیح طور پر یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کونسی قومیں آباد تھیں۔ انکا طرزِ حکمرانی، ان کی معاشرت اور زبان کیا تھی۔ کس کس خاندان نے کس کس مدت تک حکومت کی۔

یہ تو صحیح ہے کہ ایک زمانے سے یہاں ڈریویڈین (ڈراوڑی) قوم کی نسل آباد ہے۔ لیکن تاریخ پتہ دیتی ہے کہ جس طرح آرین قوم کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ڈریویڈین قوم شمال سے جلا وطن ہو کر جنوب میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوگئی تھی۔ اسی طرح ڈریویڈین قوم نے بھی اس ملک میں آکر ان قوموں کو جلا وطن کر دیا۔ جن کی نسلیں آج بھی پہاڑوں

اور جنگلوں میں پناہ لیکر زندگی بسر کر رہی ہیں ۔ مدورا ، تنا ولی اور نیلگری کے پہاڑوں میں جو جنگلی قومیں پائی جاتی ہیں وہ انہیں قوموں کی یادگار ہیں۔ آنا ملے پہاڑیوں پر پلیار قوم پائی جاتی ہے ۔ جو جنگلی نباتات ، چوہوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں سے پیٹ بھرتی ہے ۔ منڈوار قوم بھی ابھی تک پہاڑیوں میں خانہ بدوش ہے ۔ یہ اپنے مویشی کے ساتھ پہاڑوں کے دروں اور گھنے جنگلوں میں رہتی ہے ۔ موٹے ہونٹوں والی کدار قوم بھی جو آج صرف شکار پر زندگی بسر کرتی ہے ۔ کبھی اس ملک پر حکمران تھی ۔ نیلگری کی **ٹوڈا** قوم بھی کسی اگلی قوم ہی کی یادگار ہے ۔ سر ولیم ہنٹر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"ساحل ملیبار پر نائر قوم بھی کسی اگلی ہی قوم کی نشانی ہے ۔ اور ان میں شادی بیاہ کا وہی رواج ابھی تک جاری ہے جو ہزارہا سال پیشتر تھا ۔ ایک ایک عورت کئی کئی مرد کر سکتی ہے ۔ لیکن مرد کو اجازت نہیں کہ ایک عورت کے سوا دوسری سے شادی کر سکے ۔ اور ان کی جائداد اپنے بچوں کو نہیں بلکہ بہن کے بچوں کو ملتی ہے ۔ یہ رسم و رواج ہمالیہ اور ہمالیہ کے شمال میں ملکِ تبت میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ اس قوم کے آباؤ اجداد کبھی ہمالیہ کو عبور کرکے یہاں آئے ہوں"

ماہرین علم الانسان نے نتیجہ نکالا ہے کہ جنوبی ہندوستان کی یہ قدیم قومیں یا تو یہاں اس زمانے سے آباد ہیں جب سے دنیا آباد ہوئی ۔ یا اس زمانے میں جب لیموریا آفریقہ اور ایشیا ملکر ایک ہی برِاعظم تھا آفریقہ سے نقل مکان کرکے یہاں آ ئی تھیں ۔ جنگلی اقوام کے گھونگریالے چھوٹے بال ۔ ان کا بونا قد اور سیاہ رنگ اس کی

دلیل ہے کہ یہ اقوام آفریقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان قدیم اقوام کا مذہب اور تمدن کیسا تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مدراس اور چنگل پیٹ کے قریب پتھر کے بنے ہوئے برتن اور ہتھیار جو ملے ہیں وہ انہیں قوموں کی یادگار ہے۔ (مدراس کے عجائب خانہ میں ان کے بہت سے نمونے رکھے ہوئے ہیں۔) اس لئے مورخوں نے اس زمانے کو "پتھر کا زمانہ" لکھا ہے۔ دوسرا زمانہ "لوہے کا زمانہ" ہے ممکن ہے کہ کوئی اور قوم یہاں آئی ہو جو لوہے کا علم رکھتی تھی۔ اس نے لوہے کے برتن اور ہتھیار بنائے۔ (ٹراونکور، نیلگری، بنگلور، اننت پور، بلاری اور کرنول میں بہت سے لوہے کے برتن اور ہتھیار دستیاب ہوئے ہیں۔ جو بنگلور اور مدراس کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔) ان برتنوں پر جو نقوش کندہ ہیں۔ ان سے ان کے تمدن کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ اکثر برتنوں پر بھینس اور بکروں کی تصویریں بنی ہوی ہیں۔ اور ان کے گلوں میں گھنٹیاں بندھی ہوی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھینسوں کے سینگ سنوارنے کا خاص شوق تھا۔ ان نقوش کو دیکھتے ہوے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی یہی بھینس، گائے، بکری، گھوڑے) اونٹ، ہاتھی اور سؤر گھریلو جانور تھے۔ جنگلی جانوروں میں صرف چیتے اور ہرن کی تصویریں ملی ہیں۔ لیکن دوسرے جنگلی جانور جیسے شیر، ریچھ، بندر اور سانپ وغیرہ کی تصاویر ابھی تک نہیں ملیں۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ لوگ ان جانوروں سے بہت خوف کرتے تھے۔ یا انہیں اپنے لئے شگون بد خیال کیا جاتا تھا۔ ہندو مذہب کی تصویروں میں عقاب، شکرہ، باز، ہنس، طوطا اور مچھلی کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن ان اگلی قوموں کی بنائی ہوی تصویروں میں ان کا بھی بالکل

پتہ نہیں ہے۔

ڈریویڈین قوم

قدیم اقوام کے ذکر کے بعد تاریخ میں ڈریویڈین قوم کا ذکر آتا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو جنوبی ہند میں ہر جگہ آباد نظر آتی ہے۔ ڈریویڈین قوم کے متعلق مورخین نے پتہ لگایا ہے کہ یہ دراصل تورانی النسل ہے جو اپنے وطن کو چھوڑکر ہندوستان کے شمال مغربی دروں کے راستے سے ہندوستان میں آکر آباد ہوی اور بعد میں جب آرین اقوام نے اس کو شمالی ہند سے بے دخل کیا تو جنوب میں آکر پناہ گزین ہوگئ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح شمال میں آرین قوم نے ڈریویڈین قوم پر ظلم وستم کیا تھا اسی طرح ڈریویڈین قوم نے جنوب کے قدیم باشندوں پر ظلم کرکے ان کو جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ ڈریویڈین قوم نے جنوبی ہند میں بڑی بڑی سلطنتیں قایم کیں، اوراس زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے تمدن کے انتہائی معراج پر پہونچی ہوی تھی۔ یہاں تک کہ عہدِ عتیق کی کتابوں میں ذکر آیا ہے :-

> "حضرت سلیمان علیہ السلام نے دو بحری مہمیں بھیجی تھیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بندرگاہ ترسیس اوراوفیر سے سونا، چاندی، ہاتھی دانت، بندر صندل اور مور لائیں"

جغرافیہ دان اس پر متفق ہیں کہ ترسیس جنوبی ہند کا ایک بندرگاہ تھا۔ جو اب ناپید ہوگیا ہے۔ صندل اور مور جنوبی ہند کی سوغاتیں ہیں۔ یونانی کتابوں میں چاول کا ذکر آیا ہے۔ جو ہند سے یونان بھیجے جاتے اور وہاں غذا کیلئے استعمال ہوتے تھے۔

"آرین رول ان انڈیا" کا مصنف لکھتا ہے :-

"تامل زبان کے قدیم کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند سے سونا موتی، ہاتھی دانت، چاول، گرم مصالحہ، مور اور بندر ڈریویڈین جہازوں میں بھر کر یوروپ، بابل، نینوا، یونان، رومہ، مصر، چین اور دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے۔ ارض نینوا اور بابل کے کھنڈرات میں ساگوان کی لکڑی دستیاب ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں یہ جنوبی ہند سے لائی گئی ہوگی"

آج اسقدر زمانہ بعد اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ڈریویڈین قوم کا تمدن اس وقت کس قدر شاندار تھا۔ اس قوم نے جنوب میں آکر قدرت کی فیاضیوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ سونا اور جواہرات کے استعمال کو جانتی تھی۔ سونا، ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھروں کی کانیں ڈریویڈین قوم نے ہی دریافت کیں۔ اس کا ثبوت ان کتبوں سے ملتا ہے۔ جو ان کانوں کے قریب دستیاب ہوئے ہیں۔ جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر مناور ڈریویڈین قوم کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ اور اس قوم نے فن تعمیر کو اس درجہ پر پہونچایا کہ ایک خاص قسم کا طرز تعمیر اس قوم کے نام سے ہی منسوب ہوگیا ہے۔ جس کو انگریزی میں "ڈریویڈین سٹایل" یا "ڈراوڑی طرز تعمیر" کہا جاتا ہے۔ اس طرز تعمیر کی عمارتوں کا بہترین نمونہ کنجی ورم اور مدورا کے مندروں میں ملتا ہے۔ جنوب کی پانچ زبانیں جن کا ذکر آگے آئیگا اسی قوم کی یادگار ہیں۔ اور ابھی تک شمرو ج ہیں۔

آرین قوم تمام مورخین کو اتفاق ہے کہ آرین قوم وسط ایشیا سے نکل کر

کشمیر اور افغانستان کی راہ سے شمالی ہندوستان میں آئی اور یہاں کے اصلی باشندوں پر ظلم وستم کرکے ان کو جلا وطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور اس تمام ملک کا نام ہندوستان رکھا۔ ہندو کے معنی سیاہ رنگ کے بھی اور غلام کے بھی ہیں۔ آرین قوم رنگ میں سفید فام تھی۔ شمال کی آب وہوا نے اس کو نہایت مضبوط و جفاکش بنا دیا تھا۔ اس لئے اس نے آسانی سے ملک کے ان باشندوں پر فتح پائی جو نامعلوم زمانے سے یہاں آباد تھے۔ اور اپنی تہذیب اور مذہب کا رواج دیا۔

مسٹر وہیم ہنٹر اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے :۔

"وید کی نظموں میں آرین قوم کی ترقی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ پچھلی نظموں میں ان کے اصلی وطن کا ذکر ہے۔ بعد میں دریائے سندھ اور کوہ ہمالیہ کا تذکرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح یہ قوم آہستہ آہستہ ہندوستان میں اپنا قدم جماتی چلی گئی۔ رگ وید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آکر یہ قوم مختلف طبقوں میں تقسیم ہو گئی۔ کبھی متحد ہو کر سیاہ فام قوموں پر حملہ کرتی تھی اور کبھی آپس ہی میں خانہ جنگیاں ہوتی تھیں۔"

آرین قوم جس خدا کا اعتقاد لیکر ہندوستان میں آئی۔ اس کے متعلق یہی مورخ لکھتا ہے :۔

" انہیں صرف ایک خدا پر اعتقاد تھا۔ اسکے متعلق رگ وید میں یہ نظم موجود ہے :۔

ابتدا ایک سنہری بچے سے ہوئی۔

اسی نے زمین اور آسماں بنائے ۔

ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں۔

وہی ہے جو ہم کو زندگی اور طاقت بخشتا ہے۔

اسی کے حکم پر تمام دیوتا جھکتے ہیں۔

اسی کا سایہ رحمت ہے ۔

اسی کا سایہ موت ہے ۔

ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں۔

وہی ایک بادشاہ ہے جس کی طاقت سے دنیا سانس لیتی ہے اور وہ

زندہ ہے ۔ وہی ہر جاندار پر حکومت کرتا ہے ۔

ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں ۔

وہی ہے ۔ جس کی قدرت سے آسمان چمکدار اور زمین مضبوط بنی ۔

اسی کے حکم سے آسماں بنا ۔ وہ آسمان جو اونچا ہے ۔

اسی نے ہوا اور روشنی بنائی ۔

ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں ۔

وہی ہے جو ابر پر حکمرانی کرتا ہے۔

وہی سب خداؤں کا خدا ہے ۔

ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں ۔"

لیکن بعد میں ہندوستان کی زرخیزی نے انہیں مسحور کر دیا اور وہ ان قدرتی ذرائع

کو جنہوں نے ہندوستان کو زرخیز بنا رکھا تھا اپنا معبود سمجھ لیا ۔ نئے نئے دیوتا پرستش

کے لئے بنائے جانے لگے۔ لیکن یہ دیوتا ہندوستان کے باشندوں کے دیوتاؤں سے بالکل جدا تھے۔ ہندوستان کے قدیم دیوتاؤں کا انہوں نے تمسخر اڑایا انکو سیاہ رنگ کا بتایا گیا اور انہیں "بھیانک" لکھا جانے لگا۔

آرین قوم کو ہندوستان میں آئے ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ ان کا مذہب اور کلچر ایک نئے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اب شمال پر قانع نہ ہو کر وہ جنوبی ہند پر بھی حملہ آور ہوئے۔ مسٹر آر۔ جی بھنڈارکر (جو جنوبی ہند کی تاریخ کے لئے ایک سند مانے جاتے ہیں) لکھتے ہیں:۔

" یہ حملے قریباً ساتویں صدی قبل مسیح شروع ہوئے۔ اور ان کا سلسلہ چوتھی صدی تک رہا"

اس تمام عرصہ میں یعنے چار سو سال تک آرین اور ڈریویڈین قومیں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں۔ اس قدر کشت و خون کے بعد رفتہ رفتہ زمانے نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے میں جذب کر دیا۔ اور ان دونوں قوموں کے اتصال سے ایک نئے مذہب، نئے کلچر اور نئی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ جس کو ہندو مذہب کہا جاتا ہے۔ مگر اس مذہب کی بنیاد چھوت چھات، اعلیٰ اور ادنیٰ اور نسل و رنگ کے امتیاز پر رکھی گئی۔ یعنے آرین قوم نے یہاں کے باشندوں کو ایک ایسے ساحرانہ فریب میں مبتلا کر دیا جس کی تہ تک ان کی عقلوں کی رسائی نہیں ہو سکی۔ ان سے کہا گیا:۔

"آخر برہمن (آریہ) کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار کیوں ہے۔ برہمن بذات خود کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ یہ صرف ان نیک کاموں کا جو اس نے اگلے جنم میں کئے تھے اجر ہے۔ موت کے بعد تمہاری زندگی میں بھی انقلاب آنے والا ہے

اور آئندہ جنم میں تم خود بھی برہمن پیدا ہوں گے ۔ اور تمہاری عبادت کو دنیا تسلیم کریگی ۔"

اس کے ثبوت میں آرین رول ان انڈیا کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۴ پر لکھتا ہے :-

"برہمنوں کیا دوسرے الفاظ میں آرین ظلم وستم کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ جب کسی قوم میں حکومت آجاتی ہے تو وہ ظالم بن جاتی ہے ۔ لیکن ذہنی ظلم ایک ایسا ظلم ہے جو بہ نسبت جسمانی ظلم کے آسانی سے سہا جا سکتا ہے ۔ برہمن قوم نیچر فطرت انسانی سے بہت زیادہ واقف تھی اس راز کو پا لیا تھا ۔ جس کو موجودہ زمانے میں یورپ آہستہ آہستہ اختیار کر رہا ہے ۔ وہ راز یہ ہے کہ تمام انسان بلحاظ پیدایش یکساں نہیں ہوتے ۔ اگر ہر ایک کو مساوات دیدی جائے تو تمدن کو ایک سخت دھکا لگیگا ۔"

مذہب کے اس چکر میں ڈریویڈین قوم پھنس کر رہ گئی ۔ اس کو احساس تک نہیں ہوا کہ "مذہب کا یہ اصول" انکی قومی زندگی کیلئے کس قدر تباہ کن اور مہلک ہے ۔ ان کے دلوں کی طمانیت کے لئے یہ نظریہ موجود تھا کہ آئیندہ زندگی میں وہ بھی آرین قوم کی ہمسری کر سکیں گے ۔ اس لئے انہوں نے اس نئے اصول کو تسلیم کر لیا ۔ جس کو ہندو مذہب کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے ۔ اس نظریہ کو تسلیم کرا لینے کے بعد راستہ بالکل صاف تھا کہ ہر قوم کو اس میں جذب کر لیا جائے ۔ اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مذہب کسی ایک خاص تہذیب و مذہب کا نام نہیں ۔ بلکہ مجموعہ ہے ۔ مختلف تہذیبوں مختلف عقاید اور مختلف کلچروں کا جو ایک دوسرے میں ایک نامعلوم زمانے سے جذب ہوتے آئے ہیں ۔ ان مختلف عناصر یعنے مختلف کلچروں اور مختلف مذاہب کے مجموعہ کا بین نمونہ اگر

تمام ہندوستان میں کہیں ہے تو وہ جنوبی ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ جہاں اعلیٰ ذاتوں میں ہی نہیں بلکہ پنچ ذات والوں میں بھی رسم و رواج اور عقائد میں اس قدر فرق ہے۔ کہ ایک دوسرے میں شادی بیاہ نہیں ہوسکتا لیکن جو چیز ان میں مشترکہ ہے وہ برہمن کی "فضیلت" ہے۔ جو ان قوموں کے دلوں پر نقش ہو گئی ہے۔ ان کے ہر رسم و ہر عبادت میں برہمن کی راہنمائی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

(نوٹ: مذہب کے پردے میں جو تسلط کہ آرین قوم (برہمن) کو حاصل تھا۔ آج بھی برہمن اسی تسلط کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے مندروں میں اچھوتوں کے داخلہ کی تحریک کی مخالفت کی جارہی ہے۔ اگر مدراس سے شایع ہونے والے ہندو اخبارات کا ۱۹۳۷ء سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک کی مخالفت کے اصلی اسباب کیا ہیں۔ یہاں ان تحریروں کا صرف لب لباب دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔)

"اگر مندروں میں اچھوتوں کو داخلہ کی اجازت دی گئی اور چھوت چھات کو دور کر دیا گیا تو ہندو مذہب کا شیرازہ بکھر جائیگا۔ اس لئے کہ ہندو سوسائٹی کی ترکیب ہی مختلف عناصر سے ہے۔ اور جب یہ عناصر بکھر کر رہجائیں گے تو ہندو سوسائٹی بھی فنا ہو جائے گی۔"

اس کا مزید ثبوت سوامی شنکراچاریہ کی اس تقریر سے ملتا ہے جو اخبار ہندو مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۹ء میں شایع ہوی ہے۔)

یہ آگے لکھا جا چکا ہے کہ آرین قوم شمال پر قانع نہ ہوکر جنوبی ہند پر بھی حملہ آور ہوئی۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی زمانے میں اسوراس اور راکش قومیں آباد تھیں جو ڈریوڈین قوم کی شاخیں تھیں۔ لیکن دراصل یہ وہ نام ہیں جو آرین قوم نے

یہاں کے باشندوں کو ان کے اوضاع و اطوار، ان کے رنگ روپ، ان کی جفاکشی اور جنگلی بود و باش کو دیکھکر رکھا تھا۔ ان ہی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آرین قوم پہلے پہل ان جنگلی اقوام پر حملہ آور ہوئی وہ ہیہیاس کہلاتی تھی۔ اس کے بعد مہابھارت اور راماین کے ہیرو اس سرزمین پر نظر آتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں کشکندہ نامی کوئی حکومت تھی۔ جو موجودہ ریاستِ میسور کے شمال اور علاقۂ بمبئی کے جنوب میں تھی۔ رام چندر جی، سیتا جی اور لچھمن جی اسی جگہ آکر ٹھہرے تھے۔ جہاں اب سرینگری کا مشہور تیرتھ گاہ ہے۔ یہاں سگریو نامی بادشاہ تھا۔ جس نے راون کے مقابلہ میں رام چندر جی کو مدد دی۔ اسی بادشاہ کے سپہ سالار کا نام ہنومان تھا۔

مورخ رئیس اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۷۰ پر لکھتا ہے:۔

"سلطنتِ کشکندہ کے شاہی علم پر بندر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ہنومان کی سپاہ سالاری میں کشکندہ کی فوج نے رام کی مدد کرتے ہوئے لنکا (سیلون) پر چڑھائی کر کے سیتا کو راون کی قید سے نجات دلائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آگے چلکر ہندؤں نے فوج اور سپہ سالار کو ہی بندر سمجھ لیا"

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہاں کی قوموں میں بندر کی پرستش ایک نامعلوم زمانے سے ہو رہی تھی۔ جسطرح صدہا اور مذہب ہند و تمدن و مذہب میں جذب ہو کر انہیں کا ایک جزو بنگئے اسی طرح بندر پرستی بھی ہند و مذہب کا جزو بنگئی۔

(نوٹ:۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بندر پرستی کا رواج ڈریویڈین قوموں میں کب سے جاری ہوا۔ اگلی قوموں میں بندر کی پرستش نہیں ہوتی تھی۔ آرین قوم بھی بندر پرستی نہیں کرتی تھی۔)

اس زمانے کے بعد پانڈو اور کورو خاندانوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن کسی واقعہ اور

کسی تاریخ کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ جن واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ ان پر ہندوؤں کے مذہبی عقاید کا نہایت گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے ۔ جس طرح مہا بھارت اور راماین میں واقعات بیان کئے گئے ہیں ۔ یہاں کی تاریخ کی بھی وہی حالت ہے ۔ مثال کے طور پر پانڈو خاندان کے حالات سے ایک واقعہ یہاں لکھا جاتا ہے :۔

"مہیس متی میں نیلا راجہ حکمران تھا ۔ جس کی پری پیکر بیٹی پر اگنی دیوتا عاشق ہو گیا تھا ۔ اور ان دونوں میں ناجائز تعلقات بھی قایم ہو گئے ۔ اگنی دیوتا اس نازنین کے پاس برہمن کے روپ میں چھپا ہوا آتا تھا ۔ لیکن ایک دن محل کے پہرہ داروں نے اس کو پکڑ کر راجہ کے آگے پیش کر دیا ۔ راجہ نے اس کے لئے سخت سزا تجویز کی ۔ لیکن اسی وقت اگنی دیوتا اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو کر برس پڑا ۔ راجہ اور درباریوں نے ڈر کر اس کی خوشامد شروع کی ۔ جس سے خوش ہو کر اس نے مہیس متی کی تمام عورتوں کو شادی کی رسم سے آزاد کر دیا ۔"

اسی لئے آج تک بھی نمبودری اور نائر قوم میں شادی کا رواج نہیں ۔ بلکہ آزاد محبت کی رسم جاری ہے۔ (تاریخ ریس صفحہ ۲۸۰)

(نوٹ :۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ مہیس متی میسور کا نام ہے ۔ لیکن یہاں نمبودری اور نائر قومیں آباد نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مہیس متی نام کا کوئی شہر اس وقت ملیبار میں ہوگا یا ممکن ہے کہ اس وقت کوئی ملیباری قوم میسور پر حکمران رہی ہو)

ملک کی سیاسی تاریخ پر اس قدر گہرا پردہ پڑا ہونے کے باوجود بھی تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جنوبی ہندوستان کا یہ عہد یعنے جب آریں اور دریوڑین قومیں ایک

دوسرے میں مل چکیں تو ملک میں ایک نئے اور شاندار باب کا افتتاح ہوا۔ ہندو تاریخ کا یہ عہد جو تیسری صدی قبل مسیح شروع ہوا نہایت شاندار تھا۔ اس کا ثبوت ان تحریروں سے ملتا ہے جو غیر ملکی سیاحوں نے لکھی ہیں جن کا ذکر آگے آئیگا۔ افسوس ہے کہ ہندو قوم جہاں تمدن کے انتہائی معراج کو پہونچی۔ وہاں اس نے تاریخ سے اس قدر چشم پوشی کی کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ ایک خیال یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی سے ہندو نا آشنا تھے۔ لیکن ایک اور خیال بھی ہے کہ ہندو مذہب کی سیادت کی باگ صرف برہمن قوم کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس نے اپنی تمام قوت اپنی فوقیت اور فضیلت دکھانے پر صرف کردی۔ اس لئے صرف اس لئے کہ انکی سیادت ہمیشہ کے لئے دوسری اقوام کے دلوں پر ثبت ہو جائے۔ اور کبھی ان میں سرکشی کی جرأت پیدا نہ ہو۔ ورنہ اگر تاریخی واقعات لکھے جاتے تو دوسری ذاتوں اور دوسرے لوگوں کی فضیلت بھی ثابت ہو جاتی۔ جو برہمن مفاد کے خلاف اثر پیدا کرتی۔

جہاں تک خیال جاتا ہے برہمن قوم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ آج دو ہزار سال گذر جانے کے بعد بھی ان کی مذہبی سیادت کا سکہ دلوں پر اسی طرح منقش ہے جس طرح اس زمانے میں تھا ایک ہندو خواہ وہ اعلیٰ ذات ہی کا کیوں نہ ہو کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ وہ برہمن کا ہمسر ہو سکتا ہے۔ اس کو توہمات نے اس قدر گھیر لیا ہے اور اس کا یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ برہمن کی ذراسی ناراضگی یا حکم عدولی اس پر آفات ارضی و سماوی لا سکتی ہے۔ ہزارہا سال کی ہندو حکومت نے جو ان قوانین پر سختی سے عمل کرتی رہی ہے۔ ہندو قوم کی عموماً اور نیچ ذات والوں کی خصوصاً ذہنیت ہی بدلکر رکھدی ہے۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند میں بہت

سے نیچ ذات کے ہندؤں کے نام کے ساتھ لفظ داس لگا ہوا ہے۔ جس کی معنی غلام کے ہیں
اور یہ وہ نام ہے جو آرین قوم نے انہیں دیا تھا۔ لیکن آج اگر اس ذات کے ایک ہندو
سے یہ کہا جائے کہ اپنے نام سے داس کے لفظ کو حذف کر دے تو وہ اس پر آمادہ نہ ہوگا
صرف اس خوف سے کہ کہیں دیوتاؤں کا قہر اس پر نازل نہ ہو جائے۔ اور یہ اسی برہمن اثر
واقتدار کا نتیجہ تھا کہ جب بودھ مذہب نے تمام شمالی ہندوستان کی کایا پلٹ کر رکھدی، تو
جنوبی ہند اس سے بالکل محفوظ رہا۔
مغربی مورخین نے یہ بالکل سچ لکھا ہے :-

"تمام ہندوستان میں جنوب ہی ایک ایسا خطہ ہے جس کو ہندو مذہب کا محفوظ
قلعہ کہا جا سکتا ہے"

اور آرین رول ان انڈیا کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۲ پر لکھتا ہے :-

"یہ جنوبی ہند کی ڈریویڈین قومیں ہی ہیں۔ جنہوں نے آرین مذہب کو بچا
رکھا ہے اگرچہ وہ اپنے رسم و رواج اور عقاید کو اس میں شامل کر دئے
ہیں۔ شمالی ہند میں جب نئی قوموں کی آمد کی وجہ سے آرین روایات پر زوال
آنا شروع ہوا تو یہ جنوبی ہند کے برہمن ہی تھے جو ویدک لٹریچر کو محفوظ
رکھنے ہوئے بودھ مذہب کے خلاف ایک مضبوط محاذ قایم کئے اور بعد میں
جب مسلمان حملہ آور آرین تہذیب اور آریاؤں کی سیاسی تنظیم کو شمال
میں درہم و برہم کر رہے تھے تو یہ جنوبی ہند کے راجہ ہی تھے۔ جنہوں نے
ان روایات کو پناہ دی"

معاشرت آج بھی جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر علاقوں میں قدیم معاشرت کا نمونہ

نظر آتا ہے۔ وہی دھوتی یا لنگوٹی ہے جو ہزار ہا سال پیشتر تھی بالائی جسم پر کوئی کپڑا پہنا نہیں جاتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک اور کپڑا جسم کے اس حصّہ پر اوڑھ لیا جاتا ہے۔ عورتوں میں چولی اور کرتے کا رواج نہیں۔ سوائے ان علاقوں کے جہاں میسور کی اسلامی حکومت نے اسکو رواج دیدیا تھا۔ ملیبار کی بعض قوموں میں عورتیں صرف ایک کپڑا باندھتی ہیں اور وہ بھی پستانوں کے نیچے۔ اگر وہ پستانوں سے اوپر باندھیں تو اعلیٰ ذات کی توہین سمجھی جاتی ہے۔

غذا تمام ملک کی غذا آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ یعنے چاول لیکن ان علاقوں میں جیسے میسور ہے غریب طبقہ اور متوسط طبقہ راگی کا استعمال کرتا ہے۔ اضلاع کڑپہ، کرنول، بلاری اور اننت پور میں جوار کا استعمال ہے ملی جو اس خطۂ ملک کی خاص پیداوار ہے۔ سالن میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے پورے جنوبی ہند میں کوئی گھر ایسا نہیں۔ جہاں یہ استعمال نہ ہوتی ہو۔

تمدّنی حالت جنوبی ہند کے اکثر شہروں کا قدیم نقشہ اگر دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہر کے وسطی حصّہ میں برہمن رہتے تھے۔ اس کے باہر کا حصّہ فوجیوں کے لئے مخصوص تھا۔ تیسرا حصّہ ویش یعنے مختلف پیشہ ور اور تاجروں کے لئے تھا۔ تو شہر کا سب سے باہر کا حصّہ شودروں یعنے غلاموں کے لئے تھا۔ اور اچھوتوں کیلئے آبادی سے بہت دور جگہ دی جاتی تھی۔ شہر کی آبادی مربعوں میں رہتی تھی۔ نقشہ اس طرح ہے۔

اچھوت
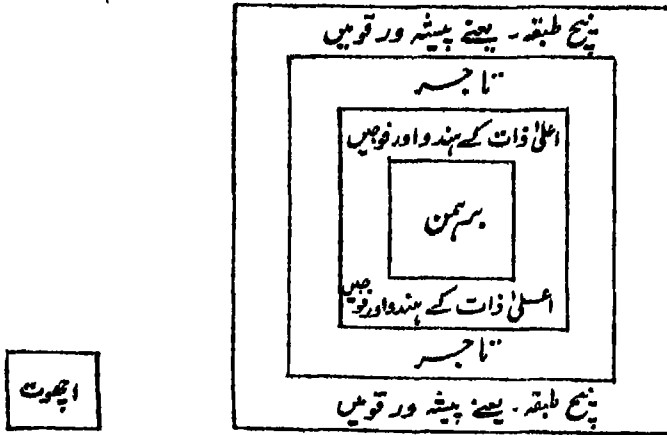
نسل انسانی میں رنگ و خون کا امتیاز آج دنیا میں یوروپ کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ ہندوستان میں یہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ آرین قوم کو اپنے رنگ اور خون پر ناز رہا۔ اور مذہبی نظموں میں اپنے دیوتاؤں کو سفید رنگ کا بتلا کر انہیں سراہا گیا ہے۔ اور غلاموں کے دیوتاؤں کو سیاہ اور ڈراؤنی شکلوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ غرض اس خطہ ملک میں یہ رنگ و خون کا ڈراما ایک دو نہیں، سو دو سو نہیں۔ بلکہ ہزارہا سال سے کھیلا جا رہا ہے۔

(نوٹ :۔ شمالی ہند میں برہمن کے بعد درجہ میں چھتری قوم پائی جاتی ہے۔ لیکن جنوبی ہند میں یہ قوم نہیں پائی جاتی۔ اسکے عوض ڈریویڈین قوم کے اعلیٰ ذات کے لوگ یہ درجہ رکھتے ہیں۔ اس سے بعض مورخوں کا خیال ہے کہ چھتری قوم یا تو یہاں فنا ہو گئی یا ڈریویڈین قوم کی اعلیٰ ذاتوں میں ضم ہو کر رہ گئی۔ اس لئے جنوب میں آرین خون اگر کسی قوم میں باقی ہے تو وہ صرف برہمن قوم ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جنوبی ہند کے تمام برہمن آرین ہیں۔ ان میں بہت سے ڈریویڈین برہمن

بھی ہیں۔ جو اپنے آپ کو رشی اگستیا کی اولاد کہتے ہیں۔ یہ رشی جنوبی ہند میں تبلیغ مذہب کے لئے آیا تھا۔ اس رشی نے ڈراویڈین عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ اور جو اولاد اس رشی سے ہوئی ڈراویڈین برہمن کے نام سے منسوب ہوئی۔)

پردہ کا رواج

قدیم کتبوں اور تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آرین قوم ہی تھی جس نے اس ملک میں پردہ کا رواج قایم کیا۔ اس سے مقصد ان کی عصبیت کی نگرانی تھی کہ عورتوں کی بے پردگی سے کہیں ان کے خون میں دوسرے اقوام کا خون جن کو وہ اپنے سے ادنیٰ سمجھتے تھے مل نہ جائے۔ آج بھی ہندو راجاؤں کے گھرانے پردے کے پابند ہیں۔

زبانیں

آج ملک کے اس حصہ میں مندرجۂ ذیل زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سوائے اردو زبان کے باقی تمام زبانیں قدیم زمانے میں بھی مروج تھیں۔

تلنگی، ٹمل، کنڑی، ملیالم، تلو اور اُردو۔

تلگو زبان

شمال میں ملک اڑیسہ سے لیکر جنوب میں ضلع نلور تک، اور مشرقی ساحل ہند سے مغرب میں ملک مہاراشٹر تک مروج ہے۔ حیدرآباد اور حیدرآباد سے جنوب میں اضلاع کڑپہ، کرنول اور بلاری و اننت پور کے کچھ حصوں میں بھی بولی جاتی ہے۔

ٹمل یا اروی زبان:۔ مدراس سے اگر ایک خط مستقیم بنگلور تک کھینچ دیا جائے تو جنوب میں تناولی تک یہی زبان مروج ہے۔

کنڑی زبان:۔ تمام ملک میسور۔ ملک مہاراشٹرا تک اور ضلع اننت پور و بلاری کے کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہے۔

ملیالم زبان:۔ جنوبی کنڑا، ملیبار، کوچین اور ٹراونکور میں مروج ہے

تلو زبان :- ملک کوکن اور شمالی کنارا میں بولی جاتی ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ جنوبی ہند میں ان پانچ زبانوں کے پیشتر بھی کوئی ایک اور زبان تھی جو مفقود ہو گئی ہے۔ بمعہ رام پلی کے کھنڈرات میں جو ضلع اننت پور کے شمال میں ہے۔ چند ایسے کتبے دیکھے گئے ہیں۔ جن کی زبان ان پانچ زبانوں سے بالکل علیحدہ ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جو الفاظ ان کتبوں میں ہیں۔ ان میں اگر کوئی لفظ تلگو زبان کا ہے تو کوئی ٹامل کا اور کوئی کنڑی کا ہے تو کوئی سنسکرت کا۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان زبانوں کے مروّج ہونے سے پیشتر کوئی ایک اور زبان تھی۔ اور اسی سے یہ پانچ زبانیں نکلی ہیں۔ اور بعد میں آرین قوم کے حکمران ہونے کی وجہ سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ ان پانچ زبانوں کی ماں سنسکرت زبان ہے۔ ڈریویڈین قوم بھی ترکستان سے آئی ہوئی تھی اور آرین قوم بھی۔ اس لئے ممکن ہے کہ سنسکرت زبان اور اس دوسری زبان میں جس سے یہ جنوبی ہند کی مروجہ پانچ زبانیں نکلی ہیں کوئی زیادہ فرق نہ ہو۔

ان زبانوں کے علاوہ مقامی طور پر اور چند زبانیں رائج ہیں۔ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ انہیں پانچ زبانوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ جیسے کورگی، بلارا، توڈا کوٹا، بڈگا، ارولا، کرمبا، کونکنی، ٹپنولی، لمباڑی، کوروا، وڈری وغیرہ

اُردُو زبان :- زبان یا معاشرت کے لحاظ سے جنوبی ہند کے مسلمان دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقہ تو دکنی اور نوائط مسلمان کہلاتا ہے۔ اور دوسرے طبقے میں ماپلے، مرکیار اور لبے وغیرہ ہیں۔ دکنی اور نوائط مسلمانوں کی زبان ہر جگہ اردو ہے۔ مالابار کوچن اور ٹراونکور کے مسلمانوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ جنوب میں لبے اور مرکیاروں کی

مادری زبان ٹمل ہے۔ لیکن اب ہر جگہ اردو زبان کا رواج ہو رہا ہے۔

جنوبی ہند تاریخ کی روشنی میں

جنوبی ہند کی قدیم تاریخ کا سربستہ راز اسکندر اعظم کے اس حملہ کے بعد کھلتا ہے جو اس نے شمالی ہند پر ۳۲۶ء قبل مسیح کیا تھا۔ کچھ حال تو یونانی اور دوسرے ممالک کے سیاحوں نے لکھا ہے۔ اور کچھ اس زمانے میں قدیم کتبوں سے حاصل ہوا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر اعظم کے حملے کے وقت اس ملک میں چندر گپتا کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے بعد ستنیاون، کڈمبا، مہاولی، ونیڈمبا، پلاوا، نولمبا، گنگا، راکشترا، کلچوری، چیرا، چولا، چلوکیا، پانڈیا، یڈوا اور ہوئے سالا خاندان یکے بعد دیگرے اور کہیں کہیں بیک وقت بھی حکمرانی کرتے تھے۔

ستنیاون خاندان

معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان میں سات راجہ گذرے ہیں۔ اور انہوں نے سوا سو سال تک حکومت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس حکومت کا زمانہ دو سو سال قبل مسیح تھا۔

کڈمبا خاندان

اس خاندان کی حکومت کا عہد اور زمانہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ مایور ورما اسی خاندان کا بانی تھا۔ اس کی تخت نشینی کے متعلق مشہور ہے:-

"ایک شب ایک برہمن کے گھر میں چور گئے۔ اسی وقت ایک مرد نے جو انگن میں تھا۔ شور مچانا شروع کیا۔ چور باہر ہی ٹھہر گئے۔ انہوں نے سنا

کہ برہمن ہنس ہنس کر اپنی عورت سے مور کے متعلق کہہ رہا ہے۔ "کسی زمانے
میں یہ مور برہمن تھا۔ اس برہمن نے بادشاہ بننے کے خیال سے خوب ریاضت
کی تھی۔ ایک دن مراقبہ میں غیب سے اس کو یہ آواز آئی کہ وہ دنیا
میں دوسری دفعہ مور کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اور جو شخص بھی اس کا سر
کھائیگا وہ بادشاہ بنے گا" یہ سن کر چوروں نے مور کو پکڑ لیا۔ اور لیجا کر
ایک عورت کو دیا کہ اس کو ذبح کر کے جلد تیار کرے۔ وہ دیکھنا چاہتے
تھے کہ سر کس کے حصہ میں آتا ہے۔ جب سالن پک کر تیار ہوگیا تو اس
عورت کا چھوٹا لڑکا آیا اور بغیر کسی سے پوچھے مور کا سر اٹھا کر کھا گیا
چور اس لڑکے کو لیکر بنواسی میں آئے۔ اس دن یہاں کا راجہ مر
چکا تھا۔ اور قدیم رواج کے مطابق ہاتھی اپنی سونڈ میں پھولوں کا ہار
لئے پھرتا تھا۔ ہاتھی نے ہار اس لڑکے کے گلے میں ڈال دیا۔ لڑکا تخت
نشیں ہوا۔ اور اسی سے کڈمبا خاندان کی بنیاد پڑی۔" (تاریخ ریس)

مہاولی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان نہایت قدیم تھا۔ اور اس
کی حکومت بارہ ہزار گاؤں پر تھی۔ اور پایۂ تخت مدراس سے تیس میل
پر کھنی ورم کے قریب تھا۔ ہندو مذہب کی روایات میں ہے کہ کرشن جی نے دوارکا سے
آکر اس شہر کا محاصرہ کیا تھا۔ اس خاندان کا جو کتبہ ملا ہے۔ اس پر ۳۳۹ء قبل مسیح کندہ
ہے۔ مورخوں نے اس خاندان کے گیارہ بادشاہوں کے نام کا پتہ لگایا ہے۔

ویڈمبا اس خاندان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کالنگا کے راجہ نے اس
خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ اور چولا خاندان کے راجہ

پران ہکانے ویڈمبا خاندان سے سلطنت چھین لی ۔

نولمبا اس خاندان کے گیارہ راجاؤں کے نام معلوم ہوئے ہیں۔ لیکن انکی مدت حکومت کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا ۔

پلاوا اس خاندان کے راجاؤں کے اب تک ۳۴ نام معلوم ہوئے ہیں۔ اور ان کی حکومت کا زمانہ تیسری صدی بعد مسیح سے دسویں صدی تک ہے ۔

گنگا اس خاندان میں ۲۳ راجہ گذرے ہیں۔ اور ان کی حکومت کا زمانہ پہلی صدی بعد مسیح سے دسویں صدی تک ہے۔

چلوکیا اس خاندان نے پانچویں صدی بعد مسیح سے آٹھویں صدی بعد مسیح تک حکومت کی ہے۔ اس خاندان میں تیرہ راجہ گذرے ہیں۔ اسی نام کا ایک اور خاندان مشرقی حصے میں حکومت کرتا تھا۔ اس کو مشرقی چلوکیا کہا جاتا ہے۔ اس خاندان میں ۲۷ راجہ گذرے ہیں۔

راکشترا اس خاندان میں ۱۸ راجہ گذرے ہیں۔ ان کا زمانہ غالباً چھ سو سال بعد مسیح سے شروع ہوکر ۹۷۳ عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ اسی خاندان نے چلوکیا خاندان کی حکومت غصب کر لی تھی۔ لیکن آخر میں پھر چلوکیا خاندان غالب آگیا۔ اور دوبارہ چلوکیا خاندان کے گیارہ راجہ ۹۷۳ء سے ۱۱۸۹ء تک حکومت کرتے رہے ہیں۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں اور کینچی کے پلاوا خاندان میں ہمیشہ جنگیں ہوتی رہیں۔

کلچوری کلچوری خاندان کے پانچ راجہ گذرے ہیں۔ ان کا زمانہ ۱۱۵۶ء سے ۱۱۸۳ء تک ہے۔

چولا

اس خاندان کے ساٹھ راجہ گذرے ہیں۔ جن کا زمانہ نویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک ہے۔

ہوسے سالا

اس خاندان میں گیارہ راجہ گذرے ہیں۔ انکا زمانہ سنہ ۱۰۰۰ء سے سنہ ۱۳۴۳ء تک ہے۔ انکا پایۂ تخت ملک میسور میں دوارسمندرم میں تھا۔

پانڈیا

اس خاندان کی حکومت جنوبی ہند میں تھی۔ اور اس کا پایۂ تخت شہر مدورا میں تھا۔ ان کی حکومت کی مدّت گیارہویں صدی سے پندرہویں صدی عیسوی تک ہے۔ اس خاندان میں پندرہ راجہ گذرے ہیں۔

یڈوا

اس خاندان کی حکومت کا زمانہ سنہ ۱۱۵۶ء سے سنہ ۱۳۱۲ء تک ہے۔ اس خاندان میں سات راجہ گذرے ہیں۔

ٹراونکور، ملیبار اور دوسرے مقامات میں علیحدہ علیحدہ خاندان حکومت کرتے تھے۔ جو مذکورۂ بالا بڑے خاندانوں کے کبھی ماتحت رہتے تھے اور کبھی خود مختار۔ ملیبار کے حکمران کا خطاب زمورن تھا۔ جس کو عربی میں سامری کہتے ہیں۔

مسلمانوں کا پہلا حملہ اس ملک پر سنہ ۱۳۱۰ء میں ہوا اور اس وقت جب مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے جنوبی ہند دو بڑی حکومتوں کے ماتحت تھا۔

ہوسے سالا خاندان جس کا پائے تخت دوارسمندرم میں تھا۔ جزیرہ نمائے جنوبی ہند کے شمالی حصہ پر حکومت کرتا تھا۔ اور پانڈیا خاندان جنوبی حصہ پر۔ کبھی ورم کا چولا خاندان اس زمانہ میں بالکل کمزور ہو چکا تھا۔ ہوسے سالا اور پانڈیا خاندان اس کے اکثر و بیشتر حصّوں پر قبضہ کر چکے تھے۔

جنوبی ہند کا قدیم طرزِ حکومت

یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملک کا قدیم طرز حکومت کیسا تھا۔ جہاں تک، قدیم روایات، کہانیوں، کتبوں اور سیاحوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے دورِ تمدن میں ایک ایسی حکومت قایم تھی جسکو ہم حکومت خود اختیاری سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

راجہ حکومت کا مختارِ کل ہوتا تھا۔ مگر اس کے اختیارات ملکی قانون کی رو سے بالکل محدود تھے۔ وہ کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کبھی راجہ اس کے مقررہ اختیارات سے تجاوز کرتا تھا تو ملک میں بغاوت اور تخت سے اسکی معزولی یقینی تھی۔ کوتیسلیا ارتھا شاستر اجو ایک قدیم کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے:-

"راجہ کو بذاتِ خود ملک کے حالات کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ اور یہ دیکھنا چاہئے کہ رعایا اس کے افسروں سے خوش ہے یا ناخوش۔ اور افسر رعایا سے کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر رعایا اور افسر میں نا اتفاقی ہو تو راجہ کو چاہیئے کہ رعایا کی طرفداری کرے۔ اگر رعایا میں ایک سو آدمی اس افسر کے خلاف ہیں تو اس کو معزول کرتے ہوئے دوسرا افسر مقرر کرنا چاہئے۔"

(آرین رول ان انڈیا۔ دکن اور جنوبی ہند صفحہ ۱۴۳)

رعایا کے آرام و آسائش، حفاظت اور حکومت سے اچھے تعلقات قایم کرنے کے لئے ملک میں ایسا طرز حکومت قایم تھا۔ جس کو بارابلوتی کہا جاتا ہے:-

مورخ رییس لکھتا ہے :-

"بارا بلوتی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اس لئے کہ قدیم زمانے میں کسی شہر کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ حکومت خود احتیاط کرتی تھی۔ کہ شہروں کی آبادی پانچہزار سے بڑھنے نہ پائے۔"

رییس نے بارا بلوتی کی تشریح اس طرح کی ہے :-

"(۱) گاؤں کا حاکم۔ جس کو گوڈا، پٹیل یا رڈی کہا جاتا ہے

(۲) شانبھوگ یا کرنم۔ جسکے متعلق گاؤں کی زمینات اور لگان کا حساب کتاب تھا

(۳) تلاری۔ وہ شخص جو گاؤں کی نگہبانی کرتا تھا۔ (یہی شخص رڈی اور کرنم کا چپراسی بھی تھا)

(۴) نیرگنٹی۔ اسکے ذمہ تالابوں یا نہروں کی حفاظت اور کھیتوں کو پانی کی فراہمی تھی۔

(۵) حجام (۶) بڑھئی (۷) کمہار (۸) دھوبی (۹) لوہار۔

(۱۰) نجومی (۱۱) چمار (۱۲) سنار۔"

مذکورۂ بالا بارہ آدمیوں سے پہلے چار کو حکومت سے براہ راست تعلق رہتا تھا۔ باقی آٹھ کو صرف گاؤں والوں سے تعلقات تھے۔ اور ہر گاؤں میں انکا رہنا ضروری تھا۔ کتاب قدیم ہندوستان (Ancient India) کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۳ پر لکھتا ہے:

"حکومت کی زیادہ تر آمدنی لگان سے تھی۔ جو پیداوار کا $\frac{1}{6}$ حصہ تھا۔"

دو قدیم کتابیں جن کا نام "سکو انیتی اور کوتلیا ارتھا شاسترا" ہیں۔ ان میں اس قدیم زمانے کی طرز حکومت پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کتابوں میں شہروں اور

دیہات کی طرز تعمیر کے متعلق لکھا گیا ہے کہ شہر اور قصبے کے درمیان تعلق رکھنے کے لئے کشادہ راستے بنائے جاتے تھے۔ جہاں کہیں دریا یا ندی درمیان میں حائل ہو، پل تعمیر کئے جاتے تھے۔ راستوں کی تعمیر کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ درمیان میں اونچے اور دونوں بازو ڈھلوان ہوتے تھے۔ کہ بارش کا پانی جم نہ سکے۔ ان راستوں کی مرمت حکومت کے ذمہ تھی۔ ہر دو گاؤں یا شہروں کے درمیان ایک مسافر خانہ ہوتا تھا۔ جہاں مسافروں کے نام و پتہ لکھ لئے جاتے تھے۔

شاہی فوج کو حکم تھا۔ کہ دیہات کے قرب و جوار میں نہ رہے۔ بادشاہ کے افسر اور اس کے ملازموں کو بھی تاکید تھی کہ دیہاتیوں کے مہمان نہ رہیں۔ اور انکے معاملات میں دخل نہ دیں۔ کسی سپاہی کو بغیر شاہی پروانے کے دیہات کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

راجہ پر لازم تھا کہ سال میں ایک دفعہ شہروں اور دیہات کا معائنہ کرے۔ اور دریافت کرے کہ رعایا اس کی حکومت سے راضی ہے یا نہیں۔ جب کبھی سرکاری ملازم اور دیہاتیوں کا معاملہ راجہ کے آگے پیش ہو تو راجہ کو چاہئے کہ اپنے افسروں کی طرفداری نہ کرے۔ سرکاری افسر کو جس کے خلاف ایک سو آدمی شہادت دیں۔ ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گاؤں کے حاکم کو جو راجہ کا نائب ہوتا تھا۔ لازم تھا کہ چوروں، رہزنوں اور عمالان حکومت کے ظلم و ستم سے رعایا کو محفوظ رکھے۔ حاکم ایسا شخص ہونا چاہئے۔ جس کو حکومت کرنے کا نشہ نہ ہو"

ٹکسوں کے متعلق لکھا گیا ہے :-

"راجہ کو اپنی رعایا پر اس قدر ٹکس لگانا چاہئے گویا ان کے گلے میں پھول کا

ایک بار ڈالا جا رہا ہے۔

راجہ کو کبھی اپنی ہی رائے پر کام نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کو اکثریت کی رائے کا خیال کرنا ضروری ہے۔ پبلک کی رائے بادشاہ کی رائے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ جو رسی مختلف دھاگوں سے بنتی ہے۔ وہ اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ شیر کو مقید کر سکے۔

راجہ کا زبانی حکم قانون نہیں بن سکتا۔ جو راجہ بغیر تحریر کے صرف زبانی احکام دے اور جو افسر بغیر تحریری حکم کے عمل کرتا ہے۔ دونوں چور ہیں جب تک راجہ کے حکم پر سرکاری مہر نہ ہو وہ حکم قابل تعمیل نہیں ہو سکتا۔"
(آرین رول ان انڈیا صفحہ ۲۲۲ — ۲۲۵)

یہی مصنف لکھتا ہے:۔

"دیہات کی پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ بہت زبردست اختیارات رکھتی تھی۔ اگرچہ ٹیکس کی ادائگی کے معاملات میں وہ حکومت کی تابع تھی۔ لیکن زمین پر، اور زمین کا لگان حاصل کرنے کیلئے اس کو کامل اختیارات تھے۔

سوائے اس زمین کے جو راجہ کی ملکیت تھی یا ایسی زمین جو مندروں کے نام وقف تھی۔ باقی تمام زمین مجلس شوریٰ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ زمین کی تقسیم اسی مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ صرف متنازعہ معاملات میں راجہ یا اس کے نائب دخل دے سکتے تھے۔" (صفحہ ۲۲۸)

دیہات کی مجلس شوریٰ اگر اپنے فرائض اچھے طور پر بجا نہ لاتی تھی۔ تو ملک کی بڑی مجلس دخل دیکر ملزموں کو جرمانہ کی سزا دیتی تھی۔ راجہ کو بھی

اختیار تھا کہ اگر انتظام خراب ہو تو ملازموں کو جرمانہ کرے۔ یا اور کوئی سزا دے۔ (صفحہ ۲۲۹)

جنوبی ہند کے حالات آرین حملوں کے بعد۔

اوپر جن خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب جنوب میں آرین قوم آباد ہو چکی تھی۔ اگر ڈریوڈین قوم کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تو اس آرین زمانے کے حالات پر بھی اسی طرح تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں بھی واقعات پر اسی طرح مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جس سے صحیح اور اصلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ یہ مغربی مورخین کا نہایت احسان ہے کہ انہوں نے کم از کم کتبوں سے سنہ اور خاندانوں کے نام اور کچھ حالات معلوم کر لئے ہیں۔ اس ملک کی صحیح تاریخ اس زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ جب مسلمان پہلے پہل اس ملک میں آئے۔ (یعنی ۱۳۱۰ء سے) اس سے پہلے اس ملک کا تمدن، طرز حکومت، معاشرت، تجارت وغیرہ کے حالات کیلئے ہم ان سیاحوں کے ممنون ہیں جو اس ملک میں اُس زمانے میں آئے ہوئے تھے۔ اور اپنے سفرناموں میں کچھ لکھ دئے تھے۔

عرب سیاحوں کے علاوہ غیر ملکی سیاح جو اس ملک میں آئے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ چینی سیاح ہیونگ شیانگ، یونانی سیاح میگس تھینس، اور بطلیموس۔ اطالوی سیاح پلینی اور ابرین۔ پرتگالی سیاح مارکوپولو۔ (Marcopolo)

(نوٹ:۔ مسلمان سیاحوں کے نام علیحدہ باب میں دئے گئے ہیں)

اطالوی سیاح پلینی لکھتا ہے :۔

"مصر سے ساحل ملیبار تک جہازات دو مہینے دس دن میں پہونچ جاتے ہیں۔ مزرس (ملیبار میں مغربی ساحل پر) اور پوہار (مشرقی ساحل پر) اس زمانے میں بہت بارونق بندرگاہیں ہیں۔ یہاں سے رومی جہازوں پر ہندوستان کی اجناس لادی جاتی ہیں۔ رومۃ الکبریٰ ہر سال ساڑھے پانچ کروڑ سٹرس (رومی سکہ) ہندوستان کے مال پر صرف کرتا ہے۔ یہ رقم روم والے اپنی تفریح اور عورتوں کے بناؤ سنگار پر صرف کرتے ہیں۔ پہلی اور دوسری مسیحی صدیوں میں رومی باشندوں کی بہت بڑی تعداد ان بندرگاہوں میں آکر آباد ہوگئی تھی۔ اور مزرس میں ان لوگوں نے قیصر آگسٹس (Augustus) کے نام سے ایک عالیشان کلیسا بھی تعمیر کیا تھا"

اس زمانہ میں زیادہ تر تین چیزیں رومہ کو جاتی تھیں۔ یعنے کالی مرچ۔ موتی اور پنّا (موتی اب بھی جنوب کے سمندروں میں ٹناولی کے قریب ملتا ہے پنّا زمرد کی قسم کا ایک قیمتی پتھر ہے۔ اس کی کانیں ضلع کوئمبتور، اننت پور اور کرنول میں پائی جاتی ہیں)

(**نوٹ** :۔ رومہ کی تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ یہ تجارت پہلے مصریوں اور عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ رومیوں کو جنوبی ہند کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ حضرت مسیح سے بیس سال پہلے۔ قیصر آگسٹس کے زمانے میں رومیوں نے مصر کو فتح کرلیا۔ اور اس وقت سے رومیوں کی آمد و رفت جنوبی ہند میں شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ کم و بیش ڈھائی سو سال تک جاری رہا۔ جس کے بعد پھر یہ تجارت عربوں کے ہاتھ میں آگئی اور اسوقت تک رہی۔ جب تک پرتگیز اس ملک میں نہیں آئے۔)

ایک اور مصنف پٹرونیس لکھتا ہے :۔

"فیشن زدہ رومن عورتیں آج کل اپنے بناؤ سنگار اور نمائش کیلئے ایک
ایسا مہین کپڑا استعمال کرتی ہیں۔ جس کو ہوا کا جال کہا جاتا ہے"۔
(نوٹ :۔ مصنف کی مراد ہوا کی جال سے ہندوستان کی نفیس و باریک ململ یا دھاگہ کی "آب رواں"
ہوا کرتی تھی۔)
کتاب پری پلس کا مصنف لکھتا ہے :۔
"کالی مرچ، موتی، ہاتھی دانت، صندل، ہیرے، لعل اور صدف بندرگاہ
مزرس میں ملتے ہیں"۔
دی بگننگس آف سوتھ انڈین ہسٹری کا مصنف صفحہ ۱۲۹ پر لکھتا ہے :۔
"چولا خاندان کا پایۂ تخت چوہار مشرقی ساحل پر تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا
یہاں کی منڈی میں ہر قسم کا مال ملتا تھا"۔
بندرگاہ ٹونڈی (جو موجودہ رامناد کے قریب وجار میں تھا) کے متعلق یہی مصنف لکھتا ہے :۔
"اس بندرگاہ میں علاوہ اور سامان تجارت کے اگھیر (جو ایک قسم کی سیاہ
خوشبودار لکڑی ہے) ریشم، کافور، مصری، صندل، نمک وغیرہ ملتے تھے"۔
اطالوی سیاح اسٹرابو نے لکھا ہے :۔
"پانڈیا خاندان کے ایک راجہ نے جناب مسیح سے تیس سال پہلے اپنا ایک سفیر
رومی قیصر اگسٹس کے دربار میں بھیجا تھا"۔
یونانی سیاح میگس تھینس لکھتا ہے :۔ (یہ سیاح تین سو سال قبل مسیح جنوبی ہند میں آیا ہوا تھا)
"یہاں ملک کی حکومت پانچ طبقوں میں منقسم ہے۔
اول۔ پنچایت جو ملک کے امن کی ضامن ہے۔

دوم - مذہبی پیشوا جن کے ذمہ مذہبی تہوار اور مندروں کا انتظام ہے

سوم - طبیب جو ملک کی صحت وصفائی کے نگران ہیں -

چہارم - منجم - جو آئندہ ہونے والے واقعات کی پیشینگوئی کرنے کے علاوہ شاہی جشنوں، تہواروں اور شادی بیاہ کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

پنجم - راجہ کے وہ ملازم جو حکومت کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔

سیاح مارکو پولو لکھتا ہے :- (یہ سیاح ۱۲۹۲ء میں یعنے مسلمانوں کے پہلے حملے سے چالیس سال پہلے جنوبی ہند میں آیا تھا)

" سب سے عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس ملک میں فقیر سے لیکر امیر تک ننگے رہتے ہیں - یہاں تک کہ بادشاہ بھی جس کے گلے میں اس قدر قیمتی جواہرات کے ہار ہیں جن کی قیمت سے ایک سلطنت خریدی جا سکتی ہے - سوائے ایک دھوتی کے اور کچھ نہیں پہنتا - جنوبی ہند کے اکثر راجاؤں کی حرم میں پانچ سو سے زیادہ عورتیں اور بہت سے بچے ہیں - راجہ کی حفاظت خاص طور پر ان لوگوں کے ذمہ ہے جو قسم کھا کر زندگی اور موت میں اسکے شریک ہوتے ہیں - یہاں کے لوگ زیادہ تر نباتات پر گذر کرتے ہیں - ملیبار کے لوگ تجارت کیلئے بہت مشہور ہیں - اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی تاجر ہیں - ملیبار کے سوا ملک کے دوسرے حصوں میں تمام تجارت ویسیا (ویش) قوم کے ہاتھ میں ہے - ہر جگہ سونے کی افراط ہے - اور یہ سونا ہیں مختلف مقامات میں زمین سے نکالا جاتا ہے - ہیرے بھی گولکنڈہ اور اس کے نواح میں ملتے ہیں - ملک میں ہر جگہ ململ اور دوسرے قیمتی کپڑے بنائے

جاتے ہیں۔ مدورا اور سیلون کے قریب دریا سے موتی نکالے جاتے ہیں۔
ان چیزوں کے علاوہ کالی مرچ۔ سونٹھ اور دوسرے گرم مسالے، نیل
اور دوسرے رنگ غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ اور ان کے عوض چین کا
ریشم، یونان و مصر کی سوغات اور ایران و عرب کے قالین و گھوڑے یہاں
آکر فروخت ہوتے ہیں۔ ان میں جو تجارت سب سے ممتاز ہے وہ گھوڑوں
کی تجارت ہے۔ اس لئے کہ گھوڑے اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے اور اگر
کہیں ہوتے ہیں تو اس قدر جفاکش اور تیز رفتار نہیں ہوتے۔ جس قدر
عرب و ایران کے گھوڑے ہیں۔ اس لئے ملک میں ہر جگہ ان کی منڈیاں
ہیں۔ اور عرب و ایران کے لوگ اس تجارت سے خوب نفع اٹھاتے ہیں۔"

مسلمان مورخ وصاف لکھتا ہے:۔

"جنوبی ہند کا ملک کولم سے لیکر شمال میں نلور تک تین سو فرسخ کے طول
میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے حکمرانوں کو "دیورا" کہتے ہیں۔ چین
ماچین اور ہندوسندھ کی سوغات جہازوں میں بھری ہوی یہاں آتی
ہیں۔ خلیج ایران کے جزائر، عراق وخراساں، روم اور یوروپ کے تحائف
معبر کی منڈیوں میں ملتی ہیں۔ معبر ہند کی کنجی ہے" (معبر سے مراد ساحل کورومنڈل ہے)

ایک اور جگہ یہی مورخ لکھتا ہے:۔

"اس جگہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ساحل ہے۔ سمندر کے کناروں میں
سے قدیم اور جدید نادر اشیا سے پُر اور جنس جنس کے خزانوں اور گرانمایہ
جواہروں اور عمدہ سامانوں اور گرانقدر برگزیدہ متاعوں کی کثرت سے

بے مثال کاریگری کی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس علاقہ کے اطراف وجوانب عود اور قرنفل کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ اور گرد و نواح کے علاقے طوطیوں کی زبان سے چہکتے ہیں" (تاریخ وصاف ترجمۂ جناب محمد علی صاحب یم۔اے)

اسلامی مورّخ وسیّاح

وصاف کے علاوہ جن مسلمان مورخوں وسیاحوں کی کتابوں میں اس ملک کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ان کی تعداد ۱۶ سولہ ہے۔ ان میں چار بغداد کے باشندے تھے۔ چار اندلس کے۔ چار ایران کے اور چار خالص عربی النسل تھے۔ ان میں سب سے پہلے جنوبی ہند کا تذکرہ جس مورخ کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ وہ ابن خرّداد عجمی کی کتاب ہے۔ جو ۸۴۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں اس نے ان تجارتی راستوں اور مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جو جنوبی ہند اور عرب وایران کے درمیان تھے۔ دوسرا مورخ بھی عجمی النسل ہے۔ جس کا نام ابوزید حسن ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ تاجر سلیمان کی زبانی لکھا ہے۔ جس نے ایک سے زیادہ مرتبہ ایران چھوڑ کر جنوبی ہند ہوتا ہوا چین تک سفر کیا تھا۔ مورخ مسعود نے اپنی کتاب ۹۴۳ء میں لکھی تھی۔ اس میں اس نے مالدیپ اور جزیرۂ سیلون کا ذکر کرتا ہوا یہاں کے باشندوں کے مذہب اوضاع واطوار پر بحث کی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مشہور عربی سیّاح ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی یہاں آیا تھا۔ اور اس نے نہایت تفصیل سے یہاں کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۱۵۳ء میں مشہور جغرافیہ دان ادریسی جو جزیرۂ سسلی کا باشندہ تھا۔ اپنی کتاب لکھی۔ اس کے بعد ۱۱۷۹ء میں یاقوت اور ۱۲۶۳ء میں قزوینی نے اپنی کتابوں میں اس ملک کے حالات لکھے ہیں۔

۱۳۳۱ء میں ابوالفدا نے یہاں کے حالات لکھے تھے۔ لیکن اس نے یہ حالات ابن سعید کے سفرنامے سے لئے ہیں۔ جو سنے سنائے ہیں۔ تیرہویں صدی میں وصاف اور رشید الدین نے یہاں کے جغرافیہ اور تاریخ کا کچھ ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ جس شخص نے یہاں کا حال لکھا وہ سیاح ابن بطوطہ ہے۔ جو ملک مراقش کے شہر تنجیر میں ۱۳۰۴ء میں پیدا ہوا اور جس نے شہر فیض میں ۱۳۷۷ء میں انتقال کیا۔ اس نے اپنے سیاحت نامہ میں اس ملک کے اس قدر حالات لکھے ہیں۔ کہ دوسری کتابوں میں اس قدر وضاحت سے حالات نہیں ملتے۔ ابن بطوطہ عرصہ تک اس ملک میں سیاحت کرتا رہا۔ گو اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی مسلمان مورخ پیدا ہو چکے تھے۔ جیسے امیر خسرو وغیرہ۔ سولھویں صدی عیسوی میں سیدی علی قلبی ترکی امیرالبحر نے اپنی کتاب میں ہندوستان کی بندرگاہوں اور مشہور شہروں کا ذکر کیا ہے۔ سیدی علی بحری راستے دریافت کرنے اور معلومات حاصل کرنے کیلئے آیا تھا۔ اور واپس جاکر اس نے اپنی کتاب "محیط" لکھی۔ اس کتاب کی تدوین میں اس نے مشہور ماہر بحر احمد ابن مجید سے مدد لی تھی۔ اور آج یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ پرتگال والوں نے اسی احمد ابن مجید کی مدد سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تھا۔ پرتگالی امیرالبحر واسکوڈی گاما جس نے مغربی قوموں میں سب سے پہلے ساحل ہند پر قدم رکھا۔ وہ احمد بن مجید کا شاگرد تھا۔

جنوبی ہند میں اسلام

جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کے بیان سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس ملک میں یہودیت اور عیسائیت کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ جو اسلام سے پہلے اس ملک میں اپنے لئے

جگہ پیدا کر چکے تھے۔)

یہ لکھا جا چکا ہے کہ (نا معلوم زمانہ سے مصر، عراق و عرب کی تجارت جنوبی ہند سے ہو رہی تھی۔ ان ممالک میں جب یہودیت کا آغاز ہوا تو ان تاجروں کے ذریعہ یہودیت جنوبی ہند میں آئی۔ ملیبار، کوچین اور ٹراونکور میں یہودیت کا آغاز انہیں تاجروں سے ہوا۔)

(مذاہب عالم کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں جانتے ہیں، کہ جب شام میں عیسائیت کا آغاز ہوا تو یہودیت سے اس کا تصادم ہوا۔

ریورنڈ سیبل لکھتا ہے:-

"ایک زمانے تک دونوں مذہبوں کے پیرو ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ ان لڑائیوں میں مسیحی غالب رہے۔ اور انہوں نے یہودیوں پر طرح طرح کے ظلم کئے جن سے بچنے کے لئے بہت سے یہودی عراق، شام و عرب سے نکل کر ملیبار اور ٹراونکور کے ساحل پر آکر سکونت پذیر ہو گئے۔"

"تاریخ ابوالفدا سے معلوم ہوتا ہے کہ "شالیات اور سنگل جو ملیبار کے دو شہر تھے۔ ان میں خالص یمن کی یہودی نوآبادی تھی۔"

(نوٹ:- معلوم ہوتا ہے کہ اس مذہب کو یہاں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ یہودی ملک میں بالکل قلیل تعداد میں ہیں)

یہودیت کے بعد ملک میں عیسائیت کا رواج بھی انہیں تاجروں سے ہوا۔ جو مصر و عرب، عراق و شام سے آتے تھے۔ اور انہوں نے بھی یہودیوں کے پہلو بہ پہلو اپنی نوآبادیات قایم کیں۔ اور یہی عیسائی سُریانی عیسائی کہلاتے ہیں۔ عیسوی مذہب کو بہ نسبت یہودی مذہب کے بہت زیادہ کامیابی ہوئی۔ اور شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مسیحیوں نے ملک شام وغیرہ

میں اپنی حکومتیں قایم کرکے تمام تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اور باقاعدہ تبلیغ کا انتظام کر رکھا تھا۔ مسیحی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ کی غرض سے سنٹ تھامس (St- Thomas) نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ وہ بندرگاہ مرزس (کرنگانور) پر جہاز سے اترا۔ اور یہاں اشاعتِ دین کا کام کرتا رہا۔ اس نے ملیبار اور ٹراونکور میں آٹھ کلیسا مندرجہ ذیل مقامات پر تعمیر کیے۔

(کرنگانور، کولم، پارور، پلی پورم، کوکامنگلم، نیرانم اور نیل کل۔ یہاں سے فارغ ہوکر وہ مشرقی ساحل پر آیا۔ اور ایک پہاڑ پر اس نے سکونت اختیار کی۔ یہی وہ پہاڑی ہے جس کو سنٹ تھامس مونٹ (St- Thomas Mount) کہا جاتا ہے۔ جس کو مقامی طور پر پلے وارم بھی کہتے ہیں۔ یہ مقام مدراس سے قریباً پانچ میل پر ہے۔

قدیم عیسائیوں یا یہودیوں نے ملکی جھگڑوں اور لڑائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لئے تاریخ میں انکا تذکرہ بالکل نہیں ہے۔ مسیحیت کا تذکرہ پھر ملک میں اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب مغربی قومیں تجارت کے لئے آئیں۔

(عیسوی مذہب کے چھ سو سال بعد ملک عرب میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا۔ عربوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور وہی عرب تاجر جو پہلے بت پرست وغیرہ رہکر تجارت کرتے تھے۔ اب مسلمان ہوکر تجارت کرنے لگے۔)

نامعلوم زمانے سے تیرہویں صدی تک جس قدر حالات مل چکے ہیں۔ ان کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کسی جگہ لکھا گیا ہے کہ مسلمان سنہ ۱۳۱۰ء میں جنوبی ہند پر حملہ آور ہوئے تھے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس سے پہلے جنوبی ہند مسلمانوں سے قطعی ناواقف تھا۔ یا جنوبی ہند میں اسلام کی بنیاد اسی حملہ سے پڑی۔

(دنیا میں یہودیت اور عیسائیت کے بعد مذہب اسلام آیا۔ اسلام لانے سے پہلے عرب قریباً سب کے سب بت پرست تھے۔ اس زمانے میں عرب کی تجارت بہت وسیع پیمانہ پر تھی۔ ان کے جہاز بندرگاہ بصرہ اور ساحل حضرموت و یمن سے چین ماچین تک آیا جایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد عرب تاجر تجارت کیلئے جن جن علاقوں میں پہونچے۔ وہاں اسلام کی آواز کو بھی پہونچایا۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اسلام پہلے پہل انہی لوگوں کی مقدس کوششوں سے پھیلا ہے)

۸۶ھ میں خلیفہ عبدالملک۔ بن مروان کے زمانے میں بہت سے عرب تاجر جزیرۂ سیلون میں آکر آباد ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں مسلمان تاجروں نے اپنی ایک نو آبادی ملیبار میں بھی قایم کرلی (حال میں جو قدیم کتبے ملے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے راجاؤں نے ان عربوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کیلئے انہیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں۔ اور یہ تجارت ان بندرگاہوں میں ہوتی تھی۔ جو معبر (کورومنڈل) اور ملیبار کے ساحل پر تھے۔ مشرقی ساحل پر متوپلی (موجودہ مچھلی بندر کے قریب) اور جنوب میں بندرگاہ کایل۔ اس تجارت کے لیے بہت مشہور تھے۔ مغربی ساحل پر بھٹکل۔ کالی کٹ اور کولم وغیرہ میں تجارت کی بہت بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔

ان تجارتی تعلقات کا دوسرا ثبوت تاریخ وصاف سے بھی ملتا ہے۔ وصاف لکھتا ہے :۔

" اس بندرگاہ کایل اور ملیبار کے دوسرے بندرگاہوں کو دس ہزار گھوڑے فروخت کے لئے بھیجے گئے۔ ان میں چودہ سو گھوڑے خاص ملک الاسلام جمال الدین مرزبان فارس کے ہیں۔ ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ دینار سرخ ملتی ہے۔ اگر کوئی گھوڑا راستہ میں مرجائے تو اس کی قیمت بھی ثبوت ملنے پر راجہ ادا کر دیتا تھا۔ اس وقت معبر میں ملک الاسلام جمال الدین کا مختار (ایجنٹ) اس کا ایک

رشتہ دار بھائی تقی الدین عبدالرحمٰن بن محمد الطیبیؒ عرف مرزبان نامی ہے

تقی الدین بندرگاہ کایل میں رہتا ہے۔ اور اس کی نگرانی میں فتن اور مالی فتن

کی منڈیاں بھی ہیں ''

فتن اور مالی فتن کے متعلق مورخ پول لکھتا ہے۔ کہ ان شہروں کو موجودہ زمانے میں

دیوی پٹن اور مرکیار پٹن کہتے ہیں۔

پول اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے :-

'' ملک الاسلام جمال الدین کے ایجنٹ تقی الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ۱۳۰۳؁ء

میں ہوا۔ رشید الدین جس نے وصاف کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک اور عرب تاجر

جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جمال الدین اس ملک کے راجہ کا وزیر بھی تھا''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں صرف ایک جمال الدین کا خاندان نہیں۔ بلکہ کئی

عرب خاندان آباد تھے۔ اور ان عربوں کا راجاؤں کے دربار میں خاصہ اقتدار تھا۔ لیکن کسی

تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں عرب مسلمان کسی راجہ کے وزیر ہوئے ہوں۔

رشید الدین کی تحریر کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ عرب تاجر درباروں میں کافی رسوخ رکھتے تھے

اور راجہ ان سے وقتِ ضرورت مشورہ لیتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ لوگوں نے انہیں بھی

وزیر مشہور کر دیا ہو۔

وصاف سے پہلے بھی عرب و ایران کے مورخین نے اپنی کتابوں میں جنوبی ہند کا ذکر

کیا ہے۔

۱۳۱۰؁ء میں مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا تھا۔ اس حملے کے بعد اسلامی مورخین یا سیاحوں نے

جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کا ذکر ہے۔ جو اس ملک میں پہلے سے آباد تھے

امیر خسرو نے لکھا ہے :۔

"ملک الاسلام (کافور) نے جب مقام کندور (کنانور۔ ضلع ترچناپلی) میں راجہ بیر کا تعاقب کیا تو یہاں اس کو چند مسلمان ملے۔ جو ہندوؤں کی رعایاؤں میں تھے یہ لوگ صرف نیم مسلمان تھے۔ اور سوائے کلمہ کے دوسرے شعائر اسلام سے بالکل ناواقف تھے۔ ملک الاسلام نے انکی جاں بخشی کی۔ یہ قتل کے مستوجب تھے۔ لیکن ملک نے صرف ان کے مسلمان کہلانے کے باعث انکی جاں بخشی کی"

مشہور سیّاح ابن بطوطہ مغربی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :۔

" راجہ بلال دیو (حاکم دھورسمند۔ میسور) کے پاس بیس ہزار مسلمانوں کی فوج تھی۔ جن میں زیادہ تر جنگی قیدی اور غلام تھے" (صفحہ ۳۵۸)

یہی سیّاح کوکن اور ملیبار کے متعلق لکھتا ہے :۔

"شہر ہنور (کوکن) کے باشندے شافعی مذہب رکھتے ہیں۔ وہ دیندار۔ نیک بخت اور بحری طاقت کے لئے مشہور ہیں۔ سنداپور فتح ہونے کے بعد زمانہ نے انہیں خوار کر دیا تھا۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں۔ انہوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی۔ اس شہر کی عورتیں اور کل اس ساحل کی عورتیں سیا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں۔ بلکہ بے سلا ہوا کپڑا پہنتی ہیں۔ یہ عورتیں خوب صورت اور باعفت ہوتی ہیں۔ ناک میں سونے کا بُلاق پہنتی ہیں۔ اور یہ انکی خصوصیت ہے کہ سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ فقط تجارت بحری سے گذارہ کرتے ہیں۔ زراعت نہیں کرتے۔ یہاں کا بادشاہ سلطان جمال الدین ہے۔ ملیبار کے لوگ بھی اس کو خراج دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پاس بحری طاقت بہت بڑی

ہے اور چھ ہزار پیادہ اور سوار بھی رکھتا ہے ۔ یہ بادشاہ جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت اور پارسا ہے ۔ وہ ایک ہندو راجہ ہریب (ہری ہر) کے ماتحت ہے ۔ یہاں کے لوگوں کی غذا چاول ہے ۔"

(ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ از مولوی محمد حسین صاحب ایم ۔ اے صفحہ ۱۲۹)

ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملک کنارا ۔ ملیبار اور ٹراونکور کے بہت سے شہروں کا ذکر آیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں ۔ اور مسجدیں بنی ہوئی ہیں ۔ اور فاکنور (برکور) میں جامع مسجد اور بدپتن میں چار مسجدیں تھیں ۔

(نوٹ :- فاکنور ضلع شمالی کنارا میں واقع ہے ۔ اور بدپتن موجودہ کالی کٹ سے سولہ میل پر تھا)

ملیبار کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملیبار کی یہ مسجدیں جن کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے ۔ پہلی صدی ہجری میں تعمیر ہوئی تھیں ۔ ان مساجد کو شرف بن مالک اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب نے تعمیر کیا ۔ یہ بزرگ اپنے اہل و عیال کے ساتھ عرب کو چھوڑ کر ملیبار میں آکر آباد ہوئے ۔ یہ پہلی اسلامی نوآبادی تھی جو مغربی ساحل پر ہوئی ۔ ان عربوں نے ساحل ملیبار پر نو مقامات پر مساجد تعمیر کیں ۔ کدن کلور (موجودہ کرنگا نور) کولم ، ہیلی ماراوی جرفتن ، دہ فتن ، قندرینا (موجودہ کالیکٹ) چالیات (موجودہ چالیام) فاکنور (موجودہ برکور) منجرور (موجودہ منگلور) ابن بطوطہ نے ان تمام مقامات کا اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے ۔

ملیبار کی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ چیرا خاندان کا آخری راجہ چیرومن پیرومال جس کو عربی میں سامری لکھا گیا ہے ۔ اسلام قبول کر لیا تھا ۔ امپیریل گزیٹیر میں لکھا ہے کہ راجہ چیرومن پیرومال ۲۵ راگست ۸۲۵ء مطابق ۲۱۰ھ میں بعزم سفر ملیبار سے روانہ ہوا ۔ ۸۲۶ء میں ساحل عرب پر پہونچا ۔ اس کے چار سال بعد اس کا انتقال ہوا ۔

شیخ زین الدین معبری مصنف تحفۃ المجاہدین (جو ملیبار کی اسلامی تاریخ ہے) نے جنوبی ہند اور خصوصاً ملیبار میں اشاعتِ اسلام کے اسباب اس طرح بیان کئے ہیں :-

"ملیبار کے ہندو میں رسم و رواج کی بندشیں اور ذات پات کی پابندیاں مدت سے قائم تھیں۔ اگر اعلیٰ ذات کا کوئی آدمی کسی ادنیٰ ذات کے آدمی سے چھو جاتا یا حد مقررہ سے قریب ہو جاتا تو غسل کئے بغیر کھانا کھانا اسے جائز نہیں ہے۔ اگر بغیر غسل کے کھا لیتا ہے تو اپنی ذات سے باہر ہو جاتا ہے۔ ادنیٰ ذات والوں کا پکایا ہوا کھانا اعلیٰ ذات والوں کے لئے منع ہے۔ اگر اعلیٰ ذات کا مرد کسی ادنیٰ ذات کی عورت سے شادی کرتا ہے۔ یا کسی اعلیٰ ذات کی عورت کے ساتھ کسی ادنیٰ ذات کے مرد کی شادی ہو جاتی۔ تو اعلیٰ ذات والا اپنی ذات سے خارج ہو جاتا ہے۔"

(نوٹ) شیخ زین الدین معبری ۱۴۶۷ء مطابق ۱۳ ارشعبان ۸۷۳ھ پنجشنبہ کے روز کوچین میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۷ ارشعبان ۹۲۸ھ کو انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار شہر فنان میں ہے جو کلی کٹ کے جنوب میں ہے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں تحفۃ المجاہدین جو ملیبار کی تاریخ ہے۔ بہت مشہور ہے)

تھیونو (Thevenot) سیاح نے بھی لکھا ہے کہ "ملیبار میں دو قومیں آباد ہیں۔ ایک نائر اور دوسرے پولئے۔ اگر کوئی نائر کسی پولئے کے اس قدر قریب ہو جائے کہ اس کا سانس اس تک پہونچ سکے تو نائر سمجھتا ہے کہ وہ ناپاک ہو گیا۔ اور مجبوراً اس پولئے کو قتل کر دیتا ہے۔ اگر وہ نائر اس پولئے کو قتل نہ کرے اور راجہ کو معلوم ہو جائے تو راجہ نائر کو مروا دیتا ہے۔ جب کبھی پولئے گھروں سے باہر کھیتوں میں نکلتے ہیں تو اس اتفاق سے بچنے کے لئے متواتر "پولو" پکارتے ہیں۔ کہ نائر موجود ہوں تو ہٹ جائے۔ اور جب نائر اس آواز کو سن لیتا ہے تو

چلّا کر کُو کُو کہہ دیتا ہے۔ اس سے پولیا سمجھ لیتا ہے کہ یہاں کوئی نائر موجود ہے۔ اور وہ راستہ چھوڑ کر دُور ہٹ جاتا ہے۔"

ادنیٰ ذات کے لوگ گاؤں کے اندر جوتیاں پہن کر داخل نہیں ہو سکتے۔ اُنکی عورتوں کو اپنی ساڑی کا پلو دائیں ہاتھ کی طرف چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ ساڑی کا پلو دائیں طرف صرف اعلیٰ ذات کی ہندو عورتیں چھوڑ سکتی ہیں۔ ملیبار میں یہ بھی رواج ہے کہ نیچ ذات کی عورتیں اپنا سر اور سینہ اونچی ذات والوں کے آگے چھپا نہیں سکتیں۔ اس لئے یہ عورتیں صرف ایک کپڑا سینہ سے نیچے باندھتی ہیں۔

(رسم و رواج کی پابندی اور ذلت کے احساس نے جہاں جنوبی ہند کی چند اونچے قوم والوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ وہاں ان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے بھی اسلام قبول کیا۔ جب رسم و رواج کے خلاف کوئی فعل ہوتا تھا تو بدنامی سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ مذہب تبدیل کر لیا جائے)

اس کے متعلق کتاب ملیبار میں لکھا ہے :-

"رسم و رواج کے خلاف نائر جب کسی فعل کے مرتکب ہوتے تو اس بدنامی سے بچنے کیلئے یا تو وطن چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان سے کوئی واقف نہیں ہے۔ یا اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ پولیوں کے لئے بھی اس ذلت سے بچنے کا طریقہ صرف قبول اسلام ہے۔ یہ لوگ جب اسلام قبول کر لیتے ہیں تو انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے (صفحہ ۳۰)

لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں :-

" یہ اسلام کی حقانیت ہی تھی کہ دوسری قوموں کو اس مذہب کے قبول کرنے پر

ترچناپلی
درگاہِ حضرت نطہر ولی رح

آمادہ کی ۔اس کے علاوہ عرب کے مسلمان "تاجر تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ مذہب
کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ ان "تاجروں کے اخلاق ۔ان کی پاکبازی اور صداقت
شعاری آہستہ آہستہ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھی۔ اور
یہی وہ چیزیں تھیں جو جنوب میں تبلیغ اسلام کا باعث ہوئیں۔ان تجارتی
تعلقات کی بنا پر نہ صرف مالک بن حبیب کا خاندان بلکہ بہت سے عرب
تاجر و قبائل بھی جنوبی ہند میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ان کی اس
اقامت اور میل جول کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں اور جنوبی ہند کی قوموں
میں رشتہ داریاں پیدا ہوگئیں۔ ان عربوں نے یہاں شادیاں بھی کیں۔اور
کنیزیں بھی خریدیں۔آج جنوبی ہند میں مسلمانوں کی جو مختلف قومیں علیحدہ علیحدہ
ناموں سے نظر آتی ہیں ۔وہ اسی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ساحل ملیبار میں عربوں
کی نسل موپلا کہلاتی ۔کورومنڈل میں لبے اور مرکیار وغیرہ ۔انہیں عربوں کی
اولاد ہیں ۔کوکن میں یہی لوگ نوائط کہلائے ۔ممکن ہے کہ ہر جگہ بعض ہندو
خاندان اسلام کی صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوگئے ہوں۔اور بعد میں
مسلمانوں سے رشتہ داری ہوئی ہو "

(جنوبی ہند کے اسلام کو اولیاء اللہ سے بھی بہت زیادہ تعلق ہے جو اس ملک میں خاص
تبلیغ کی غرض سے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ان میں حضرت نطھڑولی رحمۃ اللہ علیہ
(ترچناپلی) اور آپ کے خلفا کو بہت امتیاز حاصل ہے ۔حضرت نطھڑولی رحمۃ اللہ علیہ کا اصلی
نام خواجہ مظہر الدین ہے۔آپ کے خلفاء میں حضرت بابا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ (پنکنڈہ)
میں بہت مشہور رہیں ۔)

ان تحریروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ اوائل اسلام ہی سے جنوبی ہند مسلمانوں سے واقف تھا۔ لیکن ملک میں ان کی حکومت نہیں تھی۔ یہ اگلے مسلمان صرف تجارت کرتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کی بہت سی تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

مسلمان اور جنوبی ہند

سیاسی تاریخ

تیرہویں صدی کا خاتمہ اور چودہویں صدی کی ابتدا جنوبی ہند کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لاتی ہے۔ اور یہ انقلاب ایک نئی قوم کے فاتحانہ حملہ سے ہوا۔ یہ نئی قوم مسلمان تھی۔ یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ جنوبی ہند مسلمانوں سے ناواقف نہ تھا۔ مسلمان عرب تاجر ایک عرصہ سے یہاں رہتے تھے۔ مگر انہیں کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ لیکن اب مسلمان ملک میں ایک دوسری صورت سے بھی داخل ہوئے۔ جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ سلطان علاؤ الدین کے عہد میں ہوا۔ یہ حملہ کوئی اچانک حملہ نہیں تھا۔ مسلمان، ہند میں گویا قدم بقدم آئے، اور رفتہ رفتہ جنوبی ہند میں پہنچے۔ اس لئے یہاں ضروری ہے کہ تسلسل قایم رکھنے کے لئے یہ تحریر کیا جائے کہ مسلمان شمالی ہند میں کس طرح آئے۔ اور کس طرح قدم بقدم جنوب کی طرف بڑھے

اہل عرب کو اسلام قبول کرنے کے بعد قدرتی طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی نے بھی ایک مہم بھیجی۔ لیکن ان مہموں کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا حملہ جو ہندوستان کی تاریخ میں بلحاظ کامیابی پہلا

حملہ کہا جاتا ہے۔ وہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں ہوا۔ اس فوج کی کمان حجاج کے بھتیجے محمد بن قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کا یہ حملہ واقعی ایک کامیاب حملہ تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر تمام ملک سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن حجاج کی وفات پر محمد بن قاسم کو دمشق بلا لیا گیا۔ اور فتوحات رک گئیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ان فتوحات کا رک جانا ایک نقصان عظیم تھا۔ اگر یہ فتوحات جاری رہتیں تو یقیناً آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس نے بھی ہندوستان پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ پھر جو کامیاب حملہ ہندوستان پر ہوا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا حملہ تھا۔ اس نے پنجاب یعنے ہندوستان کے دروازے پر قبضہ کر لیا۔ غزنی خاندان کے بعد غوری خاندان نے ان فتوحات کو اور وسیع کر دیا۔ دہلی، اجمیر اور قنوج کی راجدہانیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ غوری خاندان کے بعد خاندانِ غلامان برسرِ حکومت ہوا۔ اور دہلی پایہ تخت بنی۔ اس طرح اب مسلمان بجائے افغانستان میں بیٹھے ہوئے حکومت کرنے کے خاص ہندوستان میں آکر ہندوستانی بن گئے۔ اور انکی فتوحات روز بروز وسیع ہوتی رہیں۔

خاندانِ غلامان کی حکومت کم و بیش اسی سال تک رہی۔ اس کے بعد خلجی خاندان تخت نشین ہوا۔ اسی خاندان کے پہلے سلطان جلال الدین فیروز کے عہد میں اس کے بھتیجے علاؤالدین نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر فوج کشی کی۔ اس حملہ کا حال مورخ ہیگ نے اپنی کتاب ہسٹارک لینڈ مارکس آف دی دکن (Historic Landmarks of the Deccan) میں اس طرح لکھا ہے:۔

"اسلامی فوج کی کمان سلطان جلال الدین فیروز کے بھتیجے علاؤالدین کے قبضہ میں تھی۔ علاؤالدین اس وقت کڑہ کا گورنر تھا۔ جالنہ آباد سے ۴۲ میل شمال

مشرق میں دریائے گنگا پر واقع ہے۔ شہر بھلسا کی فتح کے وقت اس نے
دیوگیری کی شان وشوکت اور یہاں کی دولت وخزائن کا حال سنا۔ اس نے
اسی وقت ارادہ کر لیا کہ اپنی فتوحات کو جنوب کی طرف وسیع کرے۔ کڑہ آکر
علاؤالدین فوج کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اور جس وقت تیاری مکمل ہو چکی تو
۱۲۹۴ء میں کڑہ سے نکلکر جنوب میں چندیری ہوتا ہوا ایلچ پور پہونچا۔ جو موجودہ
وقت میں ضلع برار میں ہے۔ اسکے افسروں اور سپاہیوں کو تک یہ معلوم نہیں
تھا کہ علاؤالدین کس مقصد سے اور کس ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ایلچ پور پہونچکر علاؤالدین نے فوج کو آرام دیا اور یہاں مشہور
کردیا کہ وہ سلطنت دہلی کا ایک افسر ہے۔ اور شہنشاہ سے ناراض ہوکر جنوب
میں تلنگانہ کے راجہ کے پاس ملازمت کیلئے جا رہا ہے۔ چند دن ستانے کے بعد
یکایک شب میں علاؤالدین نے اپنی فوج کو ایلچپور چھوڑ کر جنوب کی طرف
بڑھنے کا حکم دیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دیوگیری سے ۱۲ میل کے فاصلہ
پر مقام لہسوڑا میں آکر ٹھیرا۔ جس وقت یہ خبر دیوگیری میں پہونچی تو راجہ رام
دیو نے مدافعت کے خیال سے ایک فوج بھیجدی۔ جس کو علاؤالدین نے آسانی سے
شکست دی۔ اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دیوگری کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے
یہاں مشہور کردیا کہ شہنشاہ دہلی کی فوج پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ اور جو فوج
اسکی کمان میں ہے صرف ایک ہراولی دستہ ہے۔ اس خبر سے گھبرا کر راجہ نے
صلح کرلی۔ راجہ نے علاؤالدین کو پچاس من سونا، ایک من موتی، چالیس
ہاتھی اور گھوڑے دینا قبول کر لیا۔ علاؤالدین نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ اس
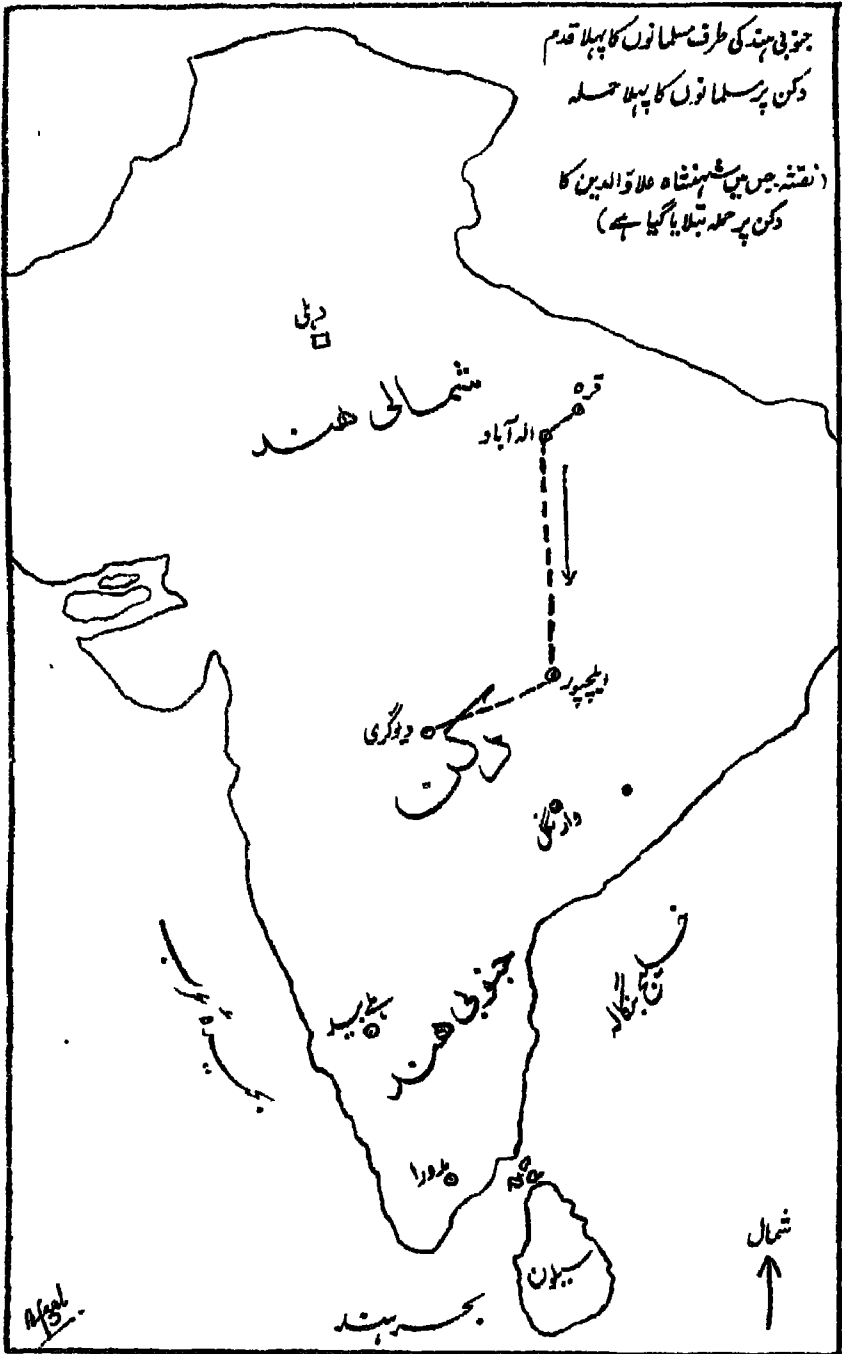
وقت اس کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس خطرے میں ہے۔ دیوگیری میں جو ہندو فوج تھی وہ تھوڑی سی تھی۔ فوج کا بڑا حصہ کسی اور جنگ میں مصروف تھا۔ اگر وہ فوج واپس آجائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ اگر وہ واپس ہونا بھی چاہے تو خاندیس، مالوہ اور گونڈوانا کی ہندو سلطنتیں اس کا راستہ روک دینگی۔

صلح کی شرائط ابھی طے ہو رہی تھیں کہ بیچ میں دیوگیری کی فوج اپنی مغربی سرحد سے واپس آ گئی۔ راجہ کا بیٹا اس فوج کی کمان خود کر رہا تھا۔ راجہ نے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ صلح ہو چکی ہے۔ اس لئے مسلمانوں پر حملہ نہ کیا جائے۔ لیکن شنکر دیو نے جس کی فوج علاؤالدین کی فوج سے کئی حصّے بڑھکر تھی ۔ علاؤالدین کو کہلا بھیجا کہ جو کچھ اب تک حاصل کیا گیا ہے۔ چھوڑ کر واپس ہو جائے۔ علاؤالدین نے اس کو اپنی توہین سمجھی۔ اس نے دیوگیری کے محاصرہ پر ایک ہزار کی فوج چھوڑ کر باقی فوج سے شنکر دیو پر حملہ آور ہوا۔ خوش قسمتی اسکے ساتھ تھی۔ جنگ میں ہندو فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور شنکر دیو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ علاؤالدین نے پلٹ کر دیوگیری کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

رام دیو والئ دیوگیری اس تمام عرصہ میں امید و بیم کی حالت میں بسر کی لیکن مدافعت کی تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ مگر شنکر دیو کی شکست کا حال سنکر اسکی ہمت پست ہو گئی۔ اور نئے سرے سے صلح کا طالب ہوا۔ علاؤالدین نے اب شرائط صلح کو ذرا سخت کر دیا۔ آخر بڑی مشکل سے صلح کی شرائط طے ہوئیں۔ راجہ نے علاؤالدین کو چھ سو من سونا۔ سات من موتی، دو من ہیرے اور جواہر

ایک ہزار من چاندی - چار سو تھان ریشم اسی وقت دیدیا . اور آئندہ کے لئے ہر سال ضلع ایلچپور کے محاصل بطور خراج دینا منظور کرلیا۔ علاؤالدین نے اپنی جانب سے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کی فوج جو پیچھے پیچھے آرہی ہے وہ دیوگیری پر حملہ نہیں کریگی . محاصرہ اٹھاکر علاؤالدین واپس پلٹ گیا۔ لیکن اس کے اس حملے نے جنوبی ہند پر مسلمانوں کے آئندہ حملوں کی بنیاد رکھدی "

اس لحاظ سے جنوب کی طرف یہ پہلا فاتحانہ قدم تھا جو مسلمانوں نے اٹھایا۔

دکن پر مسلمانوں کا دُوسرا اور تیسرا حملہ

جنوب کی طرف دوسرا اور تیسرا قدم

قریباً بارہ سال تک دیوگیری کے راجہ رام دیو اپنے عہد کو نبھاتے ہوئے دہلی کو خراج ادا کرتا رہا . اس کے بعد جب اس نے دیکھا کہ علاؤالدین شمالی مہموں میں مصروف ہے تو اس نے خراج بھیجنا بند کر دیا . علاؤالدین اس وقت دہلی کا شہنشاہ تھا . اس کو امور سلطنت پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ جزئیات تک نظرانداز نہیں ہوتے تھے دیوگیری کا خراج بند ہوتے ہی اس نے اپنے غلام ملک کافور کو دکن پر فوج کشی کا حکم دیا . اس کے علاوہ اس حملے کا محرک ایک اور سبب بھی تھا . جس کو مورخ ہیگ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴ پر اس طرح لکھا ہے :-

" علاؤالدین نے جس وقت گجرات پر چڑھائی کی تھی تو وہاں کے راجہ رائے کرن کی خوبصورت رانی کملا دیوی اس کے ہاتھ آگئی تھی . رانی نے اپنی خوشی سے دہلی

کے شاہی محلات میں بطور حرم رہنا منظور کر لیا۔ لیکن یہاں اس کو اپنی بیٹیوں کی یاد ہمیشہ مغموم رکھتی تھی۔ ایک تو فوت ہو چکی تھی۔ اور دوسری جس کا نام دیول دیوی تھا۔ اپنے باپ رائے کرن کے پاس گجرات میں تھی۔ اس لڑکی کی منگنی دیو گیری کے راجہ رام دیو کے بیٹے شنکر دیو سے ہونے والی تھی بشنکر دیو مرہٹہ تھا۔ اور رائے کرن ایک اور ذات کا ہندو وہ اس شادی کا اس لئے مخالف تھا کہ اس میں اور مرہٹوں میں رشتہ داری نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دیو گیری والوں نے جنگ میں یہ شرط بہ جبر منوالی تھی۔

علاؤالدین نے رائے کرن کو لکھا کہ دیول دیوی کو دہلی بھیجدیا جائے۔ جب یہ فرمان گجرات میں پہونچا تو رائے کرن نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹی کو مسلمانوں کے حوالے کرنے سے یہ بہتر ہے کہ مرہٹوں کو دیدی جائے۔ اس نے بیٹی کو دیوگری بھیجدیا۔ لیکن یہ ابھی راستے میں ہی تھی کہ علاؤالدین کے سپہ سالار الغ خاں نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ رائے کرن کو شکست ہوئی۔ لیکن محلات میں دیول دیوی کا پتہ نہیں ملا۔ اتفاقاً ایک دن جب اسلامی فوج دریائے گرجا کے کنارے کمپ ڈالے ہوئے تھی تو چند سپاہی غار ہائے ایلورا دیکھنے کیلئے نکلے۔ ان غاروں کے قریب میدانوں میں جب وہ پھر رہے تھے تو انہیں ایک مختصر سی ہندو فوج نظر آئی۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ دیو گیری کی فوج رائے کرن کی مدد کو آرہی ہے۔ اس لئے انہوں نے مجتمع ہو کر اس فوج پر حملہ کر دیا ہندوؤں کو شکست ہوئی۔ اور وہ گھوڑا جس پر دیول دیوی سوار تھی زخمی ہو کر بیٹھ گیا۔ اس وقت مسلمان سپاہی مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے بڑھے

محافظوں نے کہا کہ یہ راجہ رائے کرن کی بیٹی ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں کی خوشی
کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ انہوں نے دیول دیوی کو الغ خاں کے پاس پہونچا دیا
جہاں سے وہ دہلی پہونچا دی گئی۔ اور وہاں اس کی شادی خضر خاں سے ہو گئی۔"
(نوٹ:۔ امیر خسرو نے ان حالات کو نظم میں لکھ کر دیول دیوی کو عشقیہ داستانِ محبت کی ایک غیر
فانی ہیروئن بنا دیا ہے)

الغ خاں ادھر گجرات کی لڑائی میں مصروف تھا۔ ادھر سلطان علاؤالدین نے دیوگیری
والوں کو سزا دینے کے لئے ملک کافور کو بھیجا۔ ۱۳۰۶ء کی جنگ میں رام دیو کو شکست ہوئی۔
کافور نے اس کو قید کر کے دہلی بھیجدیا۔ جہاں سلطان نے اسکی نہایت خاطر و مدارات کرتے ہوئے
پھر اس کی ریاست اس کو بخشدی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ شہنشاہ نے رام دیو کو رائے کا خطاب
عنایت کیا۔ نیز چتر پکڑنے کی اجازت بھی دی۔ ان عنایات شاہی کو دیکھکر رام دیو اس کے
بعد تادم مرگ وفادار رہا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند پر آئندہ حملوں کے لئے
شہر دیوگیری مسلمانوں کا ایک مرکز بن گیا۔

دکن پر مسلمانوں کا تیسرا حملہ

اس جنگ کے دو سال بعد یعنی ۱۳۰۹ء میں علاؤالدین کے حکم سے ملک کافور تلنگانہ
کی فتح کے لئے پھر دوسری بار دکن میں آیا۔ اس وقت دیوگیری کے راجہ رام دیو نے بھی مسلمانوں
کی تائید کی۔ ملک کافور نے اندور (نظام آباد) پر قبضہ کرتے ہوئے ورنگل پر چڑھائی کی۔
ورنگل کا محاصرہ کر لیا گیا۔ قریب نہیں تھا کہ ورنگل فتح ہو جاتا۔ لیکن کافور کو ہدایات تھیں
کہ راجہ اطاعت قبول کر لے تو صلح کر لی جائے۔ اس لئے جب پرتاپ رودرا دیو نے صلح چاہی تو

ملک کافور بہت سا زر و جواہر، ایک سّو ہاتھی اور سات ہزار گھوڑے لے کر دھلی واپس چلا آیا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ

۱۳۱۰ء

دکن پر تیسرے حملے کے ایک سال بعد یعنے ۱۳۱۰ء میں سلطان علاؤالدین خلجی نے ملک کافور کو جنوبی ہند پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس حملے کے علل و اسباب وغیرہ پر مورخین نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے :-

"اس زمانے میں سرحد کابل سے لیکر انتہائے بنگالہ تک اور گجرات و دکن کے سب قلعے و صوبہ جات بادشاہ علاؤالدین کے زیر فرمان ہوئے۔ اور تمام رجواڑوں میں بھی اس کا سکہ و خطبہ رائج ہوا کہیں دس بیگھہ زمین ایسی نہ تھی۔ جہاں اس کا حکم نافذ نہ ہو۔ تب اس نے چاہا کہ راس کماری کے حدود اور سواحل ہند و لنکا کو مسخر کرے۔ لہٰذا ملک نائب و حاجی خواجہ کو ۷۱۰ھ میں لشکر عظیم کے ساتھ روانہ فرمایا۔ اور مشہور تھا کہ وہاں کے بتخانے زر و جواہر نفیسہ سے بھرے ہوئے ہیں جب یہ دونوں دیوگڑھ پہونچے تو معلوم ہوا کہ رام دیو کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور اس کے بیٹے کو باپ کے موافق مخلص نہ پایا۔ لہٰذا ایک سردار کو معہ فوج حاضرہ کے قریب جو دکن کی گنگا کے کنارے واقع ہے۔ چھوڑ کر آگے بڑھے، اور کفار کندہ کے قتل میں زیادہ اہتمام کیا۔ اور اس ہیبت و سیاست سے تین ماہ

بعدان مقامات میں پہونچے اور ویاں راجہ کرناٹک کو گرفتار کرکے تمام ولایت کو غارت کیا۔ اور بت خانوں کو توڑکر مرصع بتوں پر قبضہ کرلیا۔ اور آخر میں ایک مسجد مختصر بنائی۔ اور وہاں خطبہ سلطان علاؤالدین کا پڑھا۔ وہ مسجد رامیشر میں بدستور باقی ہے۔ اور اس کو مسجد علائی کہتے ہیں۔

ملک نائب نے سب اموال ہاتھیوں پر لاد کر معبر کی طرف کوچ کیا۔ جو لنکا کا پل مشہور ہے۔ اور وہاں سے بھی ہزاروں برس کے خزانے لیے۔ اور صحیح سلامت کوچ پر کوچ روانہ ہو کر ۷۱۱ھ میں دہلی پہونچا۔ اور تین سو بارہ ہاتھی اور بیس ہزار گھوڑے اور دو کروڑ اشرفیاں وطلائی صندوق اور موتی وجواہرات کے صندوق جو شمار سے باہر تھے۔ ہزارستون کے سامنے بادشاہ کے روبرو پیش کیے۔" (تاریخ فرشتہ اردو صفحہ ۱۷۲ مطبوعہ نولکشور)

اس زمانہ میں جنوبی ہند کی مالی حالت کے متعلق یہی مورخ لکھتا ہے:۔

"مورخین نے ملک نائب کے فتوحات کرناٹک میں سونے طلا کے چاندی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں سونے کی اس قدر کثرت تھی کہ چاندی شمار میں نہ لاتے تھے۔ اور اس زمانے میں بھی وہاں کا چلن اکثر سونے کے عوض ہے۔ اور وہاں کے فقیروں کو چاندی کے زیور سے شرم آتی ہے۔ مالداروں کا کیا ذکر وہاں کے اوسط درجے والے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔" (صفحہ ۱۷۳)

امیر خسرو کی تاریخ علائی میں کچھ زیادہ تفصیل آئی ہے۔ لیکن وہ بھی بہت کچھ تشنہ ہے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں:۔

" دیوگری، اور ورنگل کی فتوحات کے بعد ہندوستان میں صرف دو ہندو سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوار سمندر کی اور دوسری مدورا کی۔ ملک کافور اب انہیں فتح کرنے بیٹھے تھے۔ ۲۴ر جمادی الآخر ۷۱۰ھ میں فوج دہلی سے نکلی۔ جس وقت ملک کافور باندری (پرندھارپور) میں مقیم تھا۔ اس کو اطلاع ملی کہ مدورا میں دو بھائی ویرا پانڈیا اور سندرا پانڈیا تخت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوار سمندر کا راجہ بلال دیو سوم انکے ملک پر حملہ آور ہوا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ہونے والے حملہ کا حال سنکر اپنے پائے تخت کو واپس ہوا ہے۔ اتوار مورخہ ۲۲ر رمضان المبارک کے دن ملک کافور نے امرائے فوج سے مشورت کی اور سوار فوج کا ایک منتخب دستہ لیکر بارہ دن کی مسافت کے بعد دوار سمندر کے آگے پہنچا۔ یہاں اس نے راجہ کے آگے تین شرائط پیش کیں۔

(۱) اسلام قبول کیا جائے یا (۲) ذمی بنکر جزیہ دینا قبول کرے۔ یا (۳) جنگ پر آمادہ ہو جائے۔

حالات کا اندازہ کرتے ہوئے راجہ بلال دیو سوم نے صلح کر لینی چاہی۔ اگرچہ کہ راجہ ویر پانڈیا نے اسکی تائید کیلئے فوج بھیجدی تھی صلح ہوگئی راجہ نے اپنا تمام خزانہ ہاتھی اور گھوڑے ملک کافور کی نذر کر دیا۔ ملک کافور نے اس نذرانہ کے ساتھ بلال دیو کو بھی شہنشاہ کے پاس دہلی کو بھیجدیا۔

ان تحریروں سے ظاہر ہے کہ امیر خسرو اور فرشتہ نے اسباب وعلل کو چھوڑ کر صرف نتائج کو قلمبند کر دیا ہے۔ اور انہی روایات کو لیکر عام طور پر انگریزی مورخین نے لکھ

"اس حملے کا سبب بھی وہی ہے جو پہلے حملوں کا تھا۔ مسلمانوں کو مال و زر اور ہاتھیوں کی ضرورت تھی جو معبر یعنے جنوبی ہند میں کثرت سے تھے۔"

چنانچہ رپس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"۱۳۱۰ء میں علاؤالدین کے جنرل ملک کافور نے ہوسے سالا کی اس مملکت پر حملہ کیا۔ جس کا پائے تخت دوار سمندرم میں تھا۔ ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد راجہ بلالا سوم کو شکست ہوئی۔ اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا۔ فاتحین نے دوار سمندرم کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ دشمن کے ہاتھ بے حساب خزانہ اور زر و جواہر آئے۔ ملک کافور نے اس فتح کے بعد جنوب میں مدورا کو فتح کیا۔ اور یہاں سے رامیسورم تک بڑھا۔ جہاں اس نے ایک مسجد تعمیر کی۔"

لیکن وصاف نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے :۔

"جنوبی ہند میں اس وقت قابل ذکر دو سلطنتیں تھیں۔ جن میں ایک میسور کی ہوسے سالا حکومت تھی۔ جس کا پائے تخت دوار سمندرم میں تھا۔ اور دوسری مدورا کی پانڈیا حکومت تھی۔ ہوسے سالا حکومت دریائے کرشنا سے نیچے ملیبار تک اور بحیرۂ عرب سے لیکر ساحل کورومنڈل تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں پانڈیا خاندان تمام ملک کرناٹک پر راس کماری تک حکومت کر رہا تھا۔ ملیبار اور ٹراونکور وغیرہ اسی کے ماتحت تھے۔ اس زمانے میں جب دہلی میں شہنشاہ علاؤالدین برسر حکومت تھا تو مدورا کے تخت کے لئے دو بھائیوں میں جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا لڑائی ہوئی۔ ویرا پانڈے نے سندرا پانڈے کو مدورا سے نکالدیا۔ اور اس نے سلطان علاؤالدین سے تائید مانگی۔"

کافور کے حملے کے وقت یعنی ۱۳۱۰ء میں

جنوبی ہندوستان

بمبئی

دکن

پینار

ہلے بید

ہوے سالا سلطنت

مدراس

نیلگری

چدمبرم

خلیج بنگالہ

پانڈیا سلطنت

مدورا

رامیسورم

سیلون

بحر ہند
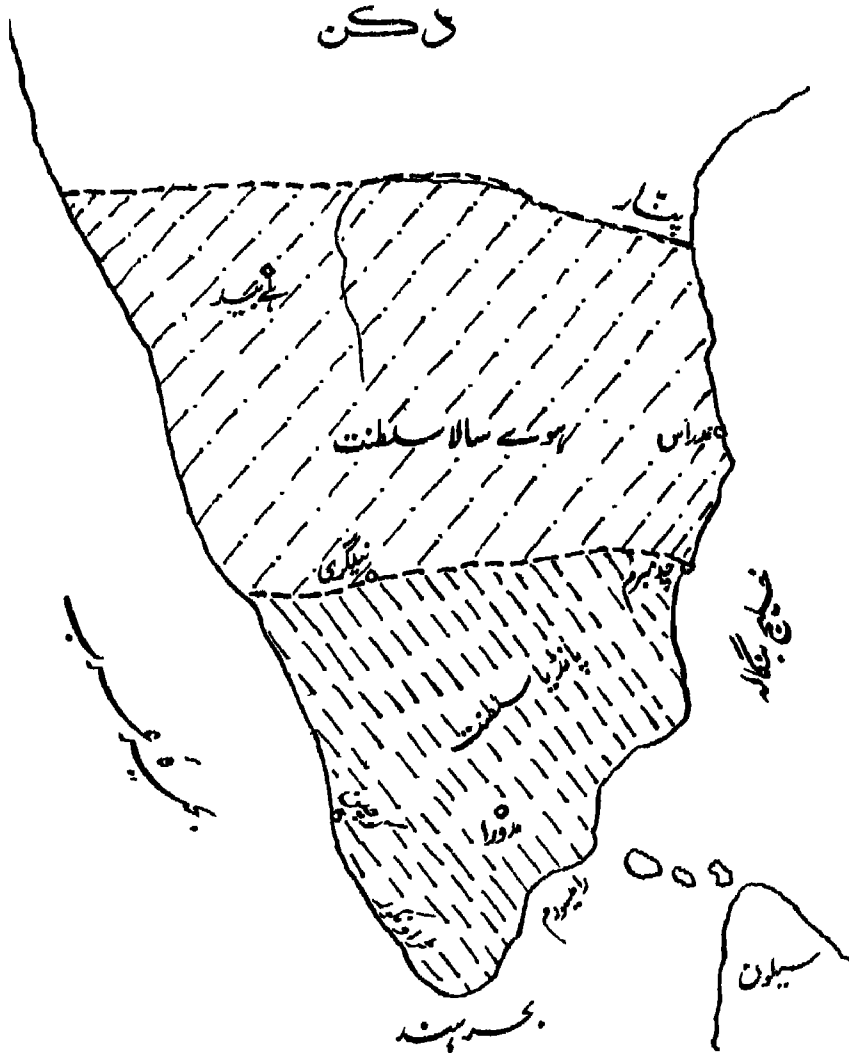
کافور کے حملے کے وقت

جنوبی
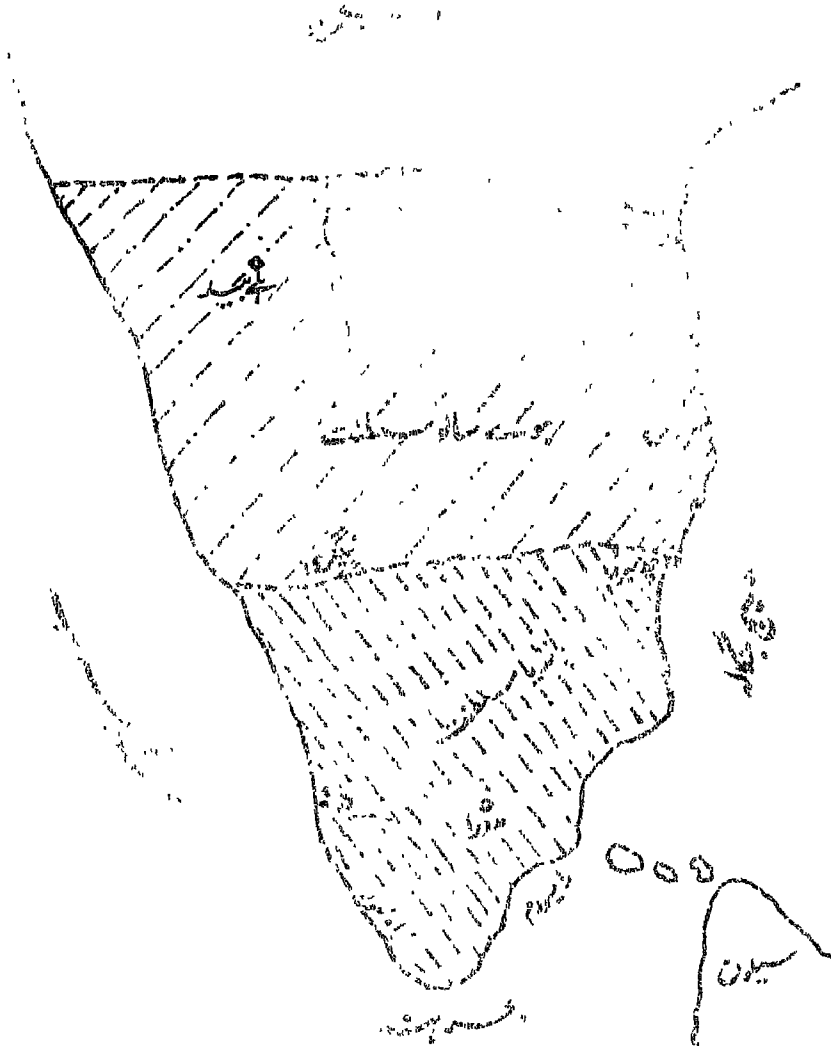
مدورا۔ میناکشی کا مندر
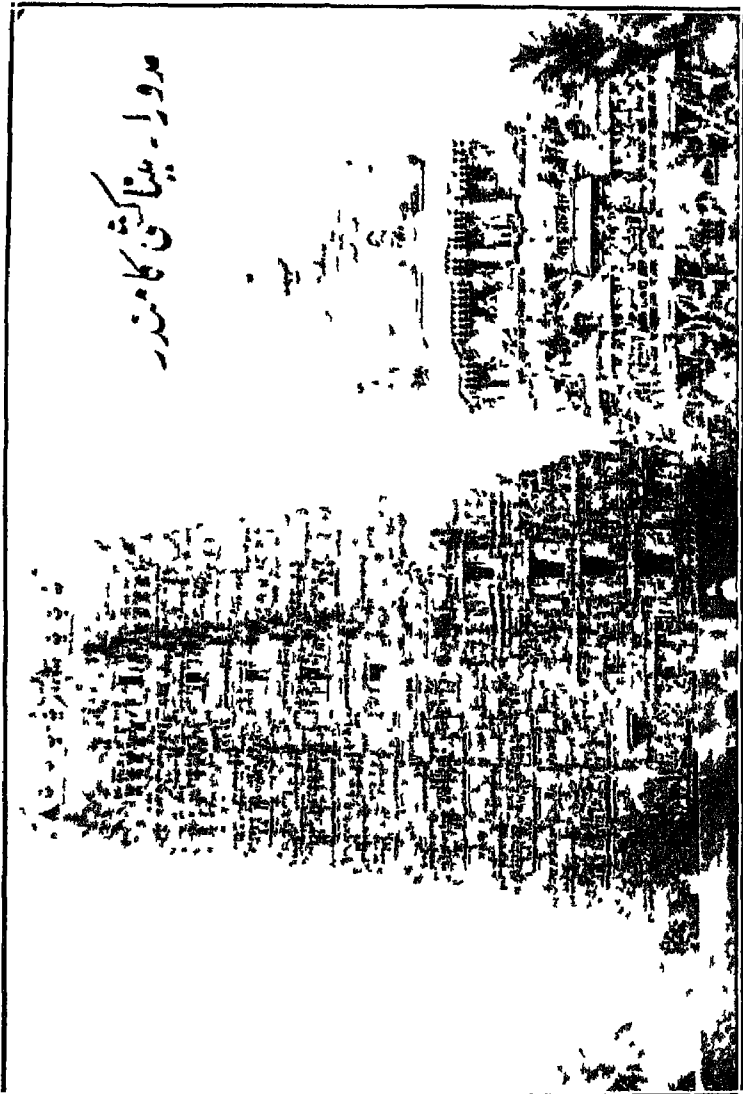
مورخ الیٹ نے بھی وصاف کی اس روایت کی تائید کی ہے۔ مدورا کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مصنف نے بھی کتبوں اور مقامی روایتوں سے نتیجہ نکالتے ہوئے لکھا ہے :-

"مدورا کے تخت کے لئے وارثوں میں سخت لڑائی ہوی۔ ان میں سے ایک نے سلطان علاؤالدین سے مدد مانگی اور اس نے اپنے جنرل ملک کافور کو جنوب میں بھیج دیا۔"

سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویڈرس Southern India & her Mohamedan Invaders. کا مصنف ڈاکٹر ایس۔ کرشنا سامی اینگار لکھتا ہے :-

"مدورا کے راجہ کے دو بیٹے تھے۔ جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا۔ باپ بڑے بیٹے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس کو ولی عہد بنایا۔ باپ کی اس کارروائی سے چھوٹا بیٹا سندرا پانڈے ناراض تھا۔ اور موقع ملنے پر اس نے سلطان علاؤالدین سے مدد چاہی۔" (صفحہ ۹۶)

مذکورۂ بالا تمام روایتوں پر ایک ساتھ نظر ڈالی جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ :-

"ہندوؤں کی آپس کی نا اتفاقی نے مسلمانوں کو جنوب پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت تمام جنوبی ہند میں خانہ جنگی کی آگ پھیلی ہوی تھی۔ مدورا کی قدیم راجدھانی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک حصہ بڑے بھائی ویرا پانڈے کی حمایت پر تھا۔ تو دوسرا حصہ چھوٹے بھائی سندرا پانڈے کی تائید پر۔ دونوں بھائیوں میں ایک عرصہ تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر تنگ آکر بڑے بھائی ویرا پانڈے نے ہمسایہ سلطنت دوار سمندرم کے راجہ سے مدد مانگی۔ اب چھوٹے بھائی سندرا پانڈے پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا۔ جنوب میں کوئی اور سلطنت نہیں تھی۔ جو اس کی تائید کرسکتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے سفیر کو دہلی بھیجا۔ اور مسلمانوں سے تائید چاہی ..

اس نقشہ میں ملک کافور کا راستہ جو
اس نے مدورا پر حملہ کرنے کیلیئے اختیار
کیا تھا۔ دکھایا گیا ہے
دہلی
باگل کوٹ
جنوبی ہند
خلیج بنگالہ
مدورا
سیلون
بحر ہند
Drawn by
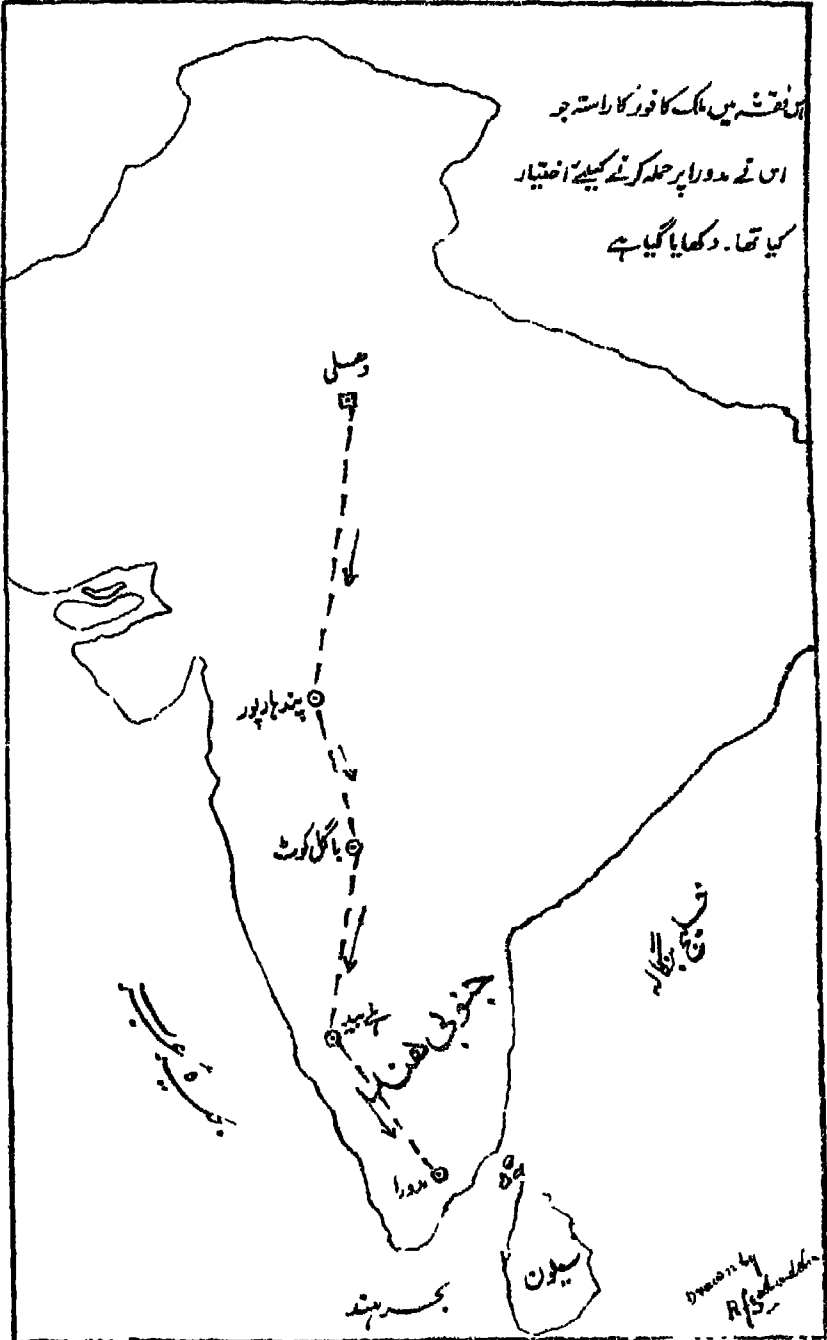
علاؤالدین نے تائید وہی قبول کرلی۔ اور اپنے جنرل ملک کافور کو مدورا پر حملہ کرنیکا حکم دیا۔"

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دوارسمندرم پر حملہ کیوں کیا گیا۔ اگر جنوبی ہند کی جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دوارسمندرم کی سلطنت جنوبی ہند کے شمالی حصہ پر قابض تھی۔ اور بغیر اس سلطنت کے حدود میں سے گذرنے کے جنوب میں مدورا تک رسائی ناممکن تھی اور اس کے ساتھ ہی کافور نے اپنی جنگی فراست سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اگر دوارسمندرم پر حملہ کیا جائے تو راجہ بلالا اپنے پائے تخت کو بچانے کیلئے مدورا سے واپس ہو جائیگا۔ اور اس طرح سندراپانڈے کو وہاں مہلت مل جائیگی۔ اس کے علاوہ کافور کے زیر نظر یہ بات بھی تھی کہ اگر بغیر دوارسمندرم پر حملہ کرنے کے وہ مدورا پر بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ بلالا سوم اس کی واپسی کا راستہ مسدود کردے ان دونوں امور کا لحاظ کرتے ہوئے کافور نے دوارسمندرم پر حملہ کیا۔ اب رہی اس حملہ کی نوعیت۔ اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کا یہ حملہ برقی سرعت سے ہوا۔ ملک کافور ایک تجربہ کار جنرل تھا۔ وہ اپنے دشمن کو اس قدر مہلت دینا ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ طاقت جمع کرسکے۔ کافور بندر پور سے نکل کر بارہ دن کے عرصہ میں دوارسمندرم کو پہونچا۔ جنگ کا نتیجہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

کافور نے راجہ بلالا سوم کو دہلی بھیجدیا۔ صرف اس لئے کہ بلالا سوم کہیں موقع پاکر اس کی واپسی کا راستہ مسدود نہ کردے یہ ایک نہایت ضروری جنگی احتیاط تھی۔ جو کافور نے اختیار کی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے مدورا تک راستہ صاف تھا۔ اور ان کو یہ بھی اطمینان تھا کہ ان کی واپسی کا راستہ سلامت اور بے خطر ہے۔

دوارسمندرم (ہلے بید) پر مسلمانوں کا قبضہ

گذشتہ باب میں امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کافور پندھارپور سے نکل کر دوارسمندرم کو بارہ دن میں پہونچا۔ اس نے دوارسمندرم کو پہونچنے کیلئے جس راستے کو اختیار کیا وہ پندھاپور سے بیجاپور اور یہاں سے ہرتی ہر، ہرپور اور بآنا وار پر سے ہوتا ہوا دوارسمندرم پہونچتا ہے۔

اس زمانے میں جب ذرائع حمل ونقل اور رسل ورسائل اس قدر وسیع اور آسان نہیں تھے۔ اتنی بڑی مسافت کا اس قدر جلد طے کرلینا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ ملک کافور نے دوارسمندرم پہونچکر راجہ کے آگے تین شرائط پیش کیں۔

(۱) اسلام قبول کرلیا جائے۔ یا

(۲) ذمی بنکر جزیہ دینا قبول کرے۔ یا

(۳) جنگ کے لئے آمادہ ہوجائے۔

امیر خسرو نے لکھا ہے کہ راجہ نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اطاعت قبول کرلی۔ وہ لکھتے ہیں کہ بلالا سوم نے سوائے مقدس جانیو (دھاگے) کے باقی تمام دولت کافور کے حوالے کردی۔ چھٹویں شوال کے دن تین سفیروں کے ذریعہ چھ ہاتھی بھیجے گئے۔ اور اتوار کا دن راجہ نے خود اپنے آپ کو کافور کے حوالے کردیا۔ اس سے پیشتر رات کو تمام خزانے کافور کی خدمت میں بھیجے جا چکے تھے اگر امیر خسرو کے بیان کو مان لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوارسمندرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ لیکن اس بیان کے خلاف جنوبی ہند کے جس قدر مورخین نے یہاں

کے حالات لکھے ہیں۔ اور مقامی طور پر جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوارسمندرم میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ قرینِ قیاس بھی یہی ہے۔ کہ ایک خودمختار و زبردست ہندو راجہ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ بغیر مقابلہ کئے کافور کی شرائط کو تسلیم کرلے۔ کافور نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہر روز ہندو فوج قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتی تھی۔ لیکن مسلمان سواروں کی تیراندازی سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ بارہ[۱۲] دن کے محاصرہ کے بعد مسلمان فصیل قلعہ کو توڑ کر شہر پہ قابض ہو گئے۔ شاہی محلات کا محاصرہ کر لیا گیا۔ بلالا سوم نے اس وقت مجبور ہو کر صلح مانگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے تفصیلات کو چھوڑ کر صرف نتیجہ لکھ دیا ہے۔

مورخین کو حیرت ہے کہ ایک زبردست قدیم راجدھانی جہاں مدافعت کا تمام ضروری سامان موجود اور تمام اطراف کا ملک ہندوؤں سے بھرا ہوا تھا کس طرح بارہ دن کے عرصہ میں فتح ہو گئی۔ اس حیرت کو رفع کرنے کے لئے مورخ ریس وصاف کی روایت کو لے کر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

"۱۳۱۰ء میں ملک کافور برق اور آندھی کی طرح آیا۔ راستہ میں حائل ہونیوالی تمام قوتیں اس کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔"

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے:-

"مسلمانوں کا یہ حملہ کوہ آتش فشاں کے اس سیال مادہ کے مانند تھا۔ جو اپنے راستہ میں حائل ہونے والی ہر چیز کو فنا کر دیتا ہے۔"

ان تحریروں کے ساتھ اگر مقامی کتبوں اور روایتوں پر بھی نظر کی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ دوارسمندرم کا شہر ایک خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

مسلمان جب فصیل قلعہ اور مندر پر قابض ہو کر محل کا محاصرہ کر چکے تو بلال دیو سوم نے اطاعت کر لی۔ اور اپنا تمام خزانہ اور ہاتھی وغیرہ ملک کافور کے حوالے کر دیا۔

"سدرن انڈیا اینڈ ہر محامڈن انویڈرس" کا مصنف صفحہ ۹۴ پر لکھتا ہے :-

"بلال سوم نے دن میں ملک کافور سے ملاقات کی۔ واپس ہو کر دوسری شب بھر محل میں اپنے خزانے نکالنے میں مصروف رہا۔ دوسرے دن اس نے تمام دولت اور ہاتھیوں کو اسلامی سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ کافور نے یہ تمام دولت اور راجہ کو علاؤالدین کے پاس بھیج دیا۔"

تاریخ نیور ٹو بی فرگاٹن ایمپائر (Never to be forgotten Empire) کا مصنف پی۔ سوری نارائن راؤ لکھتا ہے :-

"کافور نے جس قدر دولت دوارسمندرم سے دہلی کو روانہ کی۔ اس کی مالیت موجودہ شرح سے ۱۵۰ پچاس کروڑ روپیہ کی ہوتی ہے۔ بلاشبہ ایک غلام کے لئے یہ ایک بڑی دولت تھی۔"

دوارسمندرم کے فتح ہونے کے بعد اپنے تحفظ کے خیال سے کہ کہیں واپسی کا راستہ مسدود نہ ہو جائے۔ کافور نے راجہ بلال دیو کو دہلی بھیج دیا۔ جہاں سلطان علاؤالدین نے اس کو کافور کے واپس آنے تک نہایت عزت و احترام سے رکھا اور کافور کی واپسی کے بعد باجگزاری کا عہد لیکر اس کو دوارسمندرم واپس بھیج دیا۔

(نوٹ :- معلوم ہوتا ہے کہ بلال سوم ۱۳۱۳ء میں دہلی سے واپس ہوا۔ دوارسمندرم میں ایسے کتبے ملے ہیں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ بلال دیو نے اپنی واپسی کی خوشی میں مندر کو جاگیر دی تھی۔)

ملک کافور جنوبی ہند میں

ملک کافور دوار سمندرم کو فتح کرکے مدورا کی جانب بڑھا۔ راستہ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ کافور دوار سمندرم سے نکلکر میسور اور ملیبار کے راستے سے مدورا گیا۔ اور دوسرے کہتے ہیں کہ دوار سمندرم سے اس نے مشرقی راستہ اختیار کیا تھا۔ امیر خسرو نے اپنی تاریخ علائی میں اس راستہ کا تعین کیا ہے لیکن یہ نام آج اس قدر مسخ ہوگئے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مقامات کہاں تھے اور کہاں نہیں۔ تاریخ کی یہ کس قدر خوش نصیبی ہے کہ مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے چند ایسے قدیم کتبے دستیاب کئے ہیں جن سے امیر خسرو کے بتلائے ہوئے راستے کی تصدیق ہوتی ہے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں :-

"ملک الاسلام (ملک کافور) دوار سمندرم سے ۱۰ ر شوال بروز چہار شنبہ معبر کی طرف نکلا۔ پانچ دن کے بعد ان پہاڑوں پر پہونچا۔ جو ہوے سالا سلطنت کو معبر سے جدا کرتے ہیں۔ یہاں اس نے تبار اور سرملی کے دروں سے نکل کر دریائے کونباری کے ساحل پر شام کے وقت پڑاؤ ڈالا۔ دوسرے دن مسلمان حملہ آور بیر دھول کی مملکت پر بڑھے۔ اس خبر کو سن کر راجہ نے کسی جزیرہ میں جان بچانی چاہی۔ لیکن امراء نے مشورہ دیا کہ خشکی میں کسی جگہ مقام کرے۔ وہ اپنے ساتھ تھوڑا سا خزانہ لیکر کنڈور کو گیا۔ لیکن اس کو بھی غیر محفوظ سمجھ کر اس نے دور جنگلوں میں پناہ لی۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا۔ کنڈور میں ایک جماعت جو اس راجہ کی رعایا تھی۔ اسلامی فوج میں مل جانا چاہتی

تھی۔ یہ لوگ نیم ہندو اور نیم مسلمان تھے۔ صرف کلمہ پڑھنا جانتے تھے۔ یہ لوگ واجب القتل تھے۔ لیکن کافور نے ان کی جاں بخشی کی۔ یہاں سے ملک کافور بیرہ ہول جاکر راجہ کی تلاش میں پھر کندور پہونچا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ جالکوٹ کو چلا گیا ہے۔ جو راجگان ویر (مدورا) کا قدیم شہر ہے۔ ملک کافور یہاں بھی اس کے تعاقب میں نکلا۔ لیکن اس نے جنگلوں میں پناہ لے لی تھی۔ اس لیئے ہاتھ نہ آیا۔ پس ملک کندور میں واپس آگیا۔ یہاں اس کو معلوم ہوا کہ برتھمت پوری میں ایک طلائی بت اور بہت سے ہاتھی اور فوج ہے۔ ملک نے اس مقام پر شبخون مارا۔ صبح کو ۲۵۰ ہاتھی اس کے ہاتھ آئے۔ اس نے یہاں کے خوبصورت مندر کو ڈھا دینا چاہا۔ مندر کیا تھا؟ شداد کی بہشت کا نمونہ تھا۔ جس کے گم ہونے پر شاید شیاطین نے یہاں بنا لیا تھا۔ یہی رام لچھمن کا طلائی لنکا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مقام ہندوؤں کا مقدس تیرتھ تھا۔ ملک نے اس کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا۔ برہمنوں اور بت پرستوں کے سر رقص کرتے ہوئے زمین پر گرے۔ اور لہو کا ایک دریا موجیں مارنے لگا۔ پتھر کے وہ تمام بت جن کو مہا دیو کا لنگ کہا جاتا ہے۔ توڑ دیئے گئے۔ اس سے پہلے کبھی مسلمانوں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی اس جگہ رسائی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے بت جو[1] مضبوطی سے جمے ہوئے بیٹھے تھے اس قدر اونچے اڑے کہ ایک ہی جست میں لنکا کے قلعے میں پہونچ گئے۔ اس موقع پر اگر لنگوں کو پر ہوتے تو شاید یہ بھی اڑ جاتے۔ بے شمار سونا اور جواہرات مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ بت شکنی کے

[1] امیر خسرو کی مراد برہمنوں سے ہے جو اس مندر میں جمع تھے۔ اور جنہوں نے فرار ہو کر لنکا میں پناہ لی تھی۔
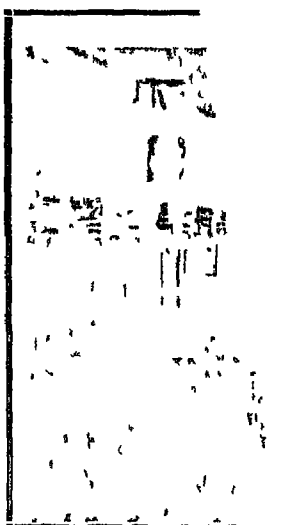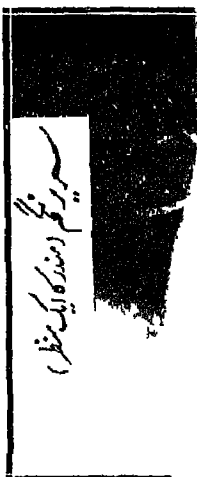
سری رنگم (مندر کا ایک منظر)

ملک کافور جنوبی ہند میں
(اسلامی فوج کی نقل وحرکت
---- اس طرح دکھائی گئی ہے)
بلاری
نلور
دوار سمندر
بانا وار
کرناٹک
دریائے کاویری
شمال
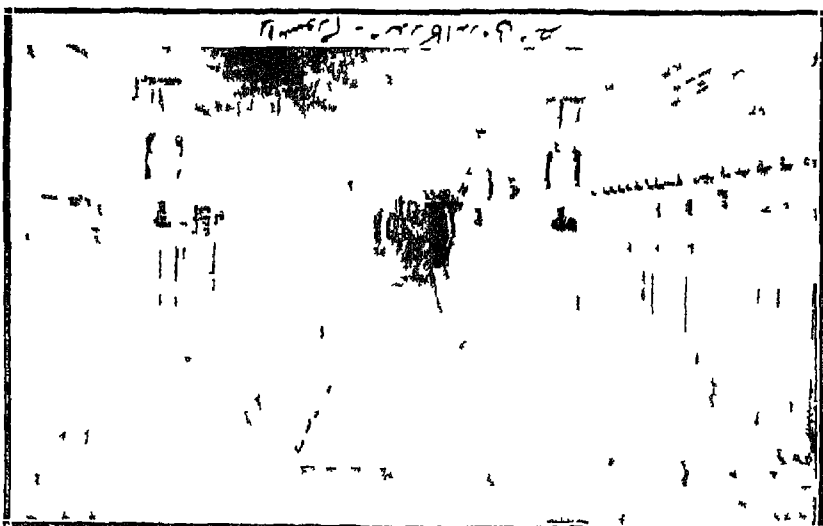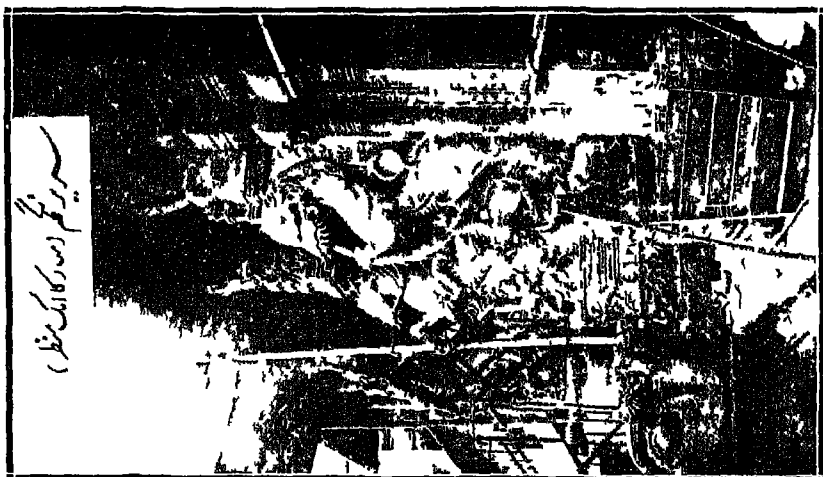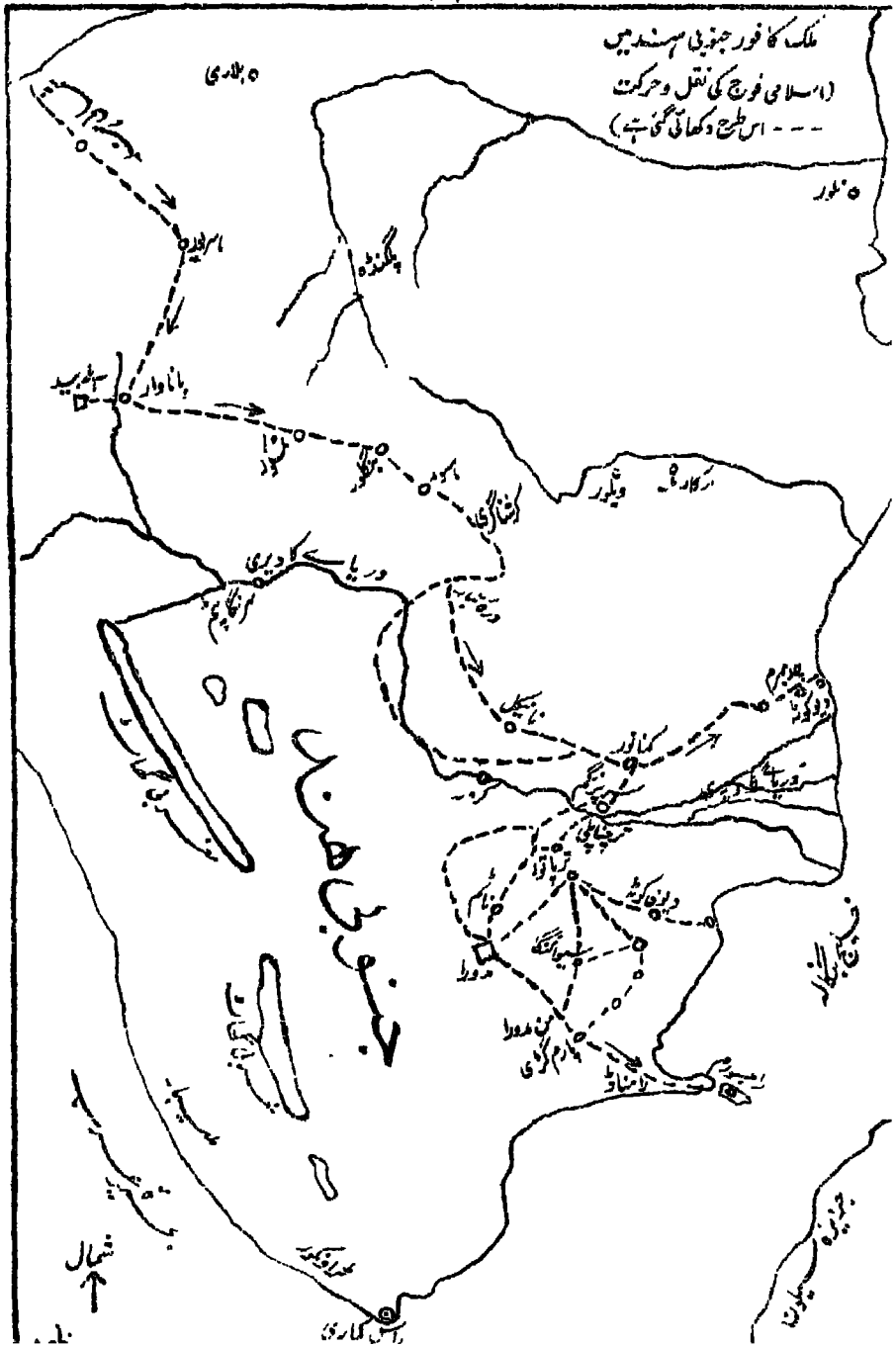
وقت مسلمانوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں رہے۔ بہرطور سسری رنگم کی تاخت کے بعد ملک کافور مدورا پر اس راستے سے بڑھا جو سرو ملے پہاڑوں سے گذرتا ہے۔ غالباً یہی وہ درہ ہے۔ جس کو خسرو نے تبرملی لکھا ہے۔

مدورا کی فتح کے بعد کافور رامیسورم پہونچا۔ امیر خسرو نے اپنے بیان میں جس طلائی مندر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد رامیسورم کا مندر ہے۔ جس کو ملک کافور نے تباہ کر دیا۔ ان فتوحات کے بعد ملک کافور نے سندرا پانڈے کو تخت نشین کر کے دہلی واپس ہوا۔

جنوبی ہندوستان پر ملک کافور کے حملے کے نتائج

جس طرح ایک نامعلوم زمانے سے مختلف قومیں اس ملک پر حملے کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح ۱۳۱۰ء میں مسلمانوں نے بھی اس ملک پر حملے کئے۔ دوسری قومیں جب ملک میں آتی تھیں۔ تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ لیکن مسلمان اس حملہ کے بعد جلدی ہی شمال کو واپس چلے گئے۔ اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے مستقل حکمرانی کی داغ بیل اس مفتوحہ علاقہ میں ڈال سکتے تھے۔ مگر سلطان علاؤالدین کی مصلحتوں نے کافور کو واپس بلالیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب مورخین نے یہ لکھا ہے کہ علاؤالدین کو شمال میں مغلوں کے حملوں کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ بہرطور مسلمان واپس ہوئے۔ لیکن ملک کی سیاسی حالت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب تک جنوبی ہند کی دونوں حکومتیں یعنے مدورا اور دوارسمندرم جو آزاد تھیں۔ مسلمانوں کی باجگذار بن گئیں۔ مورخ اسمتھ اور دوسرے انگریزی مورخین لکھتے ہیں :-

"ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ تمام ملک ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک ایک شہنشاہ کے زیر نگین آگیا"

واقعاتِ دہلی

ملک کافور کے دہلی پہونچنے کے بعد سلطان علاؤالدین کا انتقال ہوگیا۔ ملک کافور نے بادشاہ کے انتقال پر سلطان علاؤالدین کے بڑے بیٹوں کو قید کرکے سب سے چھوٹے کو تخت پر بٹھایا۔ اور آپ بحیثیت نائب حکمرانی کرنے لگا۔ اس سے امراء میں ناراضگی پھیل گئی۔ انہوں نے ۳۵ دن بعد کافور کو قتل کرکے علاؤالدین کے تیسرے بیٹے قطب الدین مبارک کو نائب بنایا جو رفتہ رفتہ خود بادشاہ بن گیا۔

دکن پر مسلمانوں کا چوتھا حملہ

سلطان علاؤالدین کی وفات پر دہلی میں جو انقلاب آیا۔ اس سے فائدہ اٹھاکر راجہ ہرپال دیو والئ دیوگیری نے خراج بھیجنا بند کردیا۔ اس لئے مبارک شاہ خلجی نے دکن پر فوج کشی کی۔ یہ مسلمانوں کا چوتھا حملہ تھا۔ جو دکن پر ہوا۔ شہنشاہ کی آمد کی خبر سن کر ہرپال دیو فرار ہوا۔ لیکن بہت جلد گرفتار کرلیا گیا۔ مبارک نے اس کی کھال کھنچوالی۔ اور اس کے سر کو دیوگیری کے دروازہ پر لٹکا دیا۔ دیوگیری کی سلطنت کا دہلی سے الحاق کرلیا گیا اس طرح ۱۳۱۸ء میں دکن کے قدیم یڈوا خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اس فتح کی خوشی میں مبارک نے دیوگیری میں

ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہاں سے اس نے کئی مہمیں بھیجیں۔ جنہوں نے تمام ملک مہاراشٹرا پر قبضہ کر لیا۔

ملک مہاراشٹرا کے انتظام سے فارغ ہو کر مبارک نے جنوب میں سازشوں کا دروازہ بند کرنے کیلئے گلبرگہ، ساگر اور دوارسمندرم میں فوجی چھاؤنیاں قایم کیں۔ اور یہاں اپنے نمائندے مقرر کئے۔ (جس طرح آج کل انگریزی حکومت میں پولیٹکل ایجنٹ اور چھاؤنیاں قایم کی جاتی ہیں)

اس کے بعد مبارک نے مملکت ورنگل پر توجہ کی۔ جنہوں نے دیوگیری والوں کی دیکھا دیکھی خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔

الیٹ اپنی تاریخ ہند میں امیر خسرو کے حوالے سے لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے دیوگیری کی تسخیر کے بعد خسرو خاں کو ورنگل بھیجا۔ خسرو نے ورنگل کا محاصرہ کر لیا۔ پرتاب رودر دیو نے عاجز ہو کر پناہ مانگی۔ خسرو نے اس کے آگے وہی تین شرائط پیش کیں۔ جو کافور نے دوارسمندرم کے راجہ کے آگے پیش کی تھیں۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ اور ورنگل کے پانچ اضلاع مسلمانوں کے حوالے کر دئے گئے۔ سو ہاتھی۔ بارہ ہزار گھوڑے۔ سونا اور جواہرات دینے کے علاوہ سالانہ خراج دینا بھی قبول کر لیا گیا۔ خسرو نے راجہ کی اس اطاعت پر اس کو تخت پر بیٹھنے اور سفید چتر پکڑنے کی اجازت دیدی اور پھر واپس چلا گیا۔ خسرو کی واپسی پر مبارک نے اس کو ملیبار پر فوج کشی کا حکم دیا۔"

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ

جس وقت علاؤ الدین کی وفات، کافور کے قتل اور دہلی میں انقلابات کی خبریں جنوبی ہند میں پہونچیں تو اپنا اثر کیے بغیر نہ رہیں۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ کافور نے سندرا پانڈے کو مدورا میں تخت نشین کر کے واپس ہوا تھا۔ لیکن کافور کی واپسی کے بعد ملک میں پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ لیکن دوار سمندرم کے راجہ بلالا سوم نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ "وہ اپنے گم شدہ رسوخ کو حاصل کرنے اور اپنے اجڑے ہوئے پایۂ تخت کو دوبارہ تعمیر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ (سدرن انڈیا اینڈ ہر محامڈن انویڈرس)

لیکن ایک دوسری ہندو طاقت یعنے ٹراونکور والوں نے راجہ راوی ورما کلسیکرا کی ماتحت ملیبار اور مدورا پر چڑھائی کر دی۔ اور اس جنگ کا اثر اس وقت ان مسلمانوں پر بھی پڑا۔ جو ملیبار میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کبھی تعرض نہیں کیا تھا اس لئے کہ مسلمان صرف تاجروں کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ملک کافور کے حملے کے بعد انہیں ملک میں ایک سیاسی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی خبریں جب مبارک کو پہونچیں جو اس وقت دکن میں تھا تو اس نے اپنے نو مسلم غلام خسرو کو ملیبار فتح کرنے کیلئے بھیجا۔

خسرو دیوگیری سے نکلکر دوار سمندرم میں پہونچا۔ راجہ بلالا سوم نے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ دوار سمندرم سے خسرو جنوب طرف بڑھا۔ یہ خبر سن کر راجہ راوی ورما ٹراونکور کو واپس ہو گیا۔ خسرو کی کسی جگہ بھی مزاحمت نہیں ہوئی۔

مورخ برنی لکھتا ہے :-

"خسرو کو جنوبی ممالک پر چڑھائی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی ۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر ہی راجہ فرار ہو گیا ۔ مسلمانوں نے دو شہروں پر قبضہ کر لیا ۔ جہاں ان کو دو سو ہاتھی مال غنیمت میں ملے ۔"

خسرو ملیبار ہی میں تھا کہ بارشوں کا موسم شروع ہو گیا ۔ جس کی وجہ سے اسکو ایک سال تک جنوب میں ٹھہرنا پڑا ۔

مسلمانوں کے خلاف سازش

انگریزی مورخ الیٹ لکھتا ہے :-

"خسرو نے یہیں یعنے جنوبی ہند میں اپنی وہ اسکیم تیار کی جس کے ذریعہ وہ دہلی کے تخت پر قابض ہونا چاہتا تھا ۔"

برنی لکھتا ہے :-

"خسرو ایک پنچ ذات کا نو مسلم ہندو غلام تھا ۔ جس کو اوائل عمر ہی میں مبارک نے خرید کر لیا تھا ۔ مبارک کی محفلوں میں خسرو ساقی گری کرتا تھا ۔ مبارک اس پر عاشق تھا اور بغیر اس کے مبارک کو چین نہیں آتا تھا ۔"

خسرو نے جنوب کے ہندوؤں کے مشورہ سے دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی تجویزیں شروع کیں ۔ اس تجویز کی اطلاع ایک مسلمان تاجر تقی خاں کو مل گئی ۔ جس کو خسرو نے پکڑ کر قتل کروا دیا ۔ (برنی)

جب یہ خبر دہلی میں پہونچی تو امرائے دہلی خسرو کے خلاف ہو گئے۔ لیکن مبارک شاہ کے عشق نے خسرو کو نہ صرف بچا لیا۔ بلکہ اس کے اعزاز کو بڑھا کر اس کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ لیکن خسرو اپنی تجویز سے غافل نہیں تھا۔ اس نے دہلی میں بھی سازش شروع کر دی۔ قاضی خاں صدر جہاں نے بادشاہ کو اس فتنۂ خوابیدہ سے آگاہ بھی کیا۔ مگر اس کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر وہی ہوا جس کا کہ اندیشہ تھا۔ خسرو نے ایک روز موقع پا کر مبارک کو قتل کر دیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ لیکن امراء اس کے خلاف ہو گئے۔ تخت نشینی سے دو ماہ کے بعد خسرو کو قتل کر دیا گیا۔ اور خاندان تغلق کا پہلا بادشاہ غیاث الدین تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا۔

سدرن انڈیا انڈر محامڈن انویڈرس کا مصنف لکھتا ہے :۔

"مورخین کا خیال ہے کہ خسرو نے یہ سازش ہندوستان میں دوبارہ ہندو سلطنت قایم کرنے کیلئے کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ تمام مسلمان امراء اسکے خلاف ہوگئے تھے" (صفحہ ۱۴)

جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ خسرو ہی کی رہین منت ہے۔ خسرو ہی نے جنوب کے ہندوؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی ایک زبردست سلطنت قایم کریں۔ جو مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال دے۔ اس کی تجویز بظاہر یہ تھی۔ کہ وہ شمال میں دہلی کے تخت پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو ملک سے باہر کرے۔ اور اسی وقت جنوب کے ہندو بھی اشتراک عمل کر کے مسلمانوں سے بغاوت کریں۔

خسرو کا دہلی میں خاتمہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے جنوب کے ہندوؤں کی ان تمام توقعات کا بظاہر خاتمہ ہو گیا۔ لیکن وہ ان تجاویز سے غافل نہیں رہے جو خسرو نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے متعلق ان کے دماغوں پر نقش کر گیا تھا۔ آئندہ صفحات بتائیں گے کہ ہندو

اپنی تجاویز میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور ہندوستان سے اسلامی سلطنتوں کے نیست و نابود کرنے میں انہوں نے کس قدر سرگرمی اور جد و جہد سے کام لیا۔

مسلمانوں کا دکن پر پانچواں حملہ

مبارک کے قتل اور خسرو کی تخت نشینی کی خبر جب دکن میں پہونچی تو ورنگل کے راجہ پرتاب رودرا دیو نے ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جو اس نے مبارک کے حوالے کر دئے تھے۔ اس کی یہ کارروائی اس اسکیم کے ماتحت تھی جو خسرو نے مسلمانوں کے خلاف تجویز کی تھی۔ لیکن خسرو کے قتل اور غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی نے واقعات کو پلٹ کر رکھدیا۔ غیاث الدین تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی دکن کے معاملات پر توجہ کی اور اپنے بیٹے محمد کو دکن میں بھیجدیا۔

۱۳۲۱ء میں محمد تغلق نے دکن پہونچ کر ورنگل کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن کے بعد پرتاب رودرا دیو کو اضلاع سے مدد پہونچی۔ تو اس نے قلعہ سے باہر نکلکر تغلق کا مقابلہ کیا۔ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ اور اس نے قلعہ بند ہو کر صلح چاہی۔ محمد تغلق نے کہلا بھیجا کہ بغیر کسی شرط کے ورنگل حوالے کر دیا جائے۔ راجہ کے انکار کرنے پر شہر کا دوبارہ سختی سے محاصرہ کر لیا گیا۔ لیکن چند دن کے بعد خود تغلق کو محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ کیونکہ اس تمام عرصہ میں جب وہ ورنگل کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ دہلی سے اس کو اپنے باپ کی جانب سے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اس سے وہ گھبرا گیا کہ کہیں پائے تخت میں پھر انقلاب نہ ہوا ہو۔ امرائے دہلی جو ساتھ تھے وہ بھی جنگ کی طویل صعوبتوں سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے اس موقع پر مشہور کر دیا کہ دہلی میں غیاث الدین تغلق کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور ایک سازش

یہ بھی کی گئی کہ ان امراء کو جو خلجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سمجھا دیا گیا کہ محمد تغلق ان کے قتل کے درپے ہے۔ سازش کامیاب ہوگئی۔ خلجی امرا اپنی اپنی فوجوں کو لیکر چلے گئے۔ اب صرف وہ فوج باقی رہ گئی جو براہِ راست تغلق کے ماتحت تھی۔ یہ دیکھکر محمد تغلق محاصرہ اٹھا کر دیوگیری کو واپس ہوا۔ ورنگل کی ہندو فوج نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور راستہ بھر مسلمانوں کو پریشان کرتی رہی۔ ان کا سامان رسد لوٹ لیا گیا۔ اسلامی فوج کے دو تین امیر مارے گئے۔ ہندوؤں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے محمد تغلق کو مرعوب کرنے کیلئے جو مسلمان سپاہی بھی ان کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ ان کے ناک کان کاٹ کر واپس بھیجدیتے تھے۔ ہندوؤں کی چیرہ دستی یہاں تک بڑھگئی کہ انہوں نے دیوگیری کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن محمد تغلق نہایت استقلال سے دیوگیری میں بیٹھا رہا۔ دیوگیری واپس آنے کے چار ماہ بعد دہلی سے نئی فوج پہونچی اور ساتھ ہی بادشاہ کا حکم لائی کہ ورنگل پر دوبارہ چڑھائی کی جائے۔ وہ امراء جو چلے گئے تھے۔ پھر آکر شامل ہوئے۔ یہ دیکھ کر ہندو پیچھے ہٹ گئے ۱۳۲۳ء میں محمد تغلق نے ورنگل پر دوسری دفعہ چڑھائی کی۔ اور مسلمان ایک سخت جنگ کے بعد فصیل شہر پر قابض ہوگئے۔ پرتاپ رودر دیوا اسکی رانیاں، بچے اور تمام امراء کو قید کرکے دہلی بھیجدیا گیا۔ لیکن سلطان غیاث الدین نے پھر اس کو اس کی سلطنت واپس دیکر ورنگل کو واپس بھیجدیا۔ جہاں یہ اپنی وفات تک وفادار رہا۔

مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے سفرنامۂ ابن بطوطہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔

"۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جونا خان عرف الغ خان کو ورنگل فتح کرنے بھیجا۔ قلعہ فتح ہونے کو تھا کہ کسی نے افواہ اڑادی کہ بادشاہ مرگیا۔ قلعہ والوں کو بھی یہ خبر مل گئی۔ انہوں نے محاصرین پر حملہ کیا۔۔۔ اور وہ

واپس ہوئے۔ لیکن ۱۳۲۳ء میں پھر الغ خاں نے ورنگل پر چڑھائی کی۔ راجہ پرتاب رورادیو کو پکڑ کر جونا خاں دہلی بھیجا۔ اس کا بیٹا شنکر تھوڑے علاقہ پر حاکم رہا۔"

اس فتح کے بعد محمد تغلق دہلی کو واپس ہوا۔ اور اس کے دوسرے سال یعنی ۱۳۲۴ء میں باپ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا تیسرا حملہ

محمد تغلق کے تخت نشین ہوتے ہی دکن میں اس کے چچیرے بھائی بہاؤالدین گرشتاسپ نے باغی ہو کر خودمختاری کا اعلان کیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں کو فوج دیکر اس کے مقابلہ کو بھیجا۔ بہاؤالدین کو شکست ہوی اور وہ فرار ہو کر کمپیلا (جو اناگندی کے بالکل قریب ہے) میں پناہ لی۔ خواجہ جہاں نے اناگندی کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن راجہ نے بہاؤالدین کو جنوب میں دوارسمندرم کے راجہ کے پاس بھیجدیا۔ اور قلعہ سے نکلکر خواجہ جہاں کے مقابلہ میں صف آرا ہوا۔ اس جنگ میں راجہ اور اس کے تمام سپاہی مارے گئے۔ خواجہ جہاں نے اناگندی پر قبضہ کرلیا۔ اور راجہ کے گیارہ بیٹے اور باقی امراء کو قید کرکے دہلی بھیجدیا۔ جہاں انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

(نوٹ:۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اس نے کمپیلا کے راجہ کے تین لڑکوں کو دہلی میں دیکھا۔ ان کے نام "ناصر۔ بختیار اور مہر وار تھے۔)

خواجہ جہاں یہاں سے دوارسمندرم پر بڑھا۔ یہاں ایک خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں

نے شہر پر قبضہ کرکے اس کو کامل طور پر تباہ کر دیا۔ راجہ بلالا سوم نے ٹنور (ضلع میسور) میں پناہ لی۔ اور بہاؤالدین کو خواجہ جہاں کے حوالہ کر دیا۔ یہاں سے مسلمان جنوب کی طرف بڑھے۔ اور ملیبار و مدورا پر ۱۳۲۸ء میں قبضہ کر لیا۔ اور ان کو سلطنت دہلی کے صوبے بنا کر صوبہ داریاں قایم کیں۔

اس طرح تمام جنوبی ہند پر پھر ایک بار دہلی کی سیادت و بالا دستی تسلیم کر لی گئی۔ اسی لئے مورخین نے لکھا ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اس قدر وسعت حاصل کی تھی کہ کسی دوسرے مسلمان بادشاہ کو اتنی بڑی سلطنت نہیں ملی۔

شہنشاہ محمد تغلق

جب کل ہندوستان میں ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک سلطان محمد تغلق کی شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی تو اس نے مفاد سلطنت کا لحاظ کرتے ہوے پائے تخت کو دہلی سے دولت آباد (دیوگیری) بدلنا چاہا۔

گو مورخین بعد میں آنے والے واقعات کے لحاظ سے سلطان محمد تغلق کو پائے تخت کے بدلنے پر ہزار الزام دیں۔ لیکن سلطان نے دولت آباد کو اس لئے دہلی پر ترجیح دی کہ یہ شہر ہندوستان کے وسط میں تھا۔ پایۂ تخت بدلنے کے بعد جو ناگوار واقعات پیش آئے۔ وہ اگر وقوع پذیر نہ ہوتے تو شاید ملکی مفاد کے لحاظ سے اس سے بہتر انتخاب ناممکن تھا۔ محمد تغلق کے امراء اگر باغی نہ ہوتے اور اس کی یہ تجویز کامیاب ہو جاتی تو تمام جنوبی ہند کا نقشہ ہی بدل جاتا اور شاید مورخین اس وقت لکھتے کہ محمد تغلق جیسا تجربہ کار اور مدبر بادشاہ

ہندوستان میں اور کوئی نہیں ہوا۔ لیکن قدرت مسلمانوں کے لئے عبرت اور ہندوؤں کے لئے ایک اور مہلت دینا چاہتی تھی۔ اسی لئے تغلق کے عیش پسند امراء نے بغاوت کی اور جنوب میں ہندوؤں کو ایک نئی زبردست سلطنت قایم کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ جو آئندہ حملہ آور مسلمانوں کے راستے میں تین سو سال تک آہنی دیوار بنی رہی۔

محمد تغلق یہ دیکھ چکا تھا کہ علاؤالدین مبارک خلجی اور خود اسکے باپ غیاث الدین تغلق کے عہد میں دکن اور جنوبی ہند کی ہندو سلطنتیں کس طرح بار بار مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ان سے بڑھکر خاص اسکے چچیرے بھائی بہاؤالدین کی بغاوت جنوب میں اور ہندو سلطنتوں کا اس کو پناہ دینا غالباً بادشاہ کو اس فیصلہ کے لئے آمادہ کیا کہ پایۂ تخت دہلی کی بجائے دولت آباد (دیوگیری) میں قایم کیا جائے۔ لیکن امراء جو دہلی کی رہائش سے مانوس ہو چکے تھے۔ انہیں دیوگیری پسند نہ آیا۔ اور سازشیں ہونی شروع ہوئیں۔ بہاؤالدین کے قتل سے بھی (جس کا سر ابن بطوطہ نے ملتان میں ۱۳۳۳ء میں دیکھا تھا) امرا مشتعل تھے۔ سب سے پہلی بغاوت سندھ میں کشلو خاں نے کی۔ اس کے بعد ہی جنوب میں مدورا کے حاکم جلال الدین احسن اور ملیبار کے حاکم سید حسن نے ۱۳۳۶ء میں بغاوت کی۔ بادشاہ جنوب کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن بیدر کے قریب پہنچکر بیمار ہوگیا۔ اس عرصہ میں ملتان کے گورنر کی بغاوت کی خبر پہونچی۔ بادشاہ بیدر سے واپس ہوگیا۔ بیدر سے واپس ہوکر محمد تغلق کو پھر جنوب میں آنا نصیب نہیں ہوا۔ شہنشاہ کے بیدر سے واپس ہوتے ہی دکن کے مسلمان امرا نے بھی بغاوت کردی۔ اور ایک عرصہ تک آپس کی خانہ جنگی کے بعد متحد ہوکر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی

مسلمانوں کی اس خانہ جنگی اور خصوصاً دکن کے مسلمان امرا کی شہنشاہ سے بغاوت

مقدس فرض کو ادا کر کے ۱۴ ذی قعدہ ۷۱۰ھ میں اسلامی فوج واپس ہوئی۔ بیر دہول کے تمام منادر تباہ کر دئیے گئے۔ (بیر دہول سے مراد مملکت مدورا ہے) اور مال غنیمت شاہی خزانہ میں داخل کیا گیا۔

پانچ دن کے بعد پنجشنبہ ۱۳ ذی قعدہ کے دن اسلامی فوج بیر دہول سے نکلکر ۱۷ ذی قعدہ کو کھام بن اور اس کے پانچ دن بعد مدورا میں پہونچی۔ جہاں سندرا پانڈے کا بھائی ویرا پانڈے رہتا تھا۔ شہر خالی تھا۔ راجہ اپنی رانیوں کو لیکر فرار ہو چکا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو جگنار کے مندر میں دو ہاتھی ملے۔ مندر جلا دیا گیا۔ یہاں سے اسلامی فوج معبر پر بڑھی کہ لنکا کے ساحل پر پہونچ کر دین حق کو یہاں تک پہونچا یا جائے۔ اس جگہ ایک برہمن پانڈے گرو حکومت کرتا تھا۔ اس کے قبضہ میں بہت سے شہر تھے۔ اس کا پائے تخت فتّان تھا۔ جہاں ایک مرصع بت تھا۔

(سدرن انڈیا انڈ ہر محاڈن انویڈرس صفحہ ۹۷، ۹۸، ۹۹)

امیر خسرو کے اس بیان سے اگر ان کتبوں کا موازنہ کیا جائے۔ جو مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے حال میں دستیاب کئے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کافور دوار سمندرم سے نکلکر بانا وار واپس ہوا۔ اور اس سڑک پر ہولیا جو ٹمکور پر سے ہسور کو جاتی ہے۔ امیر خسرو نے لکھا ہے کہ پانچ دن بعد ملک کافور ان پہاڑیوں پر پہونچا جو میسور کو کرناٹک سے جدا کرتے ہیں۔ غالبًا یہ مقام موجودہ ہسور ہے۔ اس لئے کافور پہلے بیدسے بانا وار، باناوار سے یکنا یک ہلی، یہاں سے ٹکور اور ٹمکور سے بنگلور ہو کر ہسور پہونچا۔ اگر ہم پہلے بیدسے کورومنڈل کا دوسرا راستہ اختیار کریں جو میسور سے ہوتا ہوا ستی منگل کے پاس پہاڑوں کو عبور کر کے ضلع کوئمٹور

ہیں داخل ہوتا ہے۔ تو یہ مسافت پانچ دن میں طے نہیں ہوسکتی۔ اور اس راستہ میں امیر
خسرو کے بیان کردہ پہاڑی درّے تبار اور سرّمی بھی نہیں ملتے۔ ہاں میسل گری نامی ایک
درہ ملتا ہے۔ لیکن تلفظ بالکل جدا ہے۔ اس لئے ہستور پہونچ کر اس نے اس مشہور درے
کو عبور کیا۔ جس کو آج بھی درّۂ توپار (.Topar Pass) کہا جاتا ہے (اسی درّۂ
توپار کو امیر خسرو نے تبار لکھا ہے) اور جو ہسور سے قریب ہے۔ اس درہ سے پار ہوکر کافور
نے دریائے کاویری کے کنارے قیام کیا (اسی دریا کو امیر خسرو نے کنوباری لکھا ہے۔)
یہاں سے معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی فوج کس جگہ سے دریا پار ہوی۔ لیکن چونکہ خسرو نے منزل
مقصود بیر دہول بتلایا ہے۔ اور کہیں دریا کو دوبارہ عبور کرنے کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے
یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ اسلامی فوج دریا کے کنارے کنارے چل کر کندور اور سری
رنگم پہونچی اور یہیں دریا کو عبور کیا۔ ملک میں جس قتل وغارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ تمام
اسی نواح میں ہوی تھی (مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے کتبوں کی مدد سے اس راستہ کا
ایک نقشہ تیار کیا ہے۔ جس کو صفحہ ۸۳ پر کتاب سدرن انڈیا سے یہاں دیا جاتا ہے)
(نوٹ :- کندور سے مراد کنڈناپور (یعنے موجودہ "کنانور" ہے) جو سری رنگم کے قریب ہے۔ اور
بیر دہول سے مراد "دیواپٹن" ہے یا عام معنی میں تمام مملکت مدورا)

خسرو نے اس کے بعد "برہمت پوری" کے مندر اور طلائی بتوں کا ذکر کرتے ہوئے
اس کو بہشت شداد کا نام دیا ہے۔ اس لئے اس میں کچھ بھی شک نہیں رہتا۔ کہ یہ مندر "سری رنگم"
کا مشہور مندر ہے۔ اور یہاں اس زمانے کا ایک کتبہ بھی دستیاب ہوا ہے جس میں لکھا ہے
کہ مسلمانوں نے یہاں کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ دوسرا شہر جو اس نواح میں مندروں کے لئے
مشہور ہے۔ وہ "چدمبرم" ہے۔ اور یہاں بھی آثار بتلا رہے ہیں کہ یہاں کے بت بھی اس

اوران کی آپس کی نا اتفاقی نے جنوب کے ہندوؤں کے لئے خود بخود ایک نادر موقع فراہم کر دیا۔ اس سے بہتر موقع انہیں مل بھی نہیں سکتا تھا۔ گو خسرو زندہ نہیں تھا اور وہ اپنی تجویز میں (کہ مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا جائے) کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی تجویز جنوب میں برابر کام کرتی رہی۔ ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ جب تک ان میں اتحاد نہ ہوگا۔ وہ اپنی تجویز میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے انہوں نے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"اسی وقت کشنا نایک پسر لدر دیو نواحی ورنگل میں رہتا تھا۔ جریدہ بلال دیو کے پاس جو رائے عظیم الشان کرناٹک کا تھا جا کر کہا کہ مسلمان لوگ دیار تلنگ اور کرناٹک میں داخل ہوتے اور عزیمت رکھتے ہیں۔ کہ ہمیں ایک بار مستاصل کریں۔ اس بارے میں ایک فکر کرنا چاہیئے۔ بلال دیو نے جمیع اعیان مملکت کو حاضر کر کے مشورہ کیا۔ اور بعد تفکر اور امعان نظر کر کے قرار پایا کہ بلال دیو جمیع ممالک اپنے کو عقب چھوڑ کر خود سرحد راہِ سپاہ اسلام میں تخت گاہ بناوے اور معبر اور دہور سمند اور کنبیلہ کو مسلمانوں کے تصرف سے برآوردہ کرے۔ اور کرشنا نایک صرف ہمت کر کے ورنگل کو بھی کہ اس ایام میں فرصت ہے۔ حوزہ دیوان دہلی سے برآوردہ کرے۔ اور بلال دیو۔۔۔ کوہستان اپنی سرحد کی جائے صعب میں ایک شہر بنام اپنے فرزند بیجن رائے کے بنا کیا۔ کہ مشہور بیجن نگر ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے بیجا نگر ہوا۔"

(ترجمہ فرشتہ اردو مطبوعہ نولکشور)

فرشتہ نے ورنگل کے راجہ لدر دیو کو اس اتحاد کا بانی بتایا ہے۔ لیکن جنوبی ہند کی

تاریخ اور کیتے اس کا سہرا بلال دیوسوم کے سر باندھتے ہیں۔ اور اب تک جس قدر لٹریچر اس موضوع پر مدراس۔ میسور۔ بنگلور اور دھاڑواڑ میں شایع ہو چکا ہے۔ وہ بلال دیوسوم کو ہی اس اتحاد کا بانی بتاتا ہے۔

لیکن مورخ بھٹا چاریہ لکھتا ہے:۔

"ہندو مذہب، ہندو کلچر، ہندو تہذیب و تمدن اور خود ہندو کی ہستی خطرے میں ہے۔ یہ وہ الفاظ تھے جو سرینگری کے مشہور تیرتھ کے جگت گرو مہادیو یا کی زبان سے نکلے۔ اور تمام جنوبی ہند میں گونج گئے"

حقیقت بھی یہی تھی۔ کہ مسلمانوں کے پے در پے حملوں نے جنوبی ہند کو اس قدر غیر محفوظ بنا دیا تھا کہ اگر یہ اتحاد نہ ہوتا تو جنوبی ہند کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ جگت گرو کی آواز پر ہر ہندو ریاست، ہر مندر، اور ہر ہندو کے گھر سے مال وزر کی ایک گنگا بہہ نکلی۔ جو کہ ایک نئی سلطنت کے قایم کرنے میں کام آئی۔ سرینگری۔ سری رنگم اور تریپتی کے مشہور تیرتھوں کے خزانے بھی اس کام کیلئے وقف ہو گئے۔ ہندوؤں کے اس اتحاد کا سہرا چاہے ورنگل کے سر ہو یا دوار سمندرم کے راجہ بلالا سوم کے سر۔ لیکن اسقدر تو یقینی امر ہے کہ انہوں نے اس اتحاد کی بنیاد خالص مذہب پر رکھی۔ اور شاید جب تک مذہب کی سیادت نہ ہوتی تو یہ تحریک کامیاب بھی نہ ہو سکتی تھی (سرینگری ملک میسور میں جنوبی ہند کا ایک مشہور و مقدس تیرتھ ہے اور اس کا اثر و اقتدار تمام جنوبی ہند پر چھایا ہوا ہے۔ یہاں کے بڑے گرو نے اپنے مذہبی تقدس واثر سے کام لیکر اس اتحاد کو مضبوط بنایا۔ اور یہ اسی کارروائی کا نتیجہ تھا کہ جنوب کی کل ہندو آبادی اس اتحاد میں شریک ہو گئی۔ یہ کام بالکل خموشی اور رازداری سے کیا گیا۔ اور ایک عرصہ تک شمال یا دکن کے مسلمانوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ ایک نئی طاقت انکے مقابلہ میں ابھر رہی ہے۔

سرینگری (میسور)

دوارسمدرم (موجودہ ہلے بید) مندر

سرینگری (میسور)

دوار سمدرم (موجودہ ہلے بید) مندر
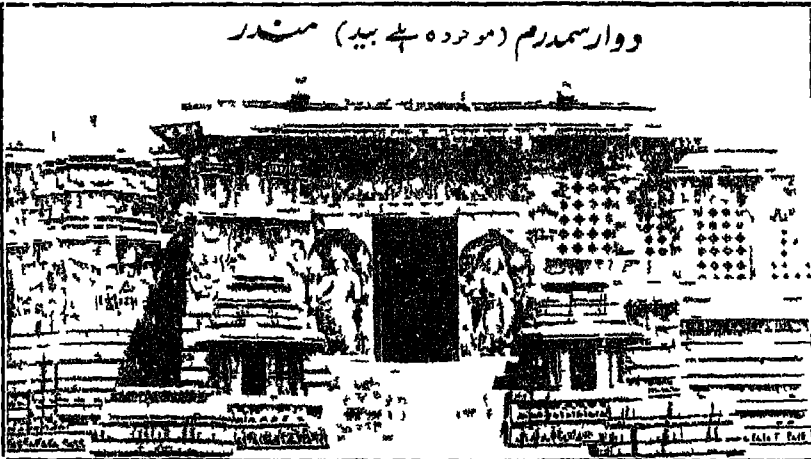
ہندو اتحاد کی اصلی غرض و غایت

جگت گرو مہا دیو یا کے یہ الفاظ (جو گذشتہ باب میں لکھے گئے ہیں)

"ہندو مذہب، ہندو کلچر، ہندو تہذیب و تمدن، اور خود ہندو کی ہستی خطرہ میں ہے"

اپنے اندر جس قدر حقائق رکھتے تھے۔ وہ ایک سرسری نظر سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔

جگت گرو مہا دیو یا نے جس خطرہ کو محسوس کیا وہ مسلمان حملہ آوروں سے نہیں۔ بلکہ ان کے مذہب اور کلچر کی وجہ سے محسوس کیا تھا۔ کیونکہ ان حملہ آوروں کا مذہب (اسلام) ہندو مذہب کا بالکل ضد تھا۔

ہندو مذہب و سوسائٹی کی بنیاد تناسخ، چھوت چھات، ذات و خون اور اعلےٰ و ادنیٰ کے امتیاز پر رکھی گئی تھی۔ بخلاف اس کے اسلام ان اصولوں کا مخالف اور مساوات کا حامی تھا۔

کل ہندوستان پر قبضہ پانے کے بعد برہمنوں نے ہندو مذہب کے لئے مدافعانہ پالیسی اختیار کر لی تھی۔ کہ چھوت چھات، ذات و خون اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز باقی رہے۔ اس کے خلاف اسلام جارحانہ پالیسی کو اپنے ساتھ لایا کہ تبلیغ کے ذریعہ اپنے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کرے۔

یہی وہ اسلام کے اصول تھے جن سے جگت گرو مہا دیو یا نے ہندو مذہب کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ یہاں ہندو مذہب سے مراد برہمن اور اعلےٰ ذات کے ہندو ہیں۔ یہ لوگ

کسی حالت میں بھی اپنے اقتدار سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اور نہ یہ اقتدار ان سے کوئی چھین سکتا تھا۔

یہ تو ان ہندوؤں کو معلوم تھا کہ مسلمان بھی بہ جبر ان کے اس اقتدار کو نہیں چھینیں گے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مسلمان جس مذہب کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے اصول ہر پہلو سے ہندو اصول کے مخالف تھے۔ مقابلہ شخصیتوں کے درمیان نہیں۔ بلکہ مذہب اور مذہب! کلچر اور کلچر کے درمیان تھا۔ اور اسی مقابلہ کے لئے جگت گرو مہادیویا نے ہندوؤں کو تیار کیا اور سلطنت وجیانگر کی بنیاد رکھی گئی۔

کہا جائیگا کہ محمد تغلق اور ملک کافور کے حملوں سے صدہا سال پیشتر سے بھی مسلمان اس ملک میں آباد تھے۔ یعنے اوائل اسلام ہی سے مسلمان تاجروں کی آمد و رفت اس ملک میں شروع ہوگئی تھی۔ اور ہندوؤں نے ان سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ لیکن ان مسلمانوں کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ صرف تجارت کے لئے آئے تھے اور بہ حیثیت رعایا کے رہتے تھے۔ اس لئے انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اگر ان مسلمانوں نے یہاں شادیاں کیں یا انہیں دیکھکر چند لوگ مسلمان ہوگئے تھے تو انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر شہنشاہ محمد تغلق کے حملے نے مسلمانوں کو اب ایک سیاسی اہمیت دیدی تھی۔ مسلمان رعایا نہیں بلکہ ملک کے حاکم بن گئے تھے۔ انکی شخصیت بہ حیثیت حکمران قوم ہونے کے اب کچھ اور ہوگئی تھی۔ اور یہ لازمی بات تھی کہ ان سے دوسری قومیں اثر پذیر ہوتیں۔

اسلام کے اصول، مساوات اور تبلیغ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے خوفزدہ ہوکر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اتحاد کی تحریک کی اور سلطنت وجیانگر کی بنیاد رکھی۔

بہمنی سلطنت

محمد تغلق سے اس کے مسلمان امراء کی بغاوت اسلامی تاریخی نقطۂ نظر سے حد درجہ افسوسناک ہے۔ مسلمانوں کی قوت اس بغاوت کی وجہ سے منتشر ہو کر رہ گئی۔ اور پھر ان کو سنبھلنے تک عرصہ لگ گیا۔ اور یہی وہ عرصۂ مہلت ہے جس سے جنوب کے ہندوؤں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور جس وقت مسلمانوں نے اپنے اندرونی معاملات سے فارغ ہو کر جنوب کی طرف نظر اٹھائی تو ان کے مقابل ایک زبردست سلطنت قایم ہو چکی تھی۔ جو نہ صرف مسلمانوں کے حملوں کا جواب دے سکتی تھی۔ بلکہ مسلمانوں کی باہمی آویزش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر چاہتی تو بڑھکر دکن میں مسلمانوں کا خاتمہ بھی کر سکتی تھی۔ یہ دکن کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے اندرونی تنازعات ختم ہونے کے بعد ان کی جو سلطنت قایم ہوی۔ وہ ہر حیثیت سے جنوب کی ہندو سلطنت کے مدِ مقابل تھی۔ ورنہ ان کا خاتمہ اسی وقت نہ ہوتا تو چند سال بعد یقینی تھا۔ چاہے اس کو ہندوؤں کی غلطی سے تعبیر کیا جائے یا فرزانگی سے۔ انہوں نے بھی اپنی تمام جدوجہد کو دریائے کرشنا سے نیچے صرف جنوبی ہند میں محدود رکھا۔ ممکن تھا کہ اگر وہ دریائے کرشنا سے آگے بڑھکر دکن کے معاملات میں دخل دیتے تو مسلمانانِ دکن مشکلات میں گرفتار ہو جاتے۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس دخل دہی سے خود ہندوؤں کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوتی جو انہوں نے جنوبی ہندوستان میں حاصل کی۔

تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ دکن کے مسلمانوں کے معاملات میں دخل نہ دیکر وہ خاموشی سے اپنی قوت بڑھانا چاہتے

تھے. جس وقت انہیں یہ قوت حاصل ہو چکی تو انہوں نے دکن کی طرف نظر اٹھائی. لیکن اسوقت تک مسلمان بھی اپنی خانہ جنگی کو ختم کرکے ایک نئی زبردست سلطنت قایم کر چکے تھے، جس کو تاریخ میں بہمنی سلطنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے. اس سلطنت کا بانی ظفر خاں تھا. جس نے تخت نشین ہونے پر علاؤالدین کانگو بہمنی کا خطاب اختیار کیا. اس سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ تھا. اور جنوب میں ہندوؤں نے جو سلطنت قایم کی تھی. اس کا نام سلطنت وجیانگر تھا. (ظفر خان کا دوسرا نام تاریخوں میں حسن لکھا ہوا ہے)

(نوٹ:- بہمنی کے نام پر اکثر مورخین کو دہوکہ ہوا ہے وہ لکھتے ہیں :- حسن بچپن میں ایک برہمن کے ہاں ملازم تھا. اس برہمن نے پیش گوئی کی تھی کہ بڑا ہونے پر وہ کسی دن بادشاہ ہوگا. حسن جب بادشاہ ہوا تو اس کو وہ بات یاد آئی اور اس نے شکرگذاری کے طور پر اپنے نام کے ساتھ بہمنی کا اضافہ کیا اور اس کا خاندان اسی نام سے مشہور ہوا.)

یہ امر ابھی تک مشتبہ ہے کہ آیا حسن کسی برہمن کے پاس ملازم تھا یا نہیں. اور گنگو سے مراد کیا ہے. ممکن ہے کہ حسن کسی برہمن کے پاس ملازم رہا ہو. اور اس برہمن کا نام گنگو ہو. لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ اس نے صرف اس برہمن کے خیال سے اپنے خاندان کو بہمنی کا نام دیا تھا. حسن دراصل ایرانی النسل اور تاریخ ایران کے مشہور ہیرو بہمن اسفندیار کی اولاد سے تھا. اسی لئے اس کا خاندان بھی بہمنی کہلایا.

ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال کے جرنل مورخہ ۱۹۰۴ء میں اس کے متعلق ایک مضمون چھپ چکا ہے. اور اس میں بھی یہی لکھا ہے کہ حسن ایران کے سپہ سالار بہمن اسفندیار کی اولاد سے تھا. اور یوں بھی دیکھا جائے تو صحیح لفظ برہمن ہے بہمن نہیں. اگر حسن اپنے خاندان کو برہمن کے لحاظ سے نام دینا چاہتا تو وہ نام برہمنی ہوتا نہ کہ بہمنی.

مسلمانوں کی بہمنی سلطنت اور ہندوؤں کی وجیانگر سلطنت اپنی مدۃ العمر تک ایک دوسرے کی رقیب رہی ہیں۔ اس لئے تاریخی واقعات کو سمجھنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ چند ایسے شجرے دئے جائیں۔ جن سے بآسانی یہ معلوم ہو کہ ایک دوسرے کا ہم عصر کون تھا

(پہلا شجرہ :- سلاطین بہمنی کے نام اور انکی مدت حکومت

دوسرا شجرہ :- شجرۂ خاندان عادل شاہی " "

تیسرا شجرہ :- شجرۂ خاندان قطب شاہی " "

چوتھا شجرہ :- خاندان نظام شاہی " "

پانچواں شجرہ :- راجگان وجیانگر " "

چھٹواں شجرہ :- سلاطین ہم عہد " "

(نوٹ :- بہمنی خاندان کے زوال پر دکن میں مسلمانوں کی دوسری پانچ سلطنتیں قایم ہوگئیں یعنے بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار۔ ان پانچ سلطنتوں میں اول الذکر تین سلطنتوں کو راجگان وجیانگر سے واسطہ رہا ہے۔ اس لئے ان تینوں سلطنتوں کے سلاطین کے شجرے بھی دئے گئے ہیں۔)

شجرۂ سلاطین خاندان بہمنیہ

(پائے تخت گلبرگہ)

نام	سے	تک
علاؤالدین حسن کانگو (ظفرخان)	۱۳۴۷ء سے	۱۳۵۸ء تک
محمد شاہ اول	۱۳۵۸ "	۱۳۷۵ "
مجاہد شاہ	۱۳۷۵ "	۱۳۷۸ "
داؤد شاہ	۱۳۷۸	
محمود شاہ	۱۳۷۸ "	۱۳۹۷ "
غیاث الدین	۱۳۹۷	
شمس الدین	۱۳۹۷	
فیروز شاہ	۱۳۹۷ "	۱۴۲۲ "
احمد شاہ ولی اول	۱۴۲۲ "	۱۴۳۵ "
علاؤالدین احمد ثانی	۱۴۳۵ "	۱۴۵۸ "
ہمایوں شاہ ظالم	۱۴۵۸ "	۱۴۶۱ "
نظام شاہ	۱۴۶۱ "	۱۴۶۳ "
محمد شاہ لشکری ثانی	۱۴۶۳ "	۱۴۸۲ "
محمود شاہ ثانی	۱۴۸۲ "	۱۵۱۸ "
احمد شاہ ثانی	۱۵۱۸ "	۱۵۲۱ "
علاؤالدین سوم	۱۵۲۱	
ولی اللہ شاہ	۱۵۲۱ "	۱۵۲۳ "
کلیم اللہ شاہ	۱۵۲۳ "	۱۵۲۹ "

(احمد شاہ ثانی کے بعد جو تین بادشاہ ہوئے ہیں وہ برائے نام تھے۔)

شجرۂ خاندان عادل شاہی

پائے تخت بیجاپور

یوسف عادل شاہ	۱۴۸۹ء	سے	۱۵۱۰ء تک	
اسماعیل عادل شاہ	۱۵۱۰	"	۱۵۳۴	"
ملو عادل شاہ	۱۵۳۴	"	۱۵۳۵	"
ابراہیم عادل شاہ اول	۱۵۳۵	"	۱۵۵۷	"
علی عادل شاہ اول	۱۵۵۷	"	۱۵۸۰	"
ابراہیم عادل شاہ ثانی	۱۵۸۰	"	۱۶۲۷	"
محمد عادل شاہ	۱۶۲۷	"	۱۶۵۶	"
علی عادل شاہ ثانی	۱۶۵۶	"	۱۶۷۲	"
سکندر عادل شاہ	۱۶۷۲	"	۱۶۸۶	"

۱۶۸۶ء میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے بیجاپور پر قبضہ کرلیکر خاندان عادل شاہی کا خاتمہ کر دیا۔

شجرۂ خاندانِ قطب شاہی

پائے تخت گولکنڈہ

قلی قطب شاہ	۱۵۱۲ء	سے	۱۵۴۳ء تک
جمشید قطب شاہ	۱۵۴۳	سے	۱۵۵۰ "
سبحان قلی قطب شاہ	۱۵۵۰		
ابراہیم قلی قطب شاہ	۱۵۵۰	سے	۱۵۸۰ "
محمد قلی قطب شاہ	۱۵۸۰	"	۱۶۱۲ "
محمد قطب شاہ	۱۶۱۲	"	۱۶۲۶ "
عبداللہ قطب شاہ	۱۶۲۶	"	۱۶۷۲ "
ابوالحسن تانا شاہ	۱۶۷۲	"	۱۶۸۷ "

۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر قبضہ کرکے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

شجرۂ خاندانِ نظام شاہی

(پایۂ تخت احمد نگر)

احمد نظام شاہ	۱۴۹۰ء	سے	۱۵۱۸ء	تک
برہان نظام شاہ اول	۱۵۱۸	"	۱۵۵۴	"
حسین نظام شاہ	۱۵۵۴	"	۱۵۶۵	"
مرتضیٰ نظام شاہ	۱۵۶۵	"	۱۵۸۶	"
میران نظام شاہ	۱۵۸۶	"	۱۵۸۹	"
اسماعیل نظام شاہ ثانی	۱۵۸۹	"	۱۵۹۰	"
برہان نظام شاہ ثانی	۱۵۹۰	"	۱۵۹۴	"
ابراہیم نظام شاہ	۱۵۹۴	"	۱۵۹۵	"
احمد شاہ ابن شاہ طاہر	غاصب - چند ماہ تک قبضہ کر لیا تھا۔			
بہادر نظام شاہ	۱۵۹۵	سے	۱۶۰۳	تک
مرتضیٰ نظام شاہ	۱۶۰۳	"	۱۶۳۰	"
حسین نظام شاہ	۱۶۳۰	"	۱۶۳۳	"

(۱۶۳۳ء میں مغلوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا)

شجرۂ راجگان وجیانگر

سنگما خاندان

(راجگان وجیانگر کا پہلا خاندان)

ہری ہر اول	۱۳۳۶ء	سے	۱۳۴۶ء تک	
بکارایا اول	۱۳۴۶	"	۱۳۷۹	"
ہری ہر دوم	۱۳۷۹	"	۱۴۰۴	"
ویورائے اول	۱۴۰۴	"	۱۴۲۲	"
وجے رایا	۱۴۲۲	"	۱۴۲۴	"
ویورایا دوم	۱۴۲۴	"	۱۴۴۹	"
ملکارجنا	۱۴۴۶	"	۱۴۶۷	"
ویروپکشا	۱۴۶۷	"	۱۴۷۹	"

۱۴۷۹ء سے ۱۴۸۲ء تک ویروپکشا کے دو لڑکوں کو یکے بعد دیگرے تخت نشین کیا گیا۔ لیکن ان کے نا قابل ہونے کی وجہ سے امرا نے نرسمہا کو تخت نشین کیا۔ جو اس وقت فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔

سلوا خاندان

(راجگان وجیانگر کا دوسرا خاندان)

نرسمہا اول	۱۴۷۹ء	سے	۱۴۸۹ء تک	
نرسمہا دوم	۱۴۸۹	سے	۱۴۹۳	"
نرسا نایک۔ ایجنٹ	۱۴۹۳	سے	۱۴۹۷	"

تلوواخاندان

(راجگانِ وجیانگر کا تیسرا خاندان)

نرسانایک	۱۴۹۹ء	سے	۱۵۰۳ء تک
ویرانرسمہا	۱۵۰۳	"	۱۵۰۹	"
کرشنا دیورایا	۱۵۰۹	"	۱۵۳۰	"
اچوت رایا	۱۵۳۰	"	۱۵۴۲	"
سداسیورایا	۱۵۴۲	"	۱۵۶۰	"

(راجہ سداسیورایا برائے نام تھا۔ تمام اختیارات رام راج اور اس کے دو بھائی وینکٹ وری اور ترملا کے ہاتھ میں تھے)

۱۵۶۵ء میں سلطنت وجیانگر کا تالیکوٹہ کی جنگ میں خاتمہ ہوگیا۔ اور ترملا نے سداسیورایا کو لیکر ملگپنڈہ چلا گیا۔ جہاں چار سال بعد اس کو زہر دیکر ختم کردیا اور آپ راجہ بن بیٹھا۔

ترملا کے بعد اور چند راجہ اس کے خاندان میں گذرے ہیں۔ لیکن انکی حیثیت پالیگاروں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے یہاں شجرہ نہیں دیا گیا۔ لیکن کتاب میں ان کا بیان آگیا ہے۔

شجرۂ سلاطین ہم عہد

(سلاطین بہمنیہ، بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ اور راجگان وجیانگر میں ایک دوسرے کا معاصر کون تھا۔)

راجگانِ وجیانگر	شاہانِ دہلی	سلاطینِ بہمنیہ
(۱) خاندان سنگما		
ہری ہر اول	سلطان محمد تغلق	
بکارایا اول	(نوٹ: سلطان محمد تغلق کے بعد شاہان دہلی کا وجیانگر اور جنوبی ہند سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس لئے تاریخ نام حذف کر دیئے گئے ہیں۔)	علاؤالدین حسن گانگو بہمنی۔ محمد شاہ اول۔ مجاہد شاہ بہمنی۔ داؤد شاہ بہمنی۔ محمود شاہ بہمنی
ہری ہر دوم		غیاث الدین بہمنی۔ شمس الدین بہمنی۔ فیروز شاہ بہمنی
دیورایا اول		فیروز شاہ بہمنی
وجے رایا		احمد شاہ اول بہمنی
دیورایا دوم		احمد شاہ بہمنی اول علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی
ملیکارجنا		علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی۔ ہمایوں شاہ بہمنی
		نظام شاہ بہمنی۔ محمد شاہ ثانی بہمنی
ویروپکشا		محمد شاہ ثانی بہمنی

(۲) خاندان سلووا		
نرسمہا اول		محمود شاہ ثانی بہمنی۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور۔ احمد نظام شاہ احمد نگر
نرسمہا دوم		یوسف عادل شاہ بیجاپور۔ احمد نظام شاہ احمد نگر
نرسنا نایک۔ ریجنٹ		(محمود شاہ ثانی کے بعد بہمنی سلطنت بالکل کمزور ہوگئی۔ اور دکن کی دوسری اسلامی سلطنتیں وجیانگر کے مقابلہ میں آگئیں۔ اس لئے بہمنی سلاطین کے نام نظرانداز کئے جاتے ہیں۔ م)

(۳) خاندان تلووا	سلاطین بیجاپور	سلاطین گولکنڈہ	سلاطین احمد نگر
نرسا نایک	یوسف عادل شاہ		احمد نظام شاہ
ویرا نرسمہا	”		”
کرشنا دیورایا	یوسف عادل شاہ۔ اسماعیل عادل شاہ	سلطان قلی قطب شاہ علی برید والی بیدر	احمد نظام شاہ۔ برہان نظام شاہ
اچیوت رایا	اسماعیل عادل۔ ابراہیم عادل شاہ	” ”	برہان نظام شاہ
سدا سیو رایا	ابراہیم عادل شاہ۔ علی عادل شاہ	سلطان قلی قطب شاہ جمشید قطب۔ سبحان قطب ابراہیم قطب	برہان نظام شاہ حسین نظام شاہ علی برید۔ والی بیدر

شہنشاہ محمد بن تغلق سے بغاوت کرنے کے بعد جنوبی ہند اور دکن۔
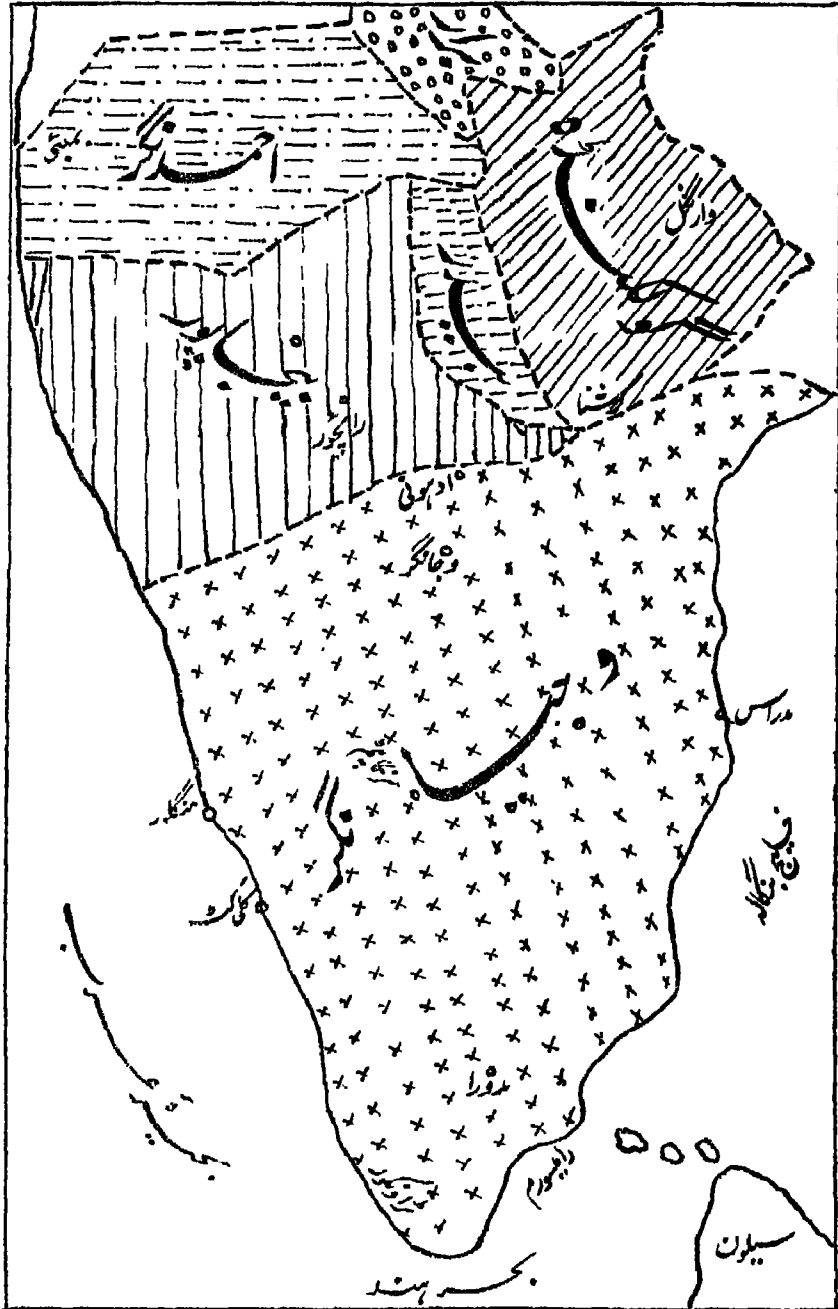
دکن کی پانچ اسلامی سلطنتیں اور ہندو سلطنت وجیانگر

نقشہ جس میں وجیانگر، اناگندی اور کمپیلی کے شہروں کا جائے وقوع دکھلایا گیا ہے۔
اس نقشہ میں "نالیکوٹہ کا میدان جنگ بھی دکھلایا گیا ہے
یہ جنگ بیاپور اور رکساس تگڑی کے میدان میں ہوی جو دریائے کرشنا
سے نیچے ہے
بیجاپور
"نالیکوٹہ
دریائے کرشنا
رائچور
مدگل
بیاپور
رکساس تگڑی
دریائے تنگ بھدرا
اناگندی
کمپیلی
وجیانگر
پلگنڈہ
ویلور
سرنگاپٹم
مدورا
سیلون
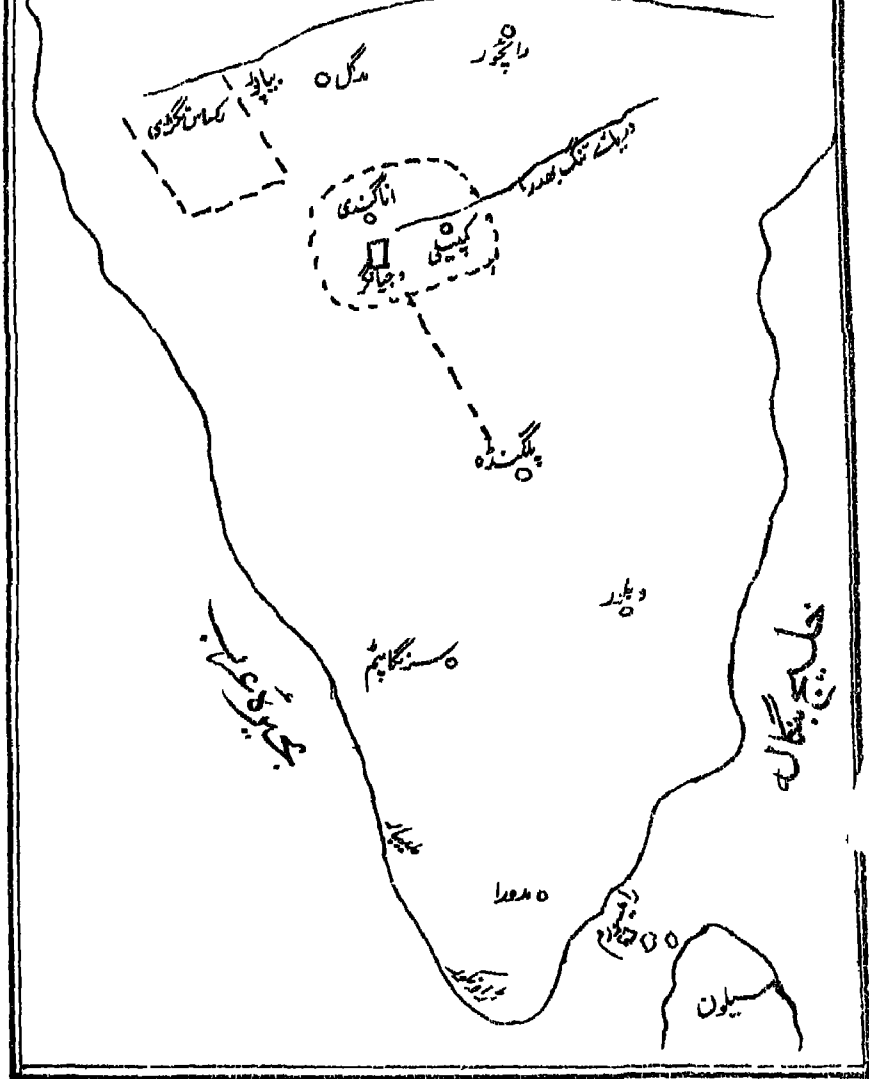
تاریخ وجیانگر

وجیانگر کی بنیاد

سنہ ۱۳۱۰ء کے بعد سے مسلمانوں کے پے در پے حملے جنوب کے ہندوؤں کو خائف کر چکے تھے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ اگر کوئی تدارک نہ کیا گیا تو جس طرح شمالی ہند مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکا ہے۔ جنوب کی حالت بھی یہی ہو جائیگی۔ انتہائے جنوب میں مدورا کی پانڈیا سلطنت دم توڑ چکی تھی۔ اور وہاں مسلمان دہلی سے باغی ہو کر ایک نئی سلطنت قایم کر رہے تھے۔ ہوسے سالا سلطنت بھی قریب المرگ تھی۔ راجہ بلالا سوم کا ملک پر وہ اثر و رسوخ باقی نہیں تھا۔ جو مسلمانوں کے حملے سے پیشتر قایم تھا۔ لیکن اس نے فرزانگی سے کام لیکر ہندوؤں میں اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ

(۱) مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا ایک متحدہ محاذ بنائے۔

(۲) ہوسے سالا سلطنت کی عظمت رفتہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

(۳) انتہائے جنوب میں مدورا کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کہ پورا جنوبی ہندوستان ہندوؤں کے قبضہ میں رہے۔

اس مقصد کو لیکر اس نے سب سے اول پایۂ تخت کو محفوظ بنانا چاہا۔ ملک کافور کے ہاتھوں دوارسمندرم کی پہلی تباہی کے بعد اس نے اس کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ابھی یہ تعمیر ہو رہا تھا کہ محمد تغلق کی فوجوں نے اس کو پھر تباہ کر دیا۔ راجہ بلالا نے اب اس کو غیر محفوظ سمجھ کر سرنگاپٹم کے شمال میں ٹنور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور اپنی شمالی سرحد پر دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی کنارے پر اپنے بیٹے کے نام پر ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ (جس کا ذکر فرشتے کے حوالے سے آگے آ چکا ہے) اس نئے شہر کی تعمیر سے اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان حملہ آوروں کو سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ ہندو مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کا نام سرینگری کے گرو مہادیو یا کے خطاب ودیاپانا پر ودیا نگر یا ودیانگر رکھا گیا۔ جو رفتہ رفتہ وجیانگر بن گیا (ودیا مہادیو یا ہی وہ گرو ہے جس نے ہندوؤں کے اتحاد کو مذہبی رنگ دیکر کامیاب بنایا)

راجہ بلالا سوم نے جس جگہ کو انتخاب کیا تھا اس کے متعلق مورخ بھٹا چاری لکھتا ہے :-

"دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی ساحل پر ایک چٹیل میدان میں جو تین طرف سے سیاہ ہیبت ناک پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور جس کے شمال میں دریائے تنگ بھدرا اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ وجیانگر کی بنیاد رکھی گئی"

لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہندوؤں کے اس اتحاد سے فائدہ اٹھانا راجہ بلالا سوم کے نصیب میں نہیں بلکہ کسی اور کے نصیب میں تھا۔ جس طرح مسلمان دکن میں خانہ جنگی کی وجہ سے منتشر تھے۔ اسی طرح جنوب میں بھی کوئی زبردست سلطنت نہ ہونے کے باعث ہندو بھی پراگندہ تھے۔ ہر سردار یا رئیس اپنی اپنی جگہ پر خود مختار بن بیٹھا تھا راجہ بلالا سوم کے حالات گذشتہ سطور میں آ چکے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کے دو حملوں

نے اس کو کمزور بنا دیا تھا۔ اس کی اس کمزوری سے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ بلالا سوم کا ایک سردار تھا۔ جس کا نام ہری ہر تھا۔ اس نے اپنی طاقت کو مضبوط بنانا شروع کیا۔ اور اس کام میں اس کے دوسرے چار بھائی بکا۔ کمپنا۔ مرتی اپا اور مڈپا نے بھی تائید کی۔ جو مختلف مقامات میں بلالا سوم کے گورنر تھے۔ ہری ہر نے باوجود طاقتور ہونے کے اپنے آقا بلالا سوم سے سرتابی نہیں کی۔ بلکہ وہ خاموشی سے اپنا کام کئے جارہا تھا۔ اس کے اس کام میں جس شخص نے سب سے بڑھکر تائید کی وہ گرو وِدیا رنیا تھا۔ جس کی دور بین نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ راجہ بلالا اور اس کی ہوسے سالا سلطنت پنپنے والی نہیں ہے۔ اور ہوا بھی یہی کہ چند دن کے بعد راجہ بلالا سوم جس نے اپنے تیسرے مقصد کی تکمیل کیلئے مدورا کے مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہوسے سالا سلطنت کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اور ہری ہر کا خاندان برسر حکومت آگیا۔ ہری ہر نے اپنے گرو کے مشورے سے وجیانگر کو اپنا پائے تخت بنایا۔ جس کا ثبوت اس کتبے سے ملتا ہے جو ابھی حال میں مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ کو ملا ہے۔ اس پر یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

> "اس کی فصیل ہماکٹ۔ اس کی خندق مقدس تنگ بھدرا۔ اس کا محافظ ویرو پکشا ہے جو تمام دنیا کا محافظ ہے۔ اور اس کا حکمران ہری ہر ہے جو بادشاہوں کا بڑا بادشاہ ہے۔"

وجیانگر کے متعلق تمام ہندو مورخین کو اتفاق ہے کہ اس کی بنیاد اسی جگہ رکھی گئی تھی۔ جہاں پر ڈھائی ہزار سال پیشتر شہر کشکندہ آباد تھا (کشکندہ کے متعلق اگلے صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ یہ سگریو نامی راجہ کا پایۂ تخت تھا۔ جس نے رام چندر جی کو راون کے مقابلہ میں مدد دی تھی۔)

(نوٹ :۔ اس شہر کو پرتگالی مورخین نے بسناگ اور بیسانگر لکھا ہے۔ اور مسلمان مورخوں نے انا گندی اور کمپیلا کے نام سے خلط ملط کر دیا ہے۔ اگر نقشہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اناگندی کمپیلا اور وجیانگر قریب قریب ایک ہی جگہ پر واقع ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اناگندی دریائے تنگ بھدرا کے شمالی کنارے پر وجیانگر کے عین مقابل میں ہے اور کمپیلا۔ اناگندی سے چند میل کے فاصلہ پر۔ جس طرح شمالی ہند میں دہلی کئی دفعہ برباد ہوئی اور نئے نئے ناموں سے آباد ہوئی۔ اسی طرح کشکندہ تباہ ہو کر نئے نئے ناموں سے دریائے تنگ بھدرا کے کنارے کبھی شمال میں اور کبھی جنوب میں آباد ہوا۔ اس لئے ہر عہد میں اس کے نام بھی نئے نئے تجویز ہوتے۔ ہندوؤں میں ہوسپٹن اور ہمپی بھی اسی جگہ کا نام ہے۔ جہاں وجیانگر آباد ہوا تھا۔ صرف اناگندی کے شہر نے دریا کے شمالی کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک علحدہ حیثیت اختیار کر لی تھی۔ (اناگندی کی معنی مقامی زبان میں ہاتھیوں کے اصطبل کے ہیں (انا۔ ہاتھی = گندی۔ اصطبل)

کمپیلا میں جس وقت راجدھانی تھی تو اناگندی میں ہاتھی رکھے جاتے تھے۔ کمپیلا کی تباہی کے بعد اناگندی میں ہی تباہ شدہ خاندان نے پناہ لی تھی۔ اس لئے بعض مورخوں نے اس خاندان کو "اناگندی کا خاندان لکھ دیا ہے)

اس نئی سلطنت کے شاہی نشان کے لئے جنگلی سور کی تصویر اختیار کی گئی۔ راجگان وجیانگر کا خاندانی دیوتا ویروپکشا تھا۔ جس کا دوسرا نام شیوجی ہے۔ مہادیو یانے شیوجی کے اس بت کے لئے ایک عالیشان مندر تعمیر کیا۔ جو آج بھی ہمپے کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ راجگان وجیانگر اپنے فرمانوں پر الفاظ "سری ویروپکشا" دستخط کرتے تھے۔

خاندانِ وجیانگر

وجیانگر کا پہلا راجہ ہری ہر ہوا۔ جس کو ابن بطوطہ نے راجہ ہریب کے نام سے لکھا ہے۔ اکثر مورخین کو ہری ہر کے خاندان کے متعلق غلط فہمی ہوی ہے۔ اس لئے یہاں وہ تمام تاریخی اور مقامی روایات دی جاتی ہیں جو ہری ہر اور اس کے خاندان کے متعلق مشہور چلی آتی ہیں۔

(۱) جنوبی ہند میں عام طور پر جو روایت مشہور ہے وہ یہ ہے کہ ودیا ناراینا جگت گرو مہادیو یا جس وقت دریائے تنگ بھدرا کے کنارے ریاضت میں مصروف تھا تو بکا نامی ایک چرواہا اس کو ہمیشہ دودھ پلایا کرتا تھا۔ جب مہادیو سرنیگری کی تیرتھ کا جگت گرو بنا اور وجیانگر کی حکومت قایم کی تو اس نے یہاں کی حکومت ایک چرواہے کو بخش دی۔

(۲) مسٹر سیول اپنی تاریخ "فارگاٹن ایمپائر" میں لکھتا ہے:۔

"کروبا ذات کے دو بھائی ہری ہر اور بکا ورنگل کے راجہ کی ملازمت میں تھے ورنگل پر مسلمانوں کے حملے کے بعد انہوں نے ۱۳۲۳ء میں اناگندی کو آکر یہاں کے راجہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور یہاں وہ وزیر اور خازن بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی حکومت قایم کرلی"

(۳) پرتگالی سیاح نیونز اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

"سلطان دہلی (محمد تغلق) نے بسنگا (اناگندی) کے راجہ پر چڑھائی کی۔ محاصرہ کی تاب نہ لاکر راجہ نے سرن ماتا میں پناہ لی۔ لیکن مسلمانوں نے یہاں

بھی اس کا تعاقب کیا۔ تنگ آکر راجہ نے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ اور قلعہ سے نکلکر جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ شہر میں صرف چھ بوڑھے آدمی باقی رکھئے تھے۔ ان میں ایک تو راجہ کا وزیر تھا، اور دوسرا خزانچی۔ محمد تغلق دو سال تک اناگندی میں رہا۔ جب شمالی ہند میں بغاوت ہوئی تو وہ یہاں اپنے ایک نائب ملک نبی کو چھوڑ کر دہلی چلا گیا۔ سلطان کے جانے کے بعد تمام ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ ملک نبی اس بغاوت کو فرو نہ کر سکا۔ اور مجبوراً دولت آباد چلا گیا۔ اس وقت سلطان تغلق نے اپنے امراء سے مشورہ کرکے اناگندی کی حکومت راجہ کے وزیر کو بخشدی۔ ہری ہر اور بکا اسی وزیر کے خاندان سے تھے"

(۴) فرشتہ لکھتا ہے :۔

" راجہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے گیارہ بیٹے تھے۔ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ محمد تغلق نے انہیں حکومت سپرد کی۔ لیکن ان کے تبدیل مذہب کی وجہ سے ہندوؤں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اور بوڑھے وزیر کو راجہ بنا لیا۔ ہری ہر اور بکا اسی خاندان سے ہیں"

(۵) سدرن انڈیا انڈیر محاڈن انویڈرس کا مصنف لکھتا ہے :۔

" ہری ہر اور اس کے بھائی ہوسے سالا سلطنت کے ملازم اور گورنر تھے۔ دوار سمندرم کو مسلمانوں نے جس وقت فتح کر لیا تو راجہ نے وجیانگر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس سلطنت کے زوال پر وجیانگر ان بھائیوں کے قبضہ میں آگیا"

(۶) قدیم تحریروں اور کتبوں سے جو اناگندی کے قریب ملے ہیں، معلوم ہوتا ہے

کہ سنگما نامی ایک شخص اناگندی کے راجہ کا وزیر تھا۔ راجہ کے مارے جانے پر یہ یہاں کا راجہ بن گیا۔ اور ہری ہر اور بکا اس کے لڑکے تھے۔

ان تمام روایات پر اگر گہری نظر ڈالی جائے۔ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اناگندی کے راجہ کے مارے جانے کے بعد یہاں کی حکومت محمد تغلق نے وزیر کو بخش دی۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے دو ورنگل کے راجہ کی ملازمت میں تھے۔ ورنگل پر جب مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا تو یہ اناگندی کو واپس آئے۔ اور ہوے سالا سلطنت کی ملازمت میں داخل ہو کر مختلف صوبوں کے گورنر بن گئے۔ جب بلالا سوم کی سلطنت پر بھی مسلمانوں کے حملوں کے بعد زوال آنا شروع ہوا تو جگت گرو شنکراچاریہ مہا ودیا کی مدد سے انہوں نے اپنی سلطنت قایم کر لی۔ جگت گرو مہا ودیا جس طرح ہری ہر اور اس کے بھائیوں کا گرو تھا۔ اسی طرح وہ ہوے سالا سلطنت کا بھی گرو تھا۔ بلالا سوم نے اسی کی تائید سے اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن مہا ودیا کی دور بین نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے حملوں سے ہوے سالا سلطنت پنپ نہیں سکتی۔ اس لئے اس نے وجیانگر کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اور فرمانروائی کے لئے ہری ہر کو منتخب کیا۔ جو پہلے سے یہاں کا مقامی راجہ ہونے کے علاوہ بلالا سوم کا گورنر بھی تھا۔

ہری ہر اول

۱۳۳۶ء سے ۱۳۴۶ء

(مسلمان معاصرین۔ سلطان محمد تغلق)

(نوٹ:۔ معاصرین میں محمد تغلق کے بعد سلاطین دہلی کے نام عمداً نظر انداز کر دئے گئے۔ اسلئے کہ انکا سلاطین وجیانگر سے کوئی تعلق نہیں تھا)

ہری ہر کے عہد کو مورخین نے ۱۳۳۶ء سے شروع کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنت

دہلی کے خلاف تمام ہندوستان میں بغاوتیں پھیل رہی تھیں۔ اور سلطان محمد تغلق مدورا کی بغاوت فرو کرنے کیلئے دکن آیا۔ اور بیدر سے واپس ہوگیا۔ اور شمالی ہند کی بغاوتوں کے باعث پھر جنوب میں اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اور یہی وہ زمانہ تھا کہ دکن میں اس کے امرا اس سے باغی ہوکر آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اس لئے جنوب کے ہندوؤں کو اپنی آزادی کے لئے اس سے بہتر موقع مل نہیں سکتا تھا۔ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں میں ایک عرصہ سے خفیہ طور پر اتحاد کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ لیکن ہوسے سالا سلطنت مسلمانوں کے متعدد حملوں سے اس قدر کمزور ہوچکی تھی۔ کہ اس کا حکمران بلالا سوم گو اتحاد کے بانیوں میں سے تھا۔ لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ اور اس کی اس کمزور حالت کو دیکھ کر جگت گرو مہا دیویا نے ہری ہر اول کو اس نئی سلطنت کی حکمرانی کیلئے منتخب کیا۔ اور یہ گمان بیجا نہیں ہے۔ کہ گرو نے ہری ہر کا انتخاب اس لئے کیا کہ ہری ہر اور اس کے چار بھائی ملک کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے۔ شاید ان پانچ بھائیوں کی متفقہ طاقت جنوبی ہند میں اس وقت سب سے زبردست تھی۔ لیکن کسی تاریخ سے بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا۔ کہ ہری ہر کے انتخاب کو اس کے آقا بلالا سوم نے کس طرح گوارا کیا؟

(۱) ممکن ہے کہ اس وقت ہری ہر کی تخت نشینی بطور ایک خراج گذار راجہ کے ہوئی ہو۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ مدورا کے مسلمانوں سے جنگ میں مصروفیت نے راجہ بلالا سوم کو مہلت نہیں دی کہ اس طرف توجہ کرے۔

(۳) اپنی کمزور حالت کے احساس نے اس کو ہری ہر کے خلاف کچھ کرنے نہیں دیا۔

(۴) یا اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ ہری ہر اگر مضبوط ہو جائے تو اس کی اپنی سلطنت مسلمانوں کے حملے سے محفوظ رہے گی۔

بہرطور ان مذکورۂ بالا وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ ہے کہ بلا لاسوم نے اپنے گورنر ہری ہر کی تخت نشینی کو گوارا کر لیا تھا۔

ہری ہر اول سنگما وزیر کا پہلا بیٹا تھا۔ اور اس سے چھوٹے اس کے چار بھائی تھے۔ کتاب "نیور ٹوبی فورگاٹن ایمپائر" کا مصنف لکھتا ہے :-

"ہری ہر نہایت خوش قسمت تھا کہ اس کے چاروں بھائی اس کے نہایت وفادار ومطیع تھے۔ بکارایا جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کو اس نے یوراج یا ولی عہد بنا کر فوجوں کی کمان اس کے سپرد کر دی۔ تیسرے بھائی کمپا کو اس نے کڈپہ اور نلور کے اضلاع کا گورنر بنایا۔ چوتھے بھائی مارپا کو میسور کے مغربی علاقے کا حکمران بنایا گیا۔ پانچویں بھائی مدپا کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔"

اس نئی سلطنت کا وزیر خود جگت گرو مہا دیو پا بنا۔ اور اس قابلیت سے اس کا انتظام کیا کہ یہ سلطنت تھوڑے ہی عرصہ میں جنوب کی سب سے زبردست بن گئی۔ دکن کے مسلمان امراء اپنی اپنی لڑائیوں میں مصروف تھے۔ اس لئے کسی نے بھی ادھر توجہ نہیں کی۔ اور جب ان خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو کر بہمنی سلطنت کو استقلال نصیب ہوا تو اس وقت سلاطین بہمنیہ (مسلمانوں) کو معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں ایک نئی زبردست سلطنت" ان کی حریف" پیدا ہو گئی ہے۔

ہری ہر کے عہد میں مسلمانوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے بھی عمداً مسلمانوں سے کوئی چھیڑ نہیں کی۔ یا تو یہ ایک گہری سیاست تھی۔ جس پر ہری ہر کاربند ہوا۔ یا دکن کے مسلمان امراء اپنی خانہ جنگی میں اس قدر مصروف تھے کہ ادھر متوجہ نہیں ہو سکے۔ لیکن قرین قیاس یہ بات ہے کہ مسلمان امراء باوجود خانہ جنگیوں کے اس قدر طاقتور

تھے کہ اگر ہندوؤں سے چھیڑ ہوتی تو وہ ادہر متوجہ ہو جاتے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہری ہر نے نہایت دانشمندی سے اس کا موقع آنے ہی نہیں دیا۔ اور اس طرح خاموشی سے سلطنت کی تنظیم اور اس کے مستحکم کرنے میں مصروف رہا۔

ہری ہر کے عہد میں مختلف جنگوں کا ذکر آیا ہے اور یہ زیادہ ترکڑپہ اور نلور ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں کے ہندو سرداروں نے اس نئی سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جنوب کے تمام مندروں اور راجاؤں سے اس نئی سلطنت کے قیام کے لئے مدد ملی تھی۔ مگر وہ اس کی سیادت تسلیم کرنے کیلئے کسی طرح راضی نہیں تھے۔ اس لئے ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے ان مقامی سرداروں کی سرکوبی کی۔ اور انہیں اپنا مطیع اور باجگذار بنا لیا۔

ینور ٹوپی فارگاٹن ایمپائر کا ہندو مصنف لکھتا ہے :۔

> "ہری ہر جب اس قدر طاقتور ہو گیا کہ مسلمانوں سے مقابلہ کر سکے۔ تو خود بخود ایک موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ ورنگل کے راجہ پرتاب ردرا دیو کے بیٹے کرشنا دیو نے مسلمانوں کے خلاف اس سے مدد مانگی۔ اس وقت جنوب کی ریاستیں بھی ان کے ساتھ مل گئیں۔ اور انہوں نے اس وقت یہ ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو بندھیاچل کے ادہر نکال دیں۔ اور ان کو اس میں اس قدر کامیابی ہوی کہ سوائے دولت آباد کے باقی تمام ملک انکے ہاتھ آ گیا۔"

لیکن تاریخی واقعات اس کے خلاف ہیں۔ اگر دولت آباد تک کا حصہ ہندوؤں کے ہاتھ آ جاتا تو مسلمانوں کی وہ مشہور سلطنت جس کا نام دولت بہمنیہ تھا وجود میں نہ آتی۔ ہری ہر کے عہد کے چند کتبے ملے ہیں۔ جن میں کندہ ہے کہ ہری ہر کو مسلمانوں پر فتوحات حاصل ہوئیں۔

بسور گزیٹیر کا مصنف (ہیو دن راؤ) نے ان سے نتیجہ نکالا ہے کہ دوارسمندرم اور اناگنڈی کے چھاؤنیوں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا۔ اور بغیر جنگ کے یہ ممکن نہیں تھا۔ مسلمانوں پر فتوحات سے یہی مراد ہے۔

واقعات بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ یعنے مبارک شاہ خلجی کے عہد میں مسلمانوں کی جو چھاؤنیاں مختلف مقامات میں قایم ہوی تھیں، عہد تغلق کے بعد پھران کا کہیں ذکر نہیں آتا اس لئے ممکن ہے کہ مسلمانوں کو ان چھاؤنیوں سے نکالدیا گیا ہو۔ اس وقت ہندوؤں کو معلوم تھا کہ ان مسلمانوں کو دہلی یا دکن سے کوئی مدد مل نہیں سکتی۔

ہری ہر کی تعمیرات میں پشپا پتی کا مشہور مندر ہے۔ جس کو اس نے اپنی تخت نشینی کے پہلے سال میں تعمیر کیا۔ (اس مندر کو ہمپی کا مندر بھی کہتے ہیں)

ہری ہر ۱۳۴۶ء میں فوت ہوا۔ اس کے فوت ہونے کے وقت سلطنت دریائے تنگبھدرا سے نیچے دوارسمندرم تک اور مشرق میں ضلع نلور سے لیکر جنوب میں جیرۂ عرب تک پھیل گئی تھی اور ان ممالک کے تمام مقامی راجاؤں نے اسکی سیادت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ہری ہر کی تخت نشینی کے ۸ سال بعد یعنے ۱۳۴۳ء میں ہوے سالا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ راجہ بلالا سوم کو مدورا کے مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ہری ہر نے تمام ہوے سالا سلطنت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔

سیاسی پہلو سے ہری ہر کا عہد نہایت کامیاب عہد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنے ہمسایہ مسلمانوں کی نظر سے بچا کر ایک نہایت مضبوط سلطنت قایم کر لی تھی۔ سیول اپنی تاریخ میں سیاح نیونز کے حوالے سے لکھتا ہے:-

"ہری ہر کا عہد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ نہایت رازداری سے کام لیکر سلطنت کی تنظیم میں مصروف رہا۔ ہری ہر کے عہد میں ہی مشہور سیاح ابن بطوطہ جنوب میں آیا تھا اور اس نے کوکن کے حالات میں لکھا ہے کہ سلطان جمال الدین اس راجہ کا باجگذار تھا۔" (ابن بطوطہ نے راجہ ہری ہر کو ہریب لکھا ہے)

بکارایا۔اول

۱۳۴۶ء - ۱۳۷۹ء

(معاصرین :- علاؤالدین حسن کانگو بہمنی ۱۳۴۷ء سے ۱۳۵۸ء۔ محمد شاہ بہمنی اول ۱۳۵۸ء سے ۱۳۷۵ء۔ مجاہد شاہ بہمنی ۱۳۷۵ء سے ۱۳۷۸ء۔ داؤد شاہ بہمنی ۱۳۷۸ء۔ محمود شاہ بہمنی ۱۳۷۸ء سے ۱۳۹۷ء تک)

اپنے بھائی ہری ہر کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ لیکن سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

"ہری ہر کے بعد اس کا دوسرا بھائی سنگما تخت پر بیٹھا۔ اور اس کی وفات ۱۳۵۳ء میں ہوئی۔ اس کا دور بھی نہایت خاموشی اور امن سے گذرا۔ اس عرصہ میں سلطنت خوب مضبوط ہوگئی تھی۔ اور جنوبی ہند میں اسے کافی وسعت حاصل ہوگئی تھی!"

مگر ہندو مورخین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہری ہر کے بعد بکارایا تخت پر بیٹھا۔ اور کسی شجرہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سنگما نامی کوئی بھائی تھا۔ بکارایا ایک سیاست دان اور تجربہ کار جنرل تھا۔ اس نے جنوبی ہند کی ان تمام

ریاستوں پر قبضہ کرلیا جو ہوسے سالا سلطنت کی باجگذار تھیں۔ اس طرح اب وجیانگر کی سلطنت کے حدود ملیبار اور مدورا تک پھیل گئے۔ دوارسمندرم کا راجہ بلالا سوم جب تک زندہ رہا۔ مدورا کے مسلمانوں سے ہمیشہ جنگ میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اب وجیانگر کی سلطنت ان مسلمانوں کے مدمقابل ہوگئی۔ اور ایک عرصہ تک ہندو اور مسلمان لڑتے رہے

ادھر جنوب میں یہ چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوتی رہیں۔ بکارا یا کا بھائی کمپا فوجوں کی کمان پر تھا۔ اور ادھر پائے تخت میں بیٹھے ہوئے بکارا یا سلطنت کی تنظیم اور فوجوں کی تیاری میں مصروف رہا۔ اور جب اس کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ دکن کی اسلامی سلطنتوں سے برابر کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ تو اس نے پہلے سلطان محمد تغلق کو اور بعد میں سلطان فیروز کو لکھا کہ اگر وہ کمک دیں تو دکن کے مسلمان امراء پر وہ چڑھائی کریگا۔ اس کا جواب دونوں موقعوں پر دہلی سے کچھ نہیں ملا۔

یہ دکن کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان محمد تغلق یا اس کے جانشین فیروز نے دکن کے معاملات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اگر اس وقت دہلی کے مسلمان ذرا بھی جنگ کے لئے حرکت کرتے تو دکن کے مسلمانوں کا خاتمہ یقینی تھا۔ اس لئے کہ بکارا یا کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر دکن پر خود قبضہ کرلے۔

نیور ٹوبی فرگاٹن ایمپائر کا مصنف لکھتا ہے:-

"بکارایا نے شہنشاہ دہلی کو پیام بھیجا کہ اگر شہنشاہ حکم دے تو وہ دکن کے مسلمان باغی امراء سے جنگ کرنے کو تیار ہے۔ لیکن دہلی سے اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ اس لئے کہ دہلی میں بھی تغلق کے بعد انقلابات آرہے تھے۔"

کسی اور جگہ شروع میں لکھا گیا ہے کہ دکن میں بھی ایک اسلامی سلطنت قائم ہوچکی

تھی۔ دکن کے مسلمان امراء نے سلطان محمد تغلق سے بغاوت کرکے اسماعیل فتح خان کو ناصرالدین شاہ کا خطاب دیکر تخت نشین کردیا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے مقابلے میں جب اس کو شکست ہوی تو وہ ظفر خاں کے حق میں تخت سے دست بردار ہوگیا۔ یہ وہی ظفر خاں ہے جس نے ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ کو پائے تخت بناکر علاؤالدین حسن کانگو بہمنی کے خطاب سے تخت پر بیٹھا۔ اور بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

جس طرح وجیانگر کے حکمرانوں نے اپنے ابتدائی سال نہایت خاموشی سے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے میں گذارے۔ اسی طرح علاؤالدین حسن کانگو بہمنی بھی اپنی سلطنت کو طاقتور بنانے میں مصروف رہا۔ اس لیئے دونوں سلطنتوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہمنی سلطنت کا قایم ہوجانا انکی ہستی کے لیئے نیک فال ثابت ہوا۔ ورنہ اگر مسلمان امراء منتشر رہتے تو ممکن تھا کہ بکارایا سا اولوالعزم حکمران انہیں دکن سے ضرور نکالدیتا۔

دہلی سے جواب نہ آنے کے بعد۔ بکارایا نے اپنی اولین فرصت میں جب دکن پر نظر ڈالی تو اس وقت تک دکن کی اسلامی سلطنت خوب مضبوط ہوچکی تھی۔ اس لیئے اس نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کسی حلیف کو پیدا کرے۔ اور وہ حلیف ورنگل کا راجہ ونایک دیوا تھا۔

۱۳۵۸ء میں علاؤالدین حسن کانگو بہمنی کی وفات پر محمد شاہ اول تخت نشین ہوا۔ اس وقت بکارایا اور ورنگل کے راجہ ونایک دیوا نے محمد شاہ کو لکھا کہ بعض سرحدی اضلاع جو مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے ہیں۔ پھر ہندوؤں کے حوالے کردیئے جائیں۔ محمد شاہ نے اس کے جواب میں ورنگل پر حملہ کردیا۔ ہندوؤں کو شکست ہوی۔ اس کے چند دن بعد ہی ونایک دیوا

نے پھر محمد شاہ کی توہین کی۔ محمد شاہ نے دوبارہ ورنگل پر چڑھائی کرکے ونایک دیوا کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اس فتح کے بعد جب اسلامی فوج واپس ہو رہی تھی تو اس وقت بکارایا کی فوج پہونچی۔ جس نے گلبرگہ تک مسلمانوں کا تعاقب کیا۔

فرشتہ لکھتا ہے :۔

"ورنگل کی فتح کے بعد موسم کی خرابی کیوجہ سے اسلامی فوج زیادہ دنوں تک اس ملک میں ٹھہر نہ سکی۔ فوج میں سپاہی روزانہ مر رہے تھے۔ اس لئے محمد شاہ نے ہندوؤں کے تعاقب کرنے والی فوج پر توجہ نہیں کی۔ وہ خود بھی اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔"

بکارایا نے اگرچہ مسلمانوں کا گلبرگہ تک تعاقب کیا۔ لیکن اس کو گلبرگہ پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لئے اس نے وجیانگر کو واپس ہو کر شہنشاہ فیروز تغلق کو خط لکھا کہ اگر وہ تائید کرے تو گلبرگہ پر چڑھائی ہو سکتی ہے۔ لیکن فیروز نے اس خط کا جواب نہیں دیا۔

محمد شاہ بہمنی گلبرگہ میں کچھ عرصہ ستانے کے بعد ورنگل پر پھر حملہ آور ہوا۔ جس کے نتیجہ میں گولکنڈہ کا مشہور قلعہ اور ورنگل مسلمانوں کے قبضہ میں مستقل طور پر آ گئے۔ ورنگل کی ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے بہمنی سلطنت کے حدود جنوب میں سلطنت وجیانگر کے حدود سے مل گئے۔ اب محمد شاہ نے وجیانگر سے اس کی اگلی بدسلوکی کا انتقام لینا چاہا۔ وجیانگر والوں نے بغیر کسی سبب کے ورنگل والوں کو مدد دیکر مسلمان فوجوں کو پریشان کیا تھا۔

وجیانگر سے انتقام لینے کے لئے محمد شاہ بہمنی نے ورنگل کی فتوحات کا جشن اعلیٰ پیمانہ پر منایا۔ اس جشن میں چند ناچنے والیاں حاضر ہوئیں۔ ان کے کمالات سے بادشاہ اس قدر

خوش ہوا کہ اس نے اپنے وزیر سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ وجیانگر کے راجہ بکارایا کو لکھا جائے کہ "اس طائفہ کو اپنے خزانہ سے انعام دیا جائے"۔ ملک سیف الدین نے سمجھا کہ بادشاہ شراب کی مستی میں یہ الفاظ کہہ رہا ہے۔ اس لئے اس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ دوسری صبح کو بادشاہ نے ملک سیف الدین سے دستخط کرنے کے لئے حکم نامہ طلب کیا۔ اس نے عذر خواہی کی۔ محمد شاہ نے کہا :-

"خدا کی قسم میں اپنی زبان سے بیکار الفاظ نہیں نکالتا۔ میرا حکم شراب کی مستی کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ ایک خاص مقصد کے لئے ہے"۔

سیف الدین نے حکم نامہ لکھ کر بکارایا کے پاس بھیجدیا۔ بکارایا نے اس حکم کو اپنی توہین سمجھی۔ اور قاصد کو گدھے پر سوار کرکے تمام شہر میں گشت کرانے کے بعد باہر نکال دیا۔ اور ساتھ ہی فوج کو تیاری کا حکم دیا۔

ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن (Historic Landmarks of the Deccan) کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۸ پر لکھتا ہے :-

"۱۳۶۵ء میں تیس[۳۰] ہزار ہاتھی۔ تیس[۳۰] ہزار سوار اور نو[۹] لاکھ پیادہ فوج سے بکارایا۔ اپنی سلطنت کے جنوبی اضلاع پر حملہ آور ہوا۔ محمد شاہ کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے بھی فوجی تیاری کا حکم دیا۔ لیکن ان فوجوں کے تیار ہونے تک ہندو ملک کے بڑے حصہ پر قابض ہو چکے تھے۔ اور اسی وقت مدگل کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ مدگل میں آٹھ سو سے زیادہ مسلمان نہیں تھے۔ اور وہ بھی اس ناگہانی افتاد سے بے خبر تھے۔ قلعہ فتح ہوگیا۔ بکارایا نے حکم دیا کہ تمام مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کردیا جائے۔ مرد اور بچے تو اسی وقت قتل کردئے

گئے۔ لیکن عورتوں کو ان کی عصمت دری کے بعد قتل کیا گیا۔ ہندو فوج کی اس چیرہ دستی کی خبر جب محمد شاہ کو پہونچی تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک اس کے بدلے میں ایک لاکھ ہندو تہ تیغ نہ کئے جائیں۔ تلوار میان میں نہیں ڈالی جائے گی۔ یہ کہکر اس نے اسی وقت نو ہزار منتخب اور جانباز سواروں کو لیکر دریائے کرشنا کو عبور کیا۔ باقی اسلامی فوج پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ محمد شاہ کے آمد کی خبر سنتے ہی بکارایا اور اسکی سوار فوج فرار ہو گئی۔ محمد شاہ کی فوج ہندوؤں کے کیمپ میں اس قدر تباہی لائی کہ ستر ہزار ہندو مارے گئے۔ ان مقتولوں میں دس ہزار سے زیادہ برہمن تھے۔

محمد شاہ نے یہاں سے بڑھکر وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ راستہ میں بے حساب ہندو مرد۔ عورتیں اور بچے قتل ہوئے۔ محمد شاہ نے اس طرح اپنی قسم پوری کی۔ بکارایا نے مجبور ہو کر صلح طلب کی۔ اور اس شرط پر صلح ہوئی کہ بکارایا اپنے خزانہ سے طائفہ کو انعام دے۔ طوائفوں کو انعام اسی وقت دید یا گیا۔ اور دونوں حکمرانوں نے عہد کیا کہ آئندہ قیدیوں۔ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائیگا"

سلطان محمد تغلق کے بعد یہ پہلی دفعہ تھی کہ دکن کے مسلمان دریائے کرشنا و تنگ بھدرا کو عبور کر کے جنوب میں پہونچے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف ہیودن راؤ صفحہ ۱۴۷۱ پر لکھا ہے :-

"وجیانگر کی بنیاد کے بعد تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ

وجیانگر پہونچا۔ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ سلطان کی واپسی پر ہندوؤں نے پھر مسلمانوں کا تعاقب شروع کیا۔ محمد شاہ نے طرح دینی شروع کی۔ لیکن جب ہندو باز نہ آئے تو اس نے ایک جگہ ہندوؤں کو گھیر کر ایسا شبخون مارا کہ بے حساب ہندو مارے گئے۔"

اس کے بعد اس تاریخ کا مصنف لکھتا ہے اور یہی اس کا مقصد ہے کہ:۔

"باوجود صلح کرنے کے بکارایا عاجز نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے واپس ہونے والی فوج سے برابر چھیڑ جاری رکھی۔"

اس جنگ کے بعد بکارایا کے عہد کے نو سال نہایت امن سے گذرے۔ اس عرصہ میں اس نے اپنی شکست کی تلافی کے لئے فوج کی از سر نو تنظیم شروع کی۔ لیکن جزیرہ نما کے جنوب میں اس کی فوج برابر لڑائیوں میں مصروف رہی۔ اور ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور پالیگاروں کو مطیع کر لیا گیا۔ جو وجیانگر کی سیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں جنوب کے مسلمانوں سے بھی جن کی حکومتیں ملیبار اور مدورا میں تھیں۔ برابر جنگ جاری رہی۔ ان جنگوں میں کبھی ہندو غالب آتے تھے اور کبھی مسلمان۔ اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ مدورا کی تاریخ میں ان جنگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بہر طور ہندوؤں نے مدورا کو فتح کر لیا۔ اور اس کے بعد ہی ملیبار بھی فتح ہو گیا۔ ملیبار کے حالات میں سدرن انڈیا انڈر محامڈن انویڈرس کا مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھتا ہے:۔

"ہمسایہ سلطنت کا سردار باکن (بکارایا) ہاتھیوں اور فوجوں کو لیکر حملہ آور ہوا اور مسلمانوں کے تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ مردوں کے قتل کے بعد ہندوؤں

نے مسلمان عورتوں کی عصمت ریزی کی۔ اور انہیں اسیر بنا کر لے گئے۔"

ملیبار اور مدورا کی حکومتوں کا خاتمہ ہوتے ہی جنوب سے مسلمانوں کا نام مٹ گیا اور اس طرح مٹا کہ پھر ڈیڑھ سو سال تک انہیں اس ملک میں آنا نصیب نہ ہوا۔ ظلم و ستم سے تنگ آکر جو مسلمان دشوار گذار پہاڑیوں اور جنگلوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ بھی ہندوؤں کے خوف سے اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے لگے۔ بہرطور مدورا اور ملیبار کی اسلامی حکومتوں کے خاتمہ کے ساتھ ہی سلطنت وجیانگر کو راس کماری تک وسعت مل گئی۔ اور پورا جنوبی ہند صحیح معنوں میں ہندوؤں کا ملک بن گیا۔ بلا لاسوم ہویا جگت گرو مہادیویا جس بات کی آرزو رکھتے تھے۔ وہ وہ بکارایا کے عہد میں پوری ہوئی۔

اسی سال کے خاتمہ پر یعنی ۱۳۷۶ء میں گلبرگہ میں محمد شاہ بہمنی کی وفات ہوئی۔ اور اس کا نوجوان بیٹا مجاہد تخت نشین ہوا۔ مجاہد کی عمر اس وقت انیس[19] سال کی تھی۔ بکارایا نے اس وقت تنگ بھدرا سے بڑھکر چند متصل مقامات پر قبضہ کر لیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ نوجوان مجاہد ادھر توجہ نہیں کریگا۔ لیکن اسکی توقع کے خلاف مجاہد نے لکھا:-

"ہندو فوج چیرہ دست ہو کر اسلامی مقبوضات پر قبضہ کر رہی ہے۔ بہتر ہے۔ کہ اس فوج کو تنگ بھدرا کے پار واپس بلا لیا جائے۔ اور اگر دریائے تنگ بھدرا کو سرحد قرار دیا جائے تو آئندہ بہمنی سلطنت وجیانگر والوں سے کوئی تعرض نہیں کریگی۔ تنگ بھدرا سے نیچے تمام جنوبی ہند پر اس کی سیادت کو تسلیم کر لیا جائے گا۔"

بکارایا نے اس کے جواب میں لکھا:-

"سلطنت وجیانگر کی شمالی سرحد عرصہ قدیم سے دریائے کرشنا تک رہی ہے۔ اس لئے دوآبہ پر وجیانگر کا حق ہے۔ بہتر ہے کہ اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس

بلا کر رائچور اور مدگل کے قلعے ہندوؤں کے حوالے کر دئے جائیں۔ اور ساتھ ہی وہ تمام ہاتھی جو نو سال پیشتر محمد شاہ نے بہ جبر حاصل کئے تھے، واپس کئے جائیں۔ (ہسٹارک لیانڈ مارکس آف دی دکن صفحہ ۱۰۹)

مجاہد کے پاس جب یہ جواب پہونچا تو اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اور اسی سال دریائے کرشنا کو عبور کر کے کچھ ایسی برقی سرعت سے بڑھا کہ قلعہ ادھونی میں پہونچکر اس کا محاصرہ کر لیا۔ نوجوان مجاہد کو شوق تھا کہ قلعہ اسی کے ہاتھ سے فوراً فتح ہو جائے۔ لیکن جب اس میں دیر ہوئی تو اس نے صفدر خاں سیستانی کو محاصرہ پر چھوڑ کر وجیانگر کی طرف رخ کیا۔ بکا رایا اپنی فوج لیکر تنگ بھدرا کے دوسرے کنارے پر اس کا منتظر تھا۔ لیکن جنگ کا فیصلہ قدرت نے کسی اور ہی طرح مقدر رکھا تھا۔ یوروپین مورخ ہیگ اور گریبل وغیرہ فرشتہ کے حوالے سے حیرت سے لکھتے ہیں کہ مشرق میں جنگوں کا فیصلہ کس قدر آسانی سے صرف سپہ سالاروں کی ہمت و جرأت پر ہو جاتا ہے:-

"مجاہد نے آتے ہوئے راستے میں ایک خونخوار شیر کو ایک ہی تیر سے مار دیا۔ ہندو فوج میں جب یہ خبر پہونچی تو ان پر مجاہد کا رعب چھا گیا۔ بکا رایا نے یہ دیکھکر جنگلوں میں پناہ لی۔" (ہسٹارک لیانڈ مارکس آف دی دکن صفحہ ۱۰۹)

لیکن زمانہ حال کے ہندو مورخین اس واقعہ کو جھٹلاتے ہیں۔ تاہم انہیں اس سے انکار نہیں کہ بکا رایا نے جنگلوں میں پناہ لی۔ اور مجاہد اسکے تعاقب میں نکلا تھا۔

ممکن ہے کہ ہندو جو ہر بات میں اچھا اور برا شگون نکالنے کے عادی ہیں۔ شیر کی موت کو برے شگون سے تعبیر کرتے ہوئے جنگلوں میں پناہ لینے چلے گئے ہوں اور ممکن ہے کہ فرشتہ نے اسلامی فوج کی برتری دکھلانے کے خیال سے یہ لکھا ہو کہ مجاہد کا رعب ہندوؤں پر چھا گیا

لیکن یہ تو صحیح ہے کہ خواہ ڈر کر ہو یا شگون لیکر بکارایا نے جنگلوں میں پناہ لی۔ بہر طور مجاہد نے بکا کے تعاقب میں آٹھ مہینے گذار دیئے۔ اس عرصہ میں اس کو اس قدر فتوحات ہوئیں کہ ہندوں کی فوج پر عرصۂ عافیت تنگ ہو گیا۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"جنوب میں مجاہد بندرگاہ رامیسورم تک پہونچ گیا۔ اور اس نے ملک کافور کی بنائی ہوئی مسجد جو شکستہ ہو رہی تھی از سر نو تعمیر کی"

مورخ سیول اپنی تاریخ میں رامیسورم کے واقعہ کو نا ممکن قرار دیتا ہے۔ تاریخی واقعات بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ کہ فرشتہ نے یہاں سخت غلطی کی ہے۔ اگر اس سال مجاہد یہاں تک پہونچ جاتا تو مدورا کی سلطنت کا خاتمہ دوسرے سال میں ہرگز نہ ہوتا۔ اور ملیبار میں بھی مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہو جاتی۔ لیکن واقعات بتا رہے ہیں کہ مدورا اور ملیبار میں اس سال اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ممکن ہے کہ رامیسور کوئی اور جگہ ہو اور یہاں کوئی مسجد تھی جس کو مجاہد نے از سر نو تعمیر کیا ہو۔

(نوٹ :- اضلاع بلاری واننت پور میں رامیسورم اور رامیسورم کے ناموں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی تعلقہ میں کئے کئے رامیسورم اور رامیسورم ہیں۔)

آٹھ ماہ تک جنگلوں میں زندگی بسر کرنے سے ہندو فوج میں وبا پھیل گئی۔ جس سے مجبور ہو کر بکارایا اپنے پایۂ تخت کو واپس ہوا۔ مجاہد کو جس وقت اس کی خبر پہونچی تو اس نے بڑھکر وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ وجیانگر کا محاصرہ کرنے کیلئے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک بڑا راستہ تھا۔ جس پر فوج آسانی سے گذر سکتی تھی۔ لیکن یہاں قدم قدم پر مدافعت کا سامان تھا۔ دوسرا ایک خاردار جنگلی راستہ تھا جو نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ مجاہد نے اسی دوسرے راستہ کو

ترجیح دی۔

اس دوسرے راستے کو طے کر کے مجاہد کے یکایک آجانے سے وجیانگر میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں نے آتے ہی شہر پر حملہ کر دیا اور شہر کی فصیل پر قابض ہوگئے۔ بعض بعض مقامات پران کی رسائی یہاں تک ہوئی کہ اگر درمیان میں فصیلیں اور دوسرے موانعات نہ ہوتیں تو شاہی محل پران کا قبضہ ہوجاتا۔ مجاہد نے ہنومان کے مندر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے بتوں کو توڑ کر مندر کو زیر زمین کر دیا۔

نیوزلوپی فرگاٹن ایمپائر کا مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"میں نے اس مندر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس کو مجاہد نے تباہ کر دیا تھا شاہی محل یہاں سے بالکل قریب ہے"

مجاہد کے اس قدر قریب آجانے سے شہر میں ایک ہنگامہ پیدا ہوگیا۔ اس وقت بکارایا فوج لیکر مجاہد کے مقابلہ کو نکلا۔ اور اتفاقاً اسی وقت میسور سے ایک بڑی فوج اسکی تائید کو آگئی۔

شہر پر حملہ کرنے سے پیشتر مجاہد نے اپنے چچا داؤد خاں کو فوج دیکر قریب کی ایک پہاڑی پر مستعد رہنے کیلئے حکم دیا تھا اور شاہی علم اسی فوج کے پاس تھا۔ اس وقت جب بکارایا کی مدد کے لئے میسوری فوج آگئی۔ تو داؤد خاں مجاہد کو خطرہ میں دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے آگیا۔ اس طرح اسلامی علم اس فوج کی نظروں سے پنہاں ہوگیا جو مجاہد کے ساتھ تھی۔ اسلامی علم کے نظر سے غائب ہوتے ہی مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔ مجاہد نے کل فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ داؤد خاں کو ملامت کی۔ اور وجیانگر کا محاصرہ اٹھا کر ادھونی پر بڑھا۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ صفدر خاں سیستانی پہلے سے یہاں محاصرہ کر رکھا تھا۔ نو ماہ تک محاصرہ رہا۔ لیکن ادھونی کا قلعہ فتح نہیں ہوا۔ ادھر بکارایا میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وجیانگر سے باہر نکل کر ادھونی والوں کو مدد

دے یا مجاہد کا مقابلہ کرے۔ ادھونی کا محاصرہ جاری ہی تھا۔ کہ ملک میں قحط کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور فوج میں بیماری پھیل گئی۔ مجاہد بغیر قلعہ فتح کئے واپس ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن ملک نائب سیف الدین غوری کے سمجھانے پر محاصرہ اٹھاکر واپس ہوا۔

راستے میں اس کے چچا داؤد خاں نے سازش کرکے اس کو قتل کر دیا۔ کیونکہ وجیانگر میں اس نے اس کی توہین کی تھی۔

(نوٹ:۔ مجاہد کی شہادت کے بعد جب داؤد خاں گلبرگہ پہنچ کر تخت نشین ہوا تو مجاہد کی بہن نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کیلئے داؤد خاں کو قتل کرادیا۔)

اس جنگ میں ہندوؤں کے چالیس ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی ہیبت ہندوؤں پر بیٹھ گئی تھی۔ اور انہوں نے واپس ہونے والے مسلمانوں سے کوئی چھیڑ نہیں کی۔ بلکہ آئندہ چالیس سال تک وہ دوآبہ رائچور کی طرف نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھ سکے۔ ان میں اس قدر ہمت نہیں تھی کہ دریائے تنگ بھدرا سے آگے بڑھیں۔

مجاہد کے اس ہولناک طوفانی معرکہ نے آخری عمر میں بکارایا پر بہت اثر کیا۔ اس حملے کے چند ماہ بعد ہی یعنی ۱۳۷۹ء میں اس کی وفات ہوگئی۔

ہندو مورخین جیسے ہیودن راؤ، سوری نارائن راؤ وغیرہ بکارایا کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فرشتہ کی تحریر نے بکارایا کو بالکل ہی بزدل دکھایا ہے۔ لیکن اس کے خلاف وجیانگر میں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہایت جری اور مرد میدان تھا۔ مسلمان اس کی ہیبت سے کانپتے تھے۔ لیکن تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کہ جس طرح بڑے بڑے فوجی جنرل اور سلاطین کسی عمدہ موقع پر ایک ناقابل فہم غلطی یا

کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں - اسی طرح بکارایا میں بھی یہ کمزوری تھی - جس کی
وجہ سے اس نے بہترین موقعوں کو کھو دیا"

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سلطنت وجیانگر کی وسعت بکارایا کی رہین منت ہے - اس نے جنوبی ہند کو ڈھائی سو سال کیلئے ہندوؤں کے لئے محفوظ کر دیا - اس کی جنگی قابلیت سے بھی انکار نہیں - لیکن بکارایا کو شروع میں جو فتوحات حاصل ہوئی تھیں - وہ سب جنوب کے چھوٹے چھوٹے ہندو راجاؤں پر تھیں - کسی طاقتور اور جنگ آزمودہ فوج سے اس کو سابقہ نہیں پڑا تھا - ملیبار اور مدورا کے مسلمان گو حکومت کے مالک تھے - مگر اس قدر اقلیت میں تھے کہ ملک میں ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا - یہ اسی وقت تک تحفظ تھے - جب تک دہلی سے انکا تعلق رہا ۱۳۳۶ء میں اس تعلق کے منقطع ہوتے ہی یہ ہندوؤں کے نرغے میں گھر گئے - دہلی یا دکن کے مسلمانوں کی ان تک رسائی دشوار اور نا ممکن تھی - سلطنت وجیانگر راستے میں حائل ہو چکی تھی - لیکن ان مٹھی بھر مسلمانوں نے تیس سال تک کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا - اس تیس سال کے عرصہ میں کوئی سال بھی ایسا نہیں گذرا کہ انہوں نے امن و راحت کی زندگی بسر کی ہو ۱۳۴۳ء تک انہیں دو دشمنوں سے سابقہ رہا - یعنے تراونکور اور دوار سمندرم کے ہندوؤں سے - اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وجیانگر جیسی زبردست سلطنت کا مقابلہ کرتے رہے - اور مٹ گئے - انہیں فتوحات سے سرشار ہو کر بکارایا نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرتے ہوئے دکن کے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ دی تھی - اگر بکارایا ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے سبق حاصل کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ جب ملیبار اور مدورا کے مٹھی بھر مسلمان تیس سال تک کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے ہیں تو دکن کے مسلمانوں سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے - بہمنی سلطان محمد شاہ کی جنگ سے بھی اس نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا - تاریخ گواہ

ہے کہ محمد شاہ بہمنی کی فوج کی آمد کی خبر سنکر ہی ہندو فوج فرار ہوگئی تھی۔ بات یہ تھی کہ ملک کافور اور تغلق کی ہیبت ان کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ سب سے اخیر حملہ تغلق کا تھا جو ترک تھا اس حملے نے اناگندی۔ دوارسمندرم اور مدورا کی سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کی ہیبت دلوں پر اس درجہ چھا گئی تھی کہ ہندو ترک کے نام سے لرزتے تھے (اور اسی وجہ سے آج بھی جنوبی ہند میں مسلمانوں کو ترک کہا جاتا ہے۔)

ان اسلامی حملوں کا اثر جلد زائل ہونا ناممکن تھا۔ اسی لئے ہندو فوج باوجود اس کثرت کے جس کا ذکر آگے آچکا ہے۔ محمد شاہ اور مجاہد کے نام ہی سے گھبرا کر میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہوگئی یہاں سوال موقع کرنے کا نہیں۔ بلکہ ہندوؤں کی ذہنیت کا تھا۔ بہر طور جنگ میں مجاہد سے شکست کھانے کے بعد بکارایا کا دل ٹوٹ گیا۔ چنانچہ اس کے چھ ماہ بعد ہی یعنے ۱۳۷۹ء میں اسکا انتقال ہوگیا بکا کے عہد میں ملک کے اندر خوب ترقی ہوئی۔

بکارایا کے عہد کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے :۔

"بہمنی سلاطین کو اگر وجیانگر پر کوئی فوقیت حاصل تھی تو یہ ان کی جنگی طاقت سے تھی۔ ورنہ رایان وجیانگر مال و دولت میں ان سے بڑھکر تھے۔ گوا اور مبہار کے زرخیز بندرگاہیں ان کے قبضہ میں تھیں۔ رعایا وفادار تھی۔ اور ملک خوب آباد تھا۔ سیلون اور ٹراونکور کے راجہ ان کے درباروں میں سفیر رکھتے۔ اور ہر سال ان کے ذریعہ قیمتی نذرانے گذارتے تھے"

بکا کے عہد کے ایک کتبے پر جو ابھی حال میں چنرایا پٹن (ریاست میسور) کے قریب دستیاب ہوا ہے۔ یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

" بکارایا تمام ماضی و مستقبل کے بادشاہوں میں سب سے جری اور بہادر ہے

اس کے عہد حکومت میں رعایا نہایت خوش و خرم ہے اور مال و دولت کی
فراوانی ہے۔ اس نے تمام دنیا کو فتح کرنے کے بعد اپنے پائے تخت کو اس قدر
خوبصورت بنایا ہے کہ وہ ہو بہو کنول کا ایک پھول معلوم ہوتا ہے"

اس کتبے کی شاعرانہ تعلیوں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بکارایا
کے عہد میں سلطنت کی ترقی کے ساتھ ساتھ شہر وجیانگر کو بھی خوب ترقی ہوئی تھی۔

بکا کے عہد میں نئے نئے بہت سے شہر اور دیہات آباد کئے گئے۔ رفاہِ عام کے کاموں
میں مٹ اور نہریں بنائی گئیں۔ بکارایا علم دوست تھا۔ اور فنون لطیفہ (Fine Arts)
کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں مشہور شاعر گنگا دیوی گذرا ہے۔ جس نے اپنی
نظم میں وجیانگر کی بہت تعریف کی ہے۔

ہندوؤں کے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بکارایا کا عہد نہایت اہم ہے۔ ایک عرصہ سے
ویشنو اور جین مذہب والوں میں اختلاف چلا آتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر جگہ خونریزی ہوتی
تھی۔ بکارایا نے اس اختلاف کا خاتمہ کرتے ہوئے دونوں مذہبوں کو سرکاری طور پر
تسلیم کر لیا۔

ہری ہر دوم

۱۳۷۹ء سے ۱۴۰۴ء

(معاصرین:- غیاث الدین بہمنی ۱۳۹۷ء شمس الدین بہمنی ۱۳۹۷ء۔ فیروز شاہ بہمنی
۱۳۹۷ء سے ۱۴۲۲ء)

بکارایا کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہری ہر دوم تخت نشین ہوا۔ ماچگان وجیانگر میں

یہی پہلا راجہ ہے جس نے شہنشاہ یعنے مہاراج ادھیراج کا خطاب اختیار کیا۔ اس کا طویل عہد حکومت سوائے آخری چند سالوں کے بالکل امن سے گذرا۔ اور اس عرصہ میں اس نے سلطنت کو خوب مستحکم و مضبوط بنایا۔ کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بے شمار مندر تعمیر کرائے۔ اور برہمنوں پر زر و جواہر کی بارش ہوتی رہی۔ اس کی تخت نشینی کے بعد کوکن اور جنوب کے راجاؤں نے خراج بھیجنا بند کر دیا تو اس نے ان پر فوج کشی کر کے انہیں پھر مطیع بنایا۔ ۱۳۹۱ء میں ملکی مصالح کے لحاظ سے اس نے ان چند مسلمانوں کو بھی خارج کر دیا۔ جو تجارت کی غرض سے گوا میں رہتے تھے۔ اس طرح اس کا عہد حکومت ۲۲ سال تک نہایت امن سے گذرا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خارج کرنے سے ہری ہر کا مقصد یہ تھا کہ اسکی جنگی تیاریوں کی اطلاع اس کی ہمسایہ مسلمان سلطنت کو نہ ملے۔ اس نے اسکے بعد آٹھ سال اپنی فوج کی تنظیم میں گذارے۔ اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ محمد شاہ اور مجاہد کے حملوں کا انتقام لے سکتا ہے تو ۱۳۹۹ء میں اس نے یکایک دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے دوآبہ دکن کے علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے رائچور کا محاصرہ کر لیا۔

ہسٹورک لیانڈ مارکس آف دی دکن میں مورخ ہیگ لکھتا ہے :۔ (صفحہ ۱۱۱)

"اس وقت دکن میں فیروز شاہ بہمنی حکمران تھا۔ جس وقت اس کو ہری ہر کی اس چیرہ دستی کی خبر پہنچی تو اس نے گلبرگہ جاکر نظام آباد میں فوج جمع کرنی شروع کر دی۔ اور وہاں کے مقامی ہندو زمیندار کو جو ہری ہر سے سازش کر کے باغی ہو گیا تھا۔ میدان جنگ میں شکست دیکر قتل کر ڈالا لیکن اس سلسلہ میں اس کو معلوم ہوا کہ اس سازش میں صرف یہی ایک ہندو زمیندار نہیں۔ بلکہ یہ سازش مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع پیمانہ پر ہوئی ہے۔ جس میں دکن کے بہت

سے ہندو سردار شامل ہیں۔ کھرلا کا حکمران نرسنگھ دیو بھی اس میں شامل ہے۔
اور ملک کی شمالی سرحد پر حملہ کر رہا ہے۔ فیروز نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے بیدر
اور دولت آباد کی مقیم فوجوں کو کھرلا پر بڑھنے کا حکم دیا۔ اور خود بھی جس قدر
فوج جمع ہو چکی تھی لیکر آگے بڑھا۔ اس وقت اس کے زیر کمان بارہ (۱۲) ہزار
فوج تھی۔ فیروز جس وقت دریائے کرشنا پر پہونچا تو دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا
اور دوسرے ساحل پر ہری ہر دوم تیس (۳۰) ہزار سوار اور نو (۹) ہزار فوج سے
اس کے انتظار میں تھا۔ فیروز دریا کی یہ حالت دیکھکر پیچ و تاب کھانے لگا۔ امرا
اور وزراء سے مشورہ کیا۔ لیکن دریا پار ہونیکا کوئی ذریعہ نہیں مل سکتا تھا۔ اور
دوسری مشکل یہ تھی کہ اس حالت میں بھی دریا کو عبور کیا جاتا تو دوسرے
ساحل پر تمام اہم مقامات پر ہندو فوج قابض تھی۔ اس حالت کو دیکھکر قاضی
سراج نے جو فوج میں ایک سو سواروں کا حاکم تھا۔ اپنی تجویز اس کے آگے
پیش کی۔ فیروز نے اس کو منظور کر لیا۔ قاضی سراج اور اس کے سات دوست
ہندو فقیروں کا بھیس بدل کر ہندوؤں کے لشکر میں پہونچے۔ اور یہاں یہ
لوگ شراب خانوں میں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے طوائفوں سے دوستی
بڑھائی۔ اور ان کے ناچ گانوں میں شامل ہونے لگے۔ قاضی سراج نے ایک
طوائف سے محبت بڑھائی۔ حالت یہاں تک پہونچی کہ بغیر اس کو دیکھے اس کو
چین نہیں آتا تھا۔ یہ طوائف شاہی دربار میں رسائی رکھتی تھی۔ اور قاضی کو
معلوم تھا کہ اس کے ذریعہ سے وہ وہاں تک پہونچ سکتا ہے۔

چند دن بعد اس طوائف کی شاہی دربار میں طلبی ہوی۔ اور جب وقت

وہ جانے لگی تو قاضی نے اس کا دامن تھام لیا۔ کہنے لگا۔ یا تو میرا خاتمہ کرتی جاؤ یا ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ دربار میں سوائے ناچنے، گانے والوں کے کسی دوسرے کو لے جانا منع ہے۔ اس پر قاضی نے کہا کہ وہ بانسری بجا سکتا ہے۔ اور اس نے بانسری اٹھا کر اس خوبی سے بجائی اور ایسا ناچا کہ طوائف بھی دنگ رہ گئی۔ اس نے قاضی اور اس کے ساتھیوں کو زنانہ لباس پہنایا اور ساتھ لیکر دربار میں گئی۔ یہاں قاضی اور اس کے ایک ساتھی کو راجکمار کے آگے پیش کیا گیا۔ ناچ شروع ہوا۔ قاضی اور اس کے ساتھی نے تلوار کا ناچ جو دکن میں مشہور ہے۔ دکھایا۔ تمام دربار حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ناچتے ہوئے کبھی اس قدر آگے بڑھ جاتے تھے کہ راج کمار کے قریب ہو جاتے تھے۔ اور کبھی بالکل دور۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ راج کمار کے بالکل قریب تھے۔ یکایک دونوں نے اپنی تلواریں راج کمار کے سینے میں گھونپ دیں۔ اسی موقع پر قاضی کے دوسرے چھ ساتھی جو باہر کھڑے تھے۔ قناتیں کاٹ کر خیمے میں گھس آئے اور ہندو امراء کو جو شراب کے نشہ میں مخمور تھے۔ قتل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہندوؤں کے سنبھلنے تک کئی امیر مارے گئے۔ اسی وقت قاضی اور اس کے ساتھیوں نے چراغ گل کر دیا۔ اور اندھیرے میں بچکر نکل گئے۔ یہاں سے وہ اس جگہ پہونچے جو پہلے سے مقرر شدہ تھی۔ یہاں پہونچکر انہوں نے اسلامی فوج کو دریا عبور کرنے کیلئے مقررہ اشارے دئے۔

راج کمار اور امراء کے قتل سے ہندو فوج میں ایک اضطراب پھیل گیا تھوڑے سے وقت میں قسم قسم کی افواہیں اڑنے لگیں۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ راجہ

ہری ہر بھی قتل ہو گیا ہے۔ ہندو فوج کے سپاہی جدھر ان کا خیال آیا۔ قاتلوں کے تعاقب میں نکلے۔ اس اثنا میں کسی نے یہ افواہ بھی اڑا دی کہ مسلمان دریا پار ہو کر آ گئے ہیں۔ ادھر ہندو فوج اس طرح منتشر ہو رہی تھی تو دوسری طرف فیروز کے چار ہزار سپاہی ٹوکروں میں بیٹھکر رات کی اندھیری میں گھوڑوں کو ساتھ ساتھ تیراتے ہوئے دریا عبور کر کے ساحل پر آ گئے۔ ادھر جو چند محافظ ہندو تھے۔ مارے گئے۔ صبح ہونے لگی۔ اس وقت فیروز اپنی بقیہ فوج کو لیکر دریا کو عبور کیا۔ شب میں جو مسلمان سپاہی آ چکے تھے۔ وہ ساحل کی حفاظت کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں اس قدر پریشانی پھیل چکی تھی کہ کسی جگہ بھی وہ جم کر فیروز کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ راجہ ہری ہر بڑی مشکل سے اپنے بیٹے کی لاش لیکر فرار ہوا۔ ہندو لشکر کا تمام مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ فیروز نے اب ہندوؤں کا تعاقب شروع کیا۔ اسکی فوج وجیانگر تک پہونچی اور اس کا محاصرہ کیا۔ فیروز نے اپنے بھائی احمد خاں خانخانان اور سردار میر فضل اللہ انجو کو حکم دیا کہ اطراف کے دیہات و شہر تباہ کر ڈالیں۔ قاضی سراج کو امیر کا خطاب دیا گیا۔ چند دنوں میں میر فضل اللہ اور خانخانان کی فوجوں نے دس ہزار برہمن مرد، عورات کو گرفتار کر لئے۔ فیروز نے حکم دیا کہ انہیں مسلمان بنا لیا جائے۔ یہ دیکھکر وجیانگر کے برہمنوں نے ہری ہر کو صلح کر لینے کا مشورہ دیا۔ فیروز کیلئے دس لاکھ طلائی ہن اور میر فضل اللہ کیلئے ایک لاکھ طلائی ہن، میر فضل اللہ کے پاس بھیجے گئے کہ کسی طرح فیروز کو صلح پر رضامند کر لے۔ میر فضل اللہ نے پورے گیارہ لاکھ ہن سلطان کے آگے پیش کر دئے اور صلح ہو گئی

دوآبہ رائچور پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔ فیروز محاصرہ اٹھا کر واپس ہوا۔ اور جاتے ہوئے فولاد خاں کو رائچور کا حاکم مقرر کیا"

اس جنگ کے چار سال بعد ہری ہر کی وفات ہوگئی۔

ہری ہر کی تاریخ وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ سیاح نیونز اپنے سفرنامہ میں اور سیول اپنی تاریخ میں ہری ہر کا سنہ وفات ۱۳۹۷ء دکھلاتے ہیں۔ مورخ رئیس ۱۴۰۵ء لکھتا ہے۔ لیکن وجیانگر کھنڈرات میں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۱۴۰۴ء میں ہی ہوئی تھی

ہری ہر کے متعلق نیور ٹوبی فرگاٹن ایمپائر کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ہری ہر ایک بہترین ماہر سیاست تھا۔ لیکن وقت پر اس کی تدبیر الٹی پڑی۔ اس نے اس موقع پر جنگ شروع کی۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس نے تیمور کو لکھا تھا کہ اگر وہ دکن پر حملہ کرے گا تو ہری ہر اپنی فوج سے مدد دیگا"

معلوم نہیں ہوا کہ اس سفارت کا کیا حشر ہوا۔ تیمور کے پاس سفارت بھیجنے کا مقصد صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن کے مسلمانوں کا خاتمہ کردینا چاہتا تھا۔

دیورائے اول

۱۴۰۴ء تا ۱۴۲۲ء

(معاصرین :- فیروز شاہ بہمنی ۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء)

دیورائے اول کا دوسرا نام بکا تھا۔ وہ اپنے بھائی ہری ہر دوم کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ فرشتہ نے اس کو نرسنگ لکھا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے سال ہی میں مسلمانوں سے پھر جنگ چھڑ گئی۔ اس کا سبب اس وقت پرتھال نامی ایک سنار کی لڑکی تھی۔ مورخ رئیس اسکے بارے میں لکھتا ہے :-

"پرتھال ایک سنار کی لڑکی تھی، جو مدگل کے قریب ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اگر شاعرانہ تعلیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کو بے مثل حسین بنایا تھا۔ وہ صانع فطرت کی صناعی کی ایک زندہ مثال تھی۔ اتفاق سے اس گاؤں میں ایک برہمن کا آنا ہوا جو شمالی ہند کی تیرتھوں سے واپس ہو رہا تھا۔ وہ پرتھال کے گھر میں مہمان ٹھہرا۔ برہمن موسیقی کا ماہر تھا۔ سنار نے اپنی بیٹی کو اس کی شاگردی میں دیدیا۔"

ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برہمن اپنی اس شاگرد کو خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے اپنا عشق بھی لڑکی پر ظاہر کر دیا تھا۔ لیکن لڑکی نے اس کو ٹھکرا دیا۔ مایوس ہو کر برہمن وجیانگر کو چلا گیا۔ لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ برہمن نے اس کے حسن خدا داد سے مالی فائدہ اٹھانے کی نیت سے وجیانگر کو جا کر دیورائے کے آگے پرتھال کے حسن و جمال کی اس قدر تعریف کی کہ دیورائے نے اسی برہمن کے ذریعہ قیمتی تحائف اور زیورات بھیجکر لڑکی کو طلب کیا۔ باپ

نے جب ویورایا کا پیام بیٹی کو سنایا تو اس نے وجیانگر کو اس بنا پر جانے سے انکار کر دیا۔ کہ پھر وہ تمام عمر محلات شاہی سے باہر نکل نہ سکے گی۔ ویورایا ماہ جبین پرتھال کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ پرتھال رضامند نہیں ہے تو اس نے پرتھال کو زبردستی حاصل کرنے کی تجویز کی۔

ہسٹورک لیانڈ مارکس آف دی دکن کا مصنف لکھتا ہے۔ ۔ (صفحہ ۱۱۲)

" ہندو فوج دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے آگے بڑھی۔ اس کا منزل مقصود مدگل تھا۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ بجائے خاموشی سے منزل پر پہونچنے کے راستے بھر لوٹ مار اور قتل و غارت کرتی ہوی آگے بڑھی۔ اس فوج کی آمد کی خبر سن کر دیہات والے جان بچانے کیلئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پرتھال اور اس کا باپ بھی انہیں میں تھے۔ ہندو فوج جب اس گاؤں میں پہونچی تو سنار اور اس کی بیٹی کا پتا نہیں تھا۔ اگر ویورایا اپنے ارادے سے پرتھال کے والدین کو آگاہ کر دیتا تو شاید وہ ٹھہرے رہتے۔ در مقصود حاصل نہ ہونے سے ہندو فوج مدگل سے واپس ہوی۔ فولاد خاں حاکم رائچور کو جب ہندو فوج کی اس چیرہ دستی کی خبر پہونچی۔ تو اس نے ہندوؤں کا تعاقب کیا۔ لیکن تنگ بھدرا کے قریب اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں اس نے پھر فوج جمع کر کے ہندوؤں پر چڑھائی کی۔ اس جنگ میں ہندو شکست کھا کر فرار ہوئے فولاد خاں ان کا تعاقب کرتا ہوا وجیانگر پہونچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔

یہ خبریں جب فیروز کو پہونچیں تو اس نے وجیانگر کو کامل طور پر فتح کرنے کیلئے دل میں ٹھانی۔ اور جلدی آ کر فولاد خاں سے مل گیا۔ محاصرہ

جاری تھا۔ مسلمان کبھی کبھی فصیل قلعہ تک پہونچ جاتے تھے۔ اور پھر ہٹا دئے جاتے تھے۔ چند دن کے بعد حالت یہ ہوی کہ نہ مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت تھی اور نہ ہندوؤں کو قلعہ سے باہر نکلنے کی جرأت۔ فیروز نے محاصرہ سے اکتا کر پھر وہی چال اختیار کی جو گذشتہ جنگ میں کارآمد ہوی تھی۔ اپنے سرداران فوج کو اطراف کے علاقوں کو تباہ کرنے کے لیئے روانہ کیا۔ میر فضل اللہ کو وجیانگر کے محاصرہ پر چھوڑ کر آپ ادھونی پر بڑھا۔ ادھونی ایک جنگی مقام تھا۔ گویا وجیانگر اور تمام جنوبی ہندوستان کی کنجی یہی شہر تھا۔ دیورایا کو جب معلوم ہوا کہ فیروز ادھونی کی تسخیر کے لئے جارہا ہے۔ تو وہ گھبرا کر صلح کا طالب ہوا۔ فیروز اس وقت وجیانگر سے سات کوس کے فاصلہ پر تھا۔ کہ وجیانگر کے سفیر باریاب ہوے۔ فیروز نے اس وقت ان سے کہا کہ (رعایا کی بہو بیٹیاں بمنزلہ اپنی بہو بیٹیوں کے ہیں۔ دیورایا نے پرتعال پر نظر نہیں ڈالی۔ بلکہ میری بیٹی پر نظر ڈالی ہے) اب صلح اسی صورت میں ممکن ہے کہ دیورایا اپنی بیٹی کو میرے حرم میں داخل کر دے۔ یہی اس کی سزا ہے۔ آخر بڑی مشکل سے یہ شرط طے ہوگئی اور فیروز نے دیورایا کی بیٹی سے شادی کی“

دونوں درباروں میں شادی کے جشن ہونے لگے۔ چالیس دن تک عیش و نشاط کے جلسے ہوتے رہے۔ جنوبی ہند کے تمام باکمال گویئے، شعبدہ گر اور مداری جوہر دکھلانے کے لئے جمع ہوئے۔ سلطان نے دلہن کے لیئے نہایت قیمتی تحائف بھیجا۔ اور دیورایا نے بھی اپنی بیٹی کو جہیز میں علاوہ زر و جواہر کے بنکاپور کا قلعہ دیا۔

فرشتہ نے اس شادی کی کیفیت نہایت تفصیل سے دی ہے۔ لیکن مغربی مورخین لکھتے

ہیں کہ مسلمانوں کی یہ ایک ایسی سنگین غلطی تھی۔ جس کی تلافی دو صدیوں تک، ہو نہ سکی۔ ہندو بالکل پسپا ہو چکے تھے۔ جنوبی ہند پر مسلمانوں کا نہایت آسانی سے قبضہ ہو جاتا۔ لیکن فیروز نے اس موقع کو کھو دیا۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ فیروز کا مقصد اس شادی سے یہی تھا کہ بہمنی سلطنت اور وجیانگر کے درمیان جو طولانی جنگوں کا سلسلہ سالہا سال سے چلا آرہا تھا۔ اس رشتہ کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہو کر ایک مستقل محبت و اتحاد کی بنیاد پڑ جائے۔

(نوٹ:۔ بعد میں مغلیہ شہنشاہ اکبر نے بھی یہی پالیسی اختیار کی)

مورخ سکاٹ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"وہ لڑکی جس کے لئے اس قدر خونریزی ہوئی تھی۔ اسکو فیروز نے اپنے دربار میں طلب کیا۔ پرتھال کے حسن خداداد کو دیکھکر اس پر حیرت چھا گئی۔ اس نے اس کی شادی اپنے بڑے بیٹے حسن سے کر دی۔"

اس جنگ کے بعد دیورایا کے عہد کے باقی سال نہایت امن وامان سے گذرے۔

گیارہویں سال کے خاتمہ پر پھر ہندو اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ گئی۔

میسور گزیٹیر کے صفحہ ۱۵۴ پر یہ مرقوم ہے:۔

"۱۴۱۷ء میں فیروز نے پنگل پر چڑھائی کی۔ یہ راجدھانی ادہونی سے ۷۰ میل شمال میں تھی۔ اور یہاں کا راجہ دیورایا کے عزیزوں میں تھا۔ پنگل کا محاصرہ دو سال تک رہا۔ اس عرصہ میں ملک میں وبا پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے اسلامی فوج میں سپاہی مرنے لگے۔ لیکن فیروز نے محاصرہ نہیں اٹھایا۔ یہ دیکھکر اس کے اکثر امراء علیحدہ ہونے شروع ہو گئے۔ دیورایا موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے اس

وقت فیروز پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد فیروز کو شکست ہوئی۔ میر فضل اللہ جو اس کا بہترین جنرل تھا۔ اس جنگ میں مارا گیا۔ یہ دیکھکر مسلمانوں کا دل ٹوٹ گیا۔ اور راہ فرار اختیار کی۔"

فرشتہ لکھتا ہے:۔

"اس موقع پر ہندو فوج نے غازیوں کے سر تن نازنین سے اس قدر جدا کئے۔ کہ میدان جنگ میں ان کے سروں کا چبوترہ بن گیا۔"

ہندو فوج نے مسلمانوں کا تعاقب کیا۔ اور بہمنی سلطنت کا جنوبی علاقہ، دوآبہ رائچور اور تمام ملک دریائے کرشنا تک ہندوؤں کے قبضہ میں آگیا۔ فیروز نے گجرات سے مدد طلب کی۔ لیکن یہ فوج وقت پر نہیں پہونچی۔ ہندو دریائے کرشنا پر رک گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دریا سے پار ہو کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ فیروز پائے تخت پہونچکر اس شکست کے صدمے سے مرگیا۔

یہ پہلی شدید شکست تھی جو مسلمانوں نے ہندوؤں کے ہاتھ سے اٹھائی۔ اور اس کا اثر بہت دور رس نکلا۔ اسی سال دیورایا کا بھی انتقال ہوگیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیورایا نے رفاہ عام کے کاموں میں اس قدر دلچسپی نہیں لی۔ جسقدر اس کے پیشروؤں نے لی تھی۔ دریائے ہری درا پر اس کے عہد میں ایک پل باندھا گیا۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو تاریخ میں اس کی یادگار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیورایا نے اپنی تمام کوشش فوج کی تنظیم اور اس کے ذریعہ اس توہین کا انتقام لینے میں صرف کی جو پہلے پرتھال کی وجہ سے اور بعد میں اپنی بیٹی کو ایک مسلمان کو دینے سے ہوئی تھی۔ جنوبی ہند میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ ہندوؤں نے اپنی بیٹی مسلمانوں کو دی ہو۔ اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جو وجیانگر کے آئندہ

راجاؤں کو بھی ہر وقت مسلمانوں کی توہین پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔ اور عرصہ تک دوآبہ رائچور کی سرزمین خون سے گلریز رہی۔

ویرا وجے رایا (یا بکارایا سوم)

۱۴۲۲ء ۱۴۲۴ء

(معاصرین :- احمد شاہ بہمنی ۱۴۲۲ء ۱۴۳۵ء)

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ادھر فیروز کا انتقال ہوا۔ اور ادھر اس کے خسر اور حریف دیورایا کا بھی اسی سال انتقال ہوگیا۔ فیروز نے پنگل پر چڑھائی کی تھی۔ اور اس کو اس کی امید نہیں تھی۔ کہ غیر متوقع طور پر دیورایا اس پر حملہ کریگا۔ اور خصوصًا ایسے وقت جبکہ فوج بیماری سے پریشان ہو۔ اور اس کے سردار اس کو چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ مسلمانوں کے لئے جو ابتک ہمیشہ فتحیاب ہوتے رہے تھے یہ شکست ناقابل برداشت تھی۔ اگر موت فیروز کا خاتمہ نہ کردیتی تو یہ یقینی تھا کہ وہ وجیانگر پر پھر حملہ کرتا۔ لیکن اس کو مہلت نہ ملی۔ اس کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے اپنے بھائی کی شکست کی تلافی کے لئے وجیانگر پر چڑھائی کردی۔ لیکن اس وقت وجیانگر میں دیورایا نہیں بلکہ اس کا بھائی وجے رایا تخت نشین تھا۔ قسمت نے اگلے دونوں حریفوں کے بھائیوں کو ہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ٹھہرایا۔

ہسٹورک لیانڈ مارکس آف دی دکن کا مصنف لکھتا ہے :- (صفحہ ۱۱۵)

> " احمد شاہ نے تخت نشینی کے فورًا ہی بعد چالیس ہزار سوار لیکر دوآبہ دکن پر حملہ کیا۔ اور دریائے تنگ بھدرا کے شمالی کنارے پر مقیم ہوا۔ وجے رایا جس نے اگلی جنگ میں جس میں فیروز کو شکست ہوئی تھی۔ حصہ لیا تھا۔ سمجھا کہ اس وقت بھی

مسلمانوں کو اسی آسانی سے شکست دی جاسکتی ہے۔ جس طرح پہلی بار دی گئی تھی۔ وہ دس لاکھ پیادہ فوج لیکر ویپایئے تنگ بھدرا کے دوسرے کنارے پر مقیم ہوا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل چالیس دن تک پڑی رہیں چالیسویں دن احمد شاہ نے اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے رائے دی کہ دریا کو عبور کیا جائے۔ جب یہ خبر ہندو لشکر میں پہونچی تو اڑیسہ کا راجہ گجپتی جو وجے رایا کی مدد کے لیئے آیا تھا۔ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ لیکن وجے رایا نے ہمت نہیں ہاری۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کے دو پٹھان سردار عالم خاں اور لودھی خاں نے دس ہزار سواروں کی جمعیت لیکر رات کے وقت دریا کو ایک ایسی جگہ سے عبور کیا۔ جس کی ہندوؤں کو خبر نہ تھی۔ دریا کو عبور کرکے انہوں نے ایک چکردار راستہ سے ہندو فوج کے عقب میں پہونچکر اچانک اس جگہ حملہ کیا۔ جہاں ویاوجے رایا کا کیمپ تھا۔ ویرا وجے رایا کو اس غیر متوقع حملے کا گمان تک نہ تھا۔ کیمپ سے قریب وہ ایک نیشکر کے کھیت کے پاس اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ آرام کر رہا تھا۔ مسلمانوں کے اس حملے کے ساتھ ہی محافظین تو بھاگ گئے۔ اور وجے رایا نے سمجھا کہ مسلمان خاص اسکی ذات پر حملہ کرنے کیلیے آئے ہیں۔ اس لیئے وہ نیشکر کے کھیت میں گھس گیا۔

مسلمانوں نے بالکل اچانک طور پر یہ حملہ کیا تھا۔ اس سے ہندو فوج میں پریشانی پھیل گئی۔ اور ان کے سنبھلنے تک احمد شاہ دریا کو عبور کرکے مقابل ہو گیا جو رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اور وہ فرار ہونا شروع ہو گئے۔

نیشکر کے کھیت کے پاس جو چند مسلمان تھے۔ وہ محافظین کے فرار ہوتے ہی اپنی پیاس بجھانے کیلئے گھوڑوں سے اترے اور نیشکر کاٹنے لگے۔ یہاں وجے رایا جو چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ انہیں مل گیا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ کھیت کا مالک ہے۔ اس لئے کہ اس وقت وہ بالکل سادہ لباس میں تھا۔ انہوں نے نیشکر کا ایک گٹھا اس کے سر پر لاد کر لے چلنے کیلئے کہا۔ دوسری طرف ہندو فوج کے فرار ہو جانے سے مسلمانوں کے لشکر میں فتح کا غلغلہ بلند تھا۔ اس فتح کی نوید سنکر مسلمان نیشکر چھوڑ کر مال غنیمت لوٹنے کیلئے چلے گئے۔ وجے رایا کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اور جس وقت یہ اپنے امراء سے ملا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ منتشر فوج کو جمع کر کے مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے"

یہی مورخ لکھتا ہے :-

" نازوں کے پلے ہوئے راجہ کو کبھی اس قدر وزن اٹھانے کا تجربہ نہیں ہوا تھا نیشکر کے بھاری بوجھ نے اس کے دماغی توازن کو خراب کر دیا تھا۔ اس نے بجائے مقابلہ کرنے کے یہی مناسب سمجھا کہ وجیانگر چلکر وہ قلعہ بند ہو جائے۔ احمد شاہ نے وجیانگر کا محاصرہ کرنے کے بجائے ملک کے اور حصوں میں قتل و غارت شروع کی۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے۔ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا بچہ جو کوئی ہاتھ آیا قتل کر دیا گیا۔ مندروں کو اجاڑ دیا گیا۔ احمد شاہ نے یہ معمول کر لیا کہ جب مقتولوں کی تعداد بیس ہزار تک پہونچتی تو تین دن تک جشن مناتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جس طرح وجے رایا کی جان بچی یہ بھی بال بال بچ گیا۔

ایک دن احمد شاہ اپنے چند ساتھیوں کو لیکر شکار کے لئے جنگل میں گیا۔
اس کے ساتھ اس وقت پانچ سو سپاہی تھے جب یہ شکار کھیل رہا تھا تو اچانک
ہندوؤں کی ایک فوج آگئی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ ان کا دشمن احمد شاہ
شکار کھیل رہا ہے۔ تو انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ محافظین نے نہایت سختی سے
اسکی حفاظت کی۔ انہوں نے لڑتے ہوئے قریب کی ایک چار دیواری میں پناہ
لی۔ جو عام طور پر مویشیوں کو بوقت ضرورت پناہ دینے کیلئے جنگلوں میں بنی
رہتی ہے۔ احمد شاہ نے چار دیواری میں پناہ لی اور اس کے محافظین اس کو
گھیرے ہوئے ہندوؤں کے حملے سے بچا رہے تھے مسلمان کٹ کٹ کر مر رہے تھے
لیکن ہندوؤں کو چار دیواری تک پہونچنے نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ
کے پانچ سو سپاہیوں میں قریب قریب کل رہ گئے۔ اور ہندوؤں نے چار
دیواری تک پہونچکر دیواریں توڑنی شروع کر دیں۔

احمد شاہ صبح شکار کے لئے چلا تھا۔ اور جب اس کی واپسی کا وقت
گذر گیا تو اسلامی لشکر کے ایک سردار عبدالقادر نے سمجھا کہ بادشاہ کسی
آفت میں پھنس گیا ہے۔ اس لئے وہ سواروں کا ایک منتخب دستہ لیکر بادشاہ
کی تلاش میں نکلا۔ اور عین وقت پر وہاں پہونچا جب ہندو چار دیواری کو منہدم
کر رہے تھے۔ عبدالقادر نے آتے ہی ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ ہندو فوج اس
حملہ کی تاب نہ لاکر بھاگی۔ اس طرح احمد شاہ کی جان بچ گئی۔"

قدرت کی ستم ظریفی سمجھئے یا اتفاق۔ اس جنگ میں دونوں حریف آفتوں میں پھنس
کر بچ گئے۔ احمد شاہ نے اس کے بعد وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ جس سے تنگ آکر دیو رائے نے صلح

چاہی اور دوآبہ رائچور پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

اس جنگ کے خاتمہ نے جس طرح فیروز پر اثر ڈالا تھا۔ وجے رایا پر بھی وہی اثر ڈالا۔ ادہر احمد شاہ کی واپسی ہوی۔ اور ادھر وجے رایا انتقال کر گیا۔ اس کے عہد کے پورے ڈیڑھ سال اسی جنگ میں گذر گئے۔ اس کے بعد گیارہ سال تک ہندوؤں کو دوآبہ رائچور کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ احمد شاہ نے اس وقت وہ تمام خراج وصول کیا جو تغلق کے زمانے کے بعد سے ہندوؤں نے اب تک مسلمانوں کو ادا نہیں کیا تھا۔ اور آئندہ بھی خراج دینے کا وعدہ لیا گیا۔

دیورایا دوم

۱۴۲۴ء سے ۱۴۴۶ء

(معاصرین :- احمد شاہ ۱۴۲۲ء سے ۱۴۳۵ء علاؤالدین احمد شاہ ثانی ۱۴۳۵ء سے ۱۴۵۸ء)

وجے رایا کی وفات کے بعد اس کا دوسرا بھائی دیورایا دوم تخت نشین ہوا۔ تاریخوں میں اس کو مختلف ناموں سے لکھا گیا ہے۔ اماڈی دیورایا۔ پرنا دیورایا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے عہد کے گیارہ سال بالکل امن سے گذرے۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے رفاہ عام کے لئے کام کئے۔ پائے تخت کو مضبوط بنایا گیا۔ بہت سی نئی عمارتیں اور مندر تعمیر ہوئے۔ فوج کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ تاریخ سیلون مصنفہ ایچ ڈبلیو کارڈنگٹن میں لکھا ہے۔ کہ اس زمانہ میں دیورایا نے سیلون پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔ لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ یہ حملہ جنوبی ہند کے ان ساحلی مقامات پر ہوا تھا۔ جس پر سیلون والے قابض ہو گئے تھے۔

دیورایا کے عہد میں بینڈ ... ان کے ہندوؤں نے بغاوت کی جو کچل دی گئی۔

۱۴۳۵ء میں احمد شاہ کی وفات پر علاؤالدین احمد اس کا جانشین ہوا۔ اور اسی سال
دوآبہ رائچور میں اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ ایک تو وجیانگر نے پانچ سال سے خراج بھیجنا
بند کر دیا تھا۔ اور دوسرے اب اس بغاوت نے یہ گمان پیدا کر دیا کہ اس کی تہ میں وجیانگر
والوں کا ہاتھ ہے۔ علاؤالدین نے اپنے چھوٹے بھائی شاہزادہ محمد کو اس بغاوت کے فرو کرنے
کو بھیجا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وجیانگر سے خراج وصول کیا جائے۔ محمد نے بغاوت فرو
کر کے وجیانگر کے علاقوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر دیورایا نے خراج ادا کر دیا
اور مسلمان واپس ہو گئے۔ (بمبئی گزیٹیر)

مسلمانوں کے واپس ہونے کے بعد دیورایا نے اپنے امیروں، مشیروں اور پنڈتوں
کو بلا کر مشورت کی کہ مسلمان کس لئے ہمیشہ ہندوؤں پر جنگ میں غالب آتے ہیں۔ برہمنوں
نے اپنے معمول کے مطابق کہا کہ قدرت نے تیس ہزار سال تک مسلمانوں کی قسمت میں حکومت لکھی
ہے۔ لیکن سرداران فوج نے کہا کہ مسلمانوں کی فتح کا سارا راز ان کی سوار فوج اور ان
کے تیر اندازوں کی قابلیت میں ہے۔ اور جب تک ہندو بھی تیر اندازی میں یہی کمال حاصل نہ
کریں گے۔ اور ان کے گھوڑے بھی اسی قدر تیز رو نہ ہوں گے۔ ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔
دیورایا کو یہ تجویز پسند آگئی۔ اور اس نے اسی وقت حکم دیا کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا
جائے۔ اور انکی عبادت کیلئے پایۂ تخت میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ (میسور گزیٹیر)

مسلمان تو فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن راجہ کے آگے وہ سر نہیں جھکاتے تھے۔ یہ
دیکھ کر دیورایا نے حکم دیا کہ اس کے تخت پر ایک قرآن مجید کا نسخہ رکھا جائے۔ کہ کم از کم
مسلمانوں کا سر اس کی تعظیم کے لئے جھکا جائے۔ مسلمانوں کو ہندو فوج کی اتالیقی پر مقرر
کیا گیا۔ سوار فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔ کہ وہ ہمیشہ عمدہ اور تیز رو گھوڑے

رکھا کریں۔ (میسور گزیٹیر)

سات سال کی پیہم کوشش نے اب دیورایا کو یقین دلا دیا کہ اس کی فوج اب مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس حملہ کی محرک ایک اور بات بھی ہوئی۔ دکن کے مسلمان اپنے شمالی علاقوں میں متواتر دو سال سے جنگ میں مصروف تھے۔ اس لئے دیورایا نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اس نے ۱۴۴۳ء کے آخر میں دوآبہ رائچور پر حملہ کر کے مدگل پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے دونوں بیٹوں کو بنکاپور اور رائچور کے قلعے فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ اور آپ خود فوج لیکر دریائے کرشنا کی جانب بڑھا۔

مورخ ہیگ لکھتا ہے:۔

"علاؤالدین احمد کو جب اس حملے کی خبر پہونچی تو وہ خود فوج لیکر مقابلہ میں آیا دریائے کرشنا پر ایک معمولی جنگ کے بعد ہندو فوج پیچھے ہٹ کر مدگل میں مدافعت کیلئے ٹھہری۔ علاؤالدین نے اپنے جنرل خلف حسن بصری کو رائچور اور بنکاپور پر روانہ کیا۔ اور آپ مدگل طرف بڑھا۔ خلف حسن بصری کی آمد سن کر دیورایا کے دونوں بیٹوں نے رائچور اور بنکاپور کا محاصرہ اٹھا کر باپ سے آکر مل گئے خلف حسن بصری بھی علاؤالدین احمد سے آکر ملا۔ مدگل میں تین جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ دوسری جنگ میں ہندو پسپا ہوئے۔ لیکن تیسری جنگ میں جو پہلی دو جنگوں سے زیادہ خونریز تھی مسلمان کامل طور پر فتح یاب ہوئے۔ دیورایا کا بیٹا جو رائچور کے محاصرہ پر گیا تھا۔ میدان جنگ میں مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی ہندو فرار ہوئے۔ مسلمانوں نے تعاقب شروع کیا۔ اور یہ تعاقب اس تیزی سے ہوا کہ مسلمانوں کے دو سپہ سالار فخرالملک

دہلوی اور اس کا بھائی یہاں تک بڑھتے چلے گئے کہ مدگل کے قلعہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہی داخل ہو گئے۔ ہندوؤں نے انہیں دیکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ دونوں مسلمان سردار جب دیورایا کے آگے پیش کئے گئے۔ تو اس نے حکم دیا کہ انہیں زنجیریں پہنا دی جائیں ''

علاؤالدین احمد کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے دیورایا کو کہلا بھیجا کہ ہر سردار کی قیمت ایک ہزار سوار کے برابر ہے۔ اور ہر ایک کے عوض دس ہزار ہندوؤں کو قتل کیا جائیگا۔ علاؤالدین نے مدگل کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ دیورایا نے محاصرہ کی شدت دیکھ کر صلح طلب کی۔ سالانہ خراج دینے اور دوآبہ رائچور کے خالی کرنے کا وعدہ کیا۔ اور اس نے ان شرائط کی تعمیل بھی کی۔

اس جنگ کے بعد اس کا عہد بالکل امن سے گذرا۔ اسکی وفات ۱۴۴۶ء میں ہوی۔

دیورایا کا عہد کنڑی زبان کی ترقی کیلئے نہایت مشہور ہے۔ اس کے زمانے میں بہت سے نامور شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں مہالنگ دیو، لکنا ڈنڈیسا، کمار بنکمتا بہت مشہور ہوئے ہیں۔ کنڑی نثر میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ چراسا، کی اویاسا، گبیا ملنا وغیرہ اسی زمانے کے مصنف ہیں۔ ملنا اپنی کتاب میں لکھتا ہے:-

'' دیورایا کتابوں کی تصنیف پر بہت سا روپیہ خرچ کرتا تھا۔ وہ خود عالم وفاضل تھا اور عالموں اور شاعروں کا قدر دان تھا ''

دیورایا سیوا مذہب کا معتقد تھا۔ لیکن ہندوؤں کے دوسرے فرقوں سے بھی رواداری برتتا تھا۔ اسی نے پائے تخت میں جین فرقہ کے لئے ایک مندر تعمیر کیا۔ جینیوں کے لئے ملک میں اس وقت تک کوئی مندر نہیں تھا۔ سرنگا پٹم میں جو کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو ایک مرصع طلائی گائے بھی دی تھی۔

مشہور ایرانی سیاح عبدالرزاق اور اطالوی سیاح نکولو اسی کے عہد میں وجیانگر آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے اپنے سفرناموں میں وجیانگر کی مال و دولت، راجہ کے کروفر، شہر کی وسعت اور عظمت وغیرہ ان تمام حالات کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ جن سے اس کی سلطنت کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔

ایرانی سیاح عبدالرزاق لکھتا ہے:۔

"راجہ کی سلطنت سرحد سراندیب سے گلبرگہ تک تھی۔ یعنے راس کماری سے رودِ کرشنا تک۔ ہزاروں ہاتھی بلند قامت مثل پہاڑ کے دیووں کی سی ہیبت ناک شکل کے دکھلائی دیتے تھے۔ گیارہ لاکھ فوج تھی۔ تمام ملک ہندوستان میں اس سے بڑھکر کوئی سلطنت نہ تھی۔ یہاں کا حکمران "رایا" کہلاتا تھا۔ شہر بیجانگر ایسا ہے کہ لاعین رأت ولا اذن سمعت (نہ آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا) اور

اگر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں استو ہمیں است وہمیں است

روئے زمیں پر کوئی شہر اسکے برابر نہ ہوگا۔ اس کی بنیاد ایسی ہے کہ سات گڑھیاں اور سات فصیلیں ایک کے اندر ایک ہیں۔ راجہ کے محل کے پاس چار بازار ہیں۔ جو مثل چوراہے کے چاروں طرف واقع ہیں۔ بجانب شمال راجہ کے محل ستون دار ڈیوڑھی واقع ہے۔ ہر بازار میں بلند محراب دار مکان معہ برآمدے کے ہیں۔ لیکن راجہ کا دربار ہال سب مکانوں سے بلند ہے۔ بازار بے انتہا لمبے اور چوڑے ہیں۔ بازار میں ہر قسم کے بیوپاریوں کی دوکانیں سلسلہ وار ایک

دوسرے کے برابر برابر ہیں۔ جوہری جواہرات سر بازار فروخت کیا کرتے ہیں۔
اس شہر میں عموماً اور محلات میں خصوصاً بہت سی نہریں واقع ہیں۔ راجہ کے ایوان کے بائیں طرف ایک بہت بڑا وسیع اور عالیشان دیوان خانہ ہے۔ جو فی نفسہ ایک عظیم الشان محل ہے۔ اس دیوان خانہ کے سامنے ایک ہال ہے جس کی بلندی قدِ آدم سے زیادہ طول تیس گز اور عرض دس گز ہے۔ اس میں دفتر رکھا جاتا ہے۔ اور اہل عملہ بیٹھتے ہیں۔ رانیاں اور راجہ کی بیبیوں کی تعداد سات سو ہے۔"

اسی ایرانی سیاح عبدالرزاق نے مہانومی کے تہوار کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

"راجۂ بیجانگر نے اپنی ریاست کے تمام امراء و روساء کے نام دعوت کے شقے بھیجے۔ سب لوگ دارالسلطنت میں حاضر ہو گئے۔ امراء کے ہاتھیوں کی تعداد ایک ہزار ہو گی۔ ہر امیر اپنے اپنے ہاتھیوں کو عمدہ انباری اور ہودجوں اور جگمگاتے زیورات اور ہتھیاروں سے سجا کر لایا تھا۔ میدان جہاں میلہ ہوتا تھا۔ بہت عمدگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور تین دن تک برابر بڑی چہل پہل رہی۔ اس میدان میں یہ بڑے بڑے ہاتھی ایسے معلوم دیتے تھے کہ گویا سمندر کی بڑی بڑی اور کالی کالی موجیں لہرا رہی ہیں۔ اور آدمیوں کی ایسی بھیڑ تھی۔ کہ سوائے میدان حشر کے ہونا ناممکن ہے۔ اس وسیع میدان میں سینکڑوں منڈوے اور منڈپ سہ منزلہ، چہار منزلہ اور پانچ منزلہ تک ڈالے گئے تھے۔ ان منڈووں کو اوپر سے نیچے تک مجسم بتوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بعض منڈوے اس میں اس ترکیب سے بنائے گئے تھے۔ کہ ان کا رخ بدلتا رہتا تھا۔ ہر وقت ایک نیا

کرہ یا برآمدہ چکر کھا کر سامنے آجاتا تھا۔ اس میدان کے سامنے ایک محل نو عظیم الشان اور آراستہ منڈوؤں کا بنایا گیا تھا۔ نویں منڈوے میں راجہ کا تخت تھا۔ راجہ کے منڈوے کے مقابل ایک خوبصورت پردے کے پیچھے طوائف مغرق لباس پہنے ناچ رہی تھیں۔ گارو ڑی اور دوسرے بے شمار تماشے اور کرتب والے اپنا اپنا کمال دکھلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہاتھیوں کو خوب سدھایا تھا جو طرح طرح کے تماشے کرتے تھے۔ طلوع آفتاب سے غروب تک تین دن اسی طرح بڑی شان وشوکت کے تماشے رہے۔ آتش بازی، کھیل۔ تماشے ہر قسم کا سامان دلچسپی موجود تھا۔ راجہ ایک بہت بڑے تخت پر برآمد تھا۔ جو سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر بیش بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے ایک مربع گدی رکھی ہوئی تھی۔ جس کے اطراف میں تین قطاریں موتیوں کی ٹکی ہوئی تھیں۔ تین روز تک راجہ اسی گدی پر بیٹھتا تھا“

ملیکارجنا (وجے رایا دوم)

۱۴۴۶ء سے ۱۴۶۷ء

(معاصرین :۔ علاؤالدین احمد بہمنی ۱۴۳۶ء سے ۱۴۵۸ء۔ ہمایوں شاہ بہمنی ۱۴۵۸ء سے ۱۴۶۱ء۔ نظام شاہ بہمنی ۱۴۶۱ء سے ۱۴۶۳ء۔ محمد شاہ دوم بہمنی ۱۴۶۳ء سے ۱۴۸۲ء)

اپنے باپ دیورایا دوم کی وفات کے بعد ملیکارجنا تخت نشین ہوا۔ مورخوں نے اس کو وجے رایا دوم کا خطاب دیا ہے۔ اسکی تخت نشینی کے پہلے ہی سال اڑیسہ کا راجہ گجپتی کپل سیورا نے وجیانگر کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کیا۔ لیکن اس جنگ میں اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سولہ[16]

سال بعد پھر اس نے حملہ کیا۔ اور اس وقت بھی وہ کامیاب نہ ہوسکا۔

ملیکارجنا کا عہد سوائے ان معمولی مہموں کے بالکل امن سے گذرا۔ اس کے عہد کا قابل قدر واقعہ یہ ہے کہ اس نے نذرانہ لینے کی رسم موقوف کر دی۔ تمام ملک میں قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت کے وزراء اور دوسرے عہدہ دار رعایا سے نذرانہ لیتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر اس نذرانہ کیلئے رعیت پر اس قدر ظلم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے ملکوں کو چلی جاتی تھیں۔ ملیکارجنا کے عہد میں اس ظلم وستم میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ مندروں میں عبادت اور تہوار تک بند ہوگئے۔ ملیکارجنا نے ملک کی اس تباہ حالت کو دیکھ کر اس رسم کو سختی سے موقوف کر دیا۔

ملیکارجنا کی اخیر عمر حد درجہ عیاشی و شراب خواری میں بسر ہوی۔ اس کی غفلت کی وجہ سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ اور اسی عیاشی و شراب خواری نے ۱۴۶۷ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔

ویراُپکشا

۱۴۶۷ء سے ۱۴۷۹ء

(معاصرین :- محمد شاہ دوم بہمنی ۱۴۶۳ء سے ۱۴۸۲ء تک)

ملیکارجنا کے بعد اس کا چچا ویراُپکشا تخت نشین ہوا۔ عیاشی اور شرابخواری میں یہ اپنے بھتیجے سے بڑھکر نکلا۔ اس کی تمام زندگی حرم سرا کی عورتوں میں بسر ہوئی۔

راجہ کی اس غفلت و عیاشی سے تمام ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ مختلف راجہ اور سردار اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے۔ پھر اویرن نایک کنچی میں راجہ بن بیٹھا۔ مدورا کے نایک خاندان نے

خراج بھیجنا بند کر دیا۔ ملیبار کے کلیسا خاندان نے آزادی کا دعویٰ کیا۔ اس طرح جنوبی ہند کے ہندوؤں میں پھر ایک بار افتراق پھیل گیا۔ لیکن ویروپکشا نے کچھ توجہ نہیں کی۔ بلکہ اس کا ظلم وستم اور عیاشی وشراب خواری پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

سنہ ۱۴۶۹ء میں ویروپکشا کو معلوم ہوا کہ بھٹکل کے مسلمان تاجروں نے جس قدر گھوڑے درآمد کئے تھے۔ وہ سب کے سب بہمنی سلطان کے ہاتھ فروخت کر دئے ہیں۔ اور اس سال وجیانگر کے لئے کوئی گھوڑا باقی نہیں رہا۔ ان کی اس کارروائی نے ویروپکشا کو اس قدر برافروختہ کیا کہ اس نے یہاں کے تمام مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیدیا۔ اور ان تمام مسلمانوں کو جنہیں دیورایا نے فوج میں ملازم رکھا تھا۔ ملک سے نکالدیا گیا۔ روسی سیاح بیاروس جو اس زمانے میں سیاحت کے لئے وجیانگر آیا ہوا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

"راجہ ویروپکشا کے حکم سے دس ہزار عرب تاجر قتل کر دئے گئے۔ جن عربوں نے بھاگ کر گوا اور عرب میں پناہ لی۔ بچ گئے۔ لیکن ہندوؤں نے گوا کا بھی محاصرہ کر لیا۔"

میسور گزیٹیر کا ہندو مصنف لکھتا ہے :-

"عربوں کا یہ قتل ویروپکشا کی عادت سے بعید نہیں تھا۔"

سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"مسلمانوں کے اس قتل کی خبر جب گلبرگہ میں پہونچی تو بہمنی سلطان کے وزیر ملک التجار محمود گاوان نے گوا پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو ان مظالم سے نجات دلائی۔"

اس کے تین سال بعد ویرو پکشا نے پھر گوا پر مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر یہ حملہ رک گیا۔ لیکن دوسری طرف ۱۳۷۱ء میں مسلمان اس کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کر کے ملک کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں نے ملک تلنگانہ کو فتح کر لیا تھا۔ اور اس طرح وہ تمام اضلاع جن کو آج شمالی سرکار (Northern Circars) کہا جاتا ہے۔ یعنے گنجام، اسحاق پٹن، گوداوری اور کرشنا کے اضلاع مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکے۔ ایک طرف جب ہندو گوا پر فوج کشی کا ارادہ کر رہے تھے۔ تو مشرقی اضلاع میں وجیانگر کے گورنر نرسمہا ان ہندو زمینداروں کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ جو کرشنا اور گوداوری کے اضلاع میں آباد تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے :۔

"یہ نرسنگھ ایک راجہ قوی ہیکل اور عظیم الجثہ تھا۔ اور کثرت مال اور وفور افواج میں موصوف اور ولایت کرناٹک اور تلنگ کے درمیان مقام رکھتا تھا۔ اور سواحل سمندر کے مچھلی پٹن تک اس کے تحت حکومت تھے۔ اکثر اوقات زمینداروں کو جنگ پر مستعد اور آمادہ کر کے اور خود ان کا مددگار ہو کر شاہان بہمنیہ کی سرحد میں شور و غوغا برپا کرتا تھا۔" (صفحہ ۱۱۵ مطبعہ نولکشور)

سلطان محمد شاہ کو جب یہ خبریں پہونچیں تو وہ ان زمینداروں کو سزا دینے کیلئے نکلا۔ اور انہیں مطیع کر کے مچھلی بندر کے قریب دریائے کرشنا کو عبور کر کے کونڈاپور ضلع نلور پر بڑھا یہاں اس کو معلوم ہوا کہ نرسنگھ کے علاوہ کنجی ورم کا راجہ بھی اس سازش کے سرغناؤں میں سے ہے۔ بلکہ یہ تمام آگ اسی کی لگائی ہوئی ہے۔ سلطان محمد نے کنجی ورم کے متعلق دریافت

کیا۔ فرشتہ لکھتا ہے :۔

"سلطان جب کوندپور پہونچا۔ ایک جماعت وہاں کے متوطن نے معروض کیا کہ یہاں سے دس منزل پر ایک بت خانہ ہے کہ کنجی نام رکھتا ہے۔ اور در و دیوار اور سقف اس کے زیور و جواہر سے آراستہ اور لآلی و گوہر نفیسہ سے پیراستہ اور آج تک شاہانِ اسلام نے اس کو نہیں دیکھا۔ بلکہ نام بھی اس کا نہیں سنا۔ سلطان محمد شاہ چھ ہزار سوار خنجر گدار لشکر سے جدا کرکے بطور یلغار اس طرف متوجہ ہوا۔" (صفحہ ۵۱۲۔ مطبوعہ نولکشور)

چنگل پیٹ ڈسٹرکٹ میانول کا مصنف صفحہ ۱۷ پر لکھتا ہے :۔

"بہمنی سلطان نے اس شہر پر قبضہ کرکے اس کو تلوار اور آگ کی نذر کر دیا۔ یہاں کے مشہور مندر کو لوٹ کر تباہ کر دیا گیا۔"

فرشتہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کنجی کا راجہ اس جنگ میں مارا گیا۔ اور سلطان محمد شاہ نے شہر اور بت خانہ پر قبضہ کر لیا۔

فرشتہ نے کنجی ورم کے مندر اور اس کی دولت کے متعلق جو نظم لکھی ہے۔ وہ یہاں دی جاتی ہے :۔

"ہمہ خانہ از گوہر و گنج پُر	نذرین بتاں ہم برآمودہ دُر
بہر یک صنم خانہ ولپذیر	نہ چنداں گہر کاید اندر ضمیر
صنم خانہا جملہ گشتہ خراب	غنیمت چناں کس ندیدہ بخواب
بجز زیور و گوہر و گنج زر	نمی برد کس ہیچ چیزے دگر

محمد شاہ نے کندکور واپس ہو کر اپنے سردار حسن نظام الملک بحری۔ یوسف عادل خاں

اور فخر الملک کو اور مقامات فتح کرنے کیلئے بھیجا۔ انہوں نے اضلاع نلور، چنگل پیٹ، چیتور، گنٹور، کڑپہ اور کرنول کے بہت سے مقامات پر قبضہ کرتے ہوئے پگنڈہ پر چڑھائی کی۔ معمولی محاصرہ کے بعد پگنڈہ بھی فتح ہو گیا۔ لیکن مسلمان ان مقامات میں مستقل طور پر نہیں ٹھہرے۔ بلکہ مقامی پالیگاروں اور راجاؤں سے ادائگی خراج کا عہد لیکر پلٹ گئے۔ ورنہ اگر ایک صوبہ قایم کر دیا جاتا تو جنوب کا یہ حصہ، راس سے لیکر دریائے کرشنا تک اور مغرب میں پگنڈہ تک مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آ جاتا۔ ممکن ہے کہ اس وقت کی سیاست نے محمد شاہ کو اس کی اجازت نہ دی ہو۔

ویروپکشا نے اپنے عہد میں بہت سے نئے نئے ٹکس جاری کئے۔ جس سے رعایا بہت تباہ اور بدظن ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس کے مظالم یہاں تک بڑھ گئے کہ اس کے وزراء اور افسران حکومت کی جان بھی غیر محفوظ ہو گئی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے :۔

> "راجہ ویروپکشا ایک عجیب و غریب واہمہ میں مبتلا تھا۔ وہ اکثر اپنے سرداروں کو اس لئے قتل کر دیتا تھا کہ اس نے انہیں خواب میں اپنے حرم سرا میں آتے ہوئے دیکھا تھا"

اسی راجہ کے عہد میں سیاح بیا روس کے علاوہ روسی سیاح نیکٹن بھی وجیانگر میں آیا ہوا تھا۔

ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو ناقابل برداشت ہو کر مظلوم کو انتقام لینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ویروپکشا کے ظلم و ستم کا بھی یہی انجام ہوا۔ جب وزراء اور امراء نے دیکھا کہ ان کی جانیں سلامت نہیں ہیں۔ تو انہوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ اس سازش کا سرغنہ وہی نرسمہا تھا جو کہ مشرقی اضلاع کا گورنر اور محمد شاہ بہمنی کے مقابلہ میں

شکست کھا چکا تھا۔ اس لئے راجہ کی یہ حالت دیکھ کر مختلف امراء اور سرداروں کو لکھا ۔

"ایک عادل وشفیق حکمران کے نہ ہونے سے تمام ملک تباہ ہو رہا ہے۔ اگر حالت یہی رہی تو عجب نہیں کہ اس سلطنت پر ہمیشہ کے لئے مسلمان قبضہ کرلیں۔ بہتر یہ ہے کہ ویروپکشا کو تخت سے اتار کر کسی دوسرے کو تخت نشین کیا جائے۔"

امراء نے اس تجویز کی تائید کی۔ نرسمہا اس وقت ضلع کنارا کا گورنر تھا۔ وہ فوج لے کر خاموشی سے پایۂ تخت کو آیا۔ اور شاہی محل کا محاصرہ کرلیا۔ ویروپکشا کو جب خبر ہوی تو وہ چور دروازے سے فرار ہوگیا۔ اور اس کے بعد اسکی کوئی خبر نہیں ملی۔ امراء نے اتفاق کرکے نرسمہا کو تخت نشین کیا۔ اس طرح ۱۴۷۹ء میں وجیانگر میں بغیر خونریزی کے ایک خاموش انقلاب رونما ہوا۔

ایک دوسری روایت ہے کہ ویروپکشا کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے نے جب باپ کے مظالم کو حد سے بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کردیا۔ امراء نے اس کو تخت نشین کرنا چاہا۔ لیکن اس نے اس بنا پر انکار کردیا کہ وہ اپنے باپ کا قاتل ہونے کی وجہ سے راجہ بن نہیں سکتا تھا۔ امراء نے ویروپکشا کے دوسرے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔ اس نے اپنے بھائی سے باپ کا انتقام لیا۔ لیکن یہ بھی حد درجہ عیاش نکلا۔ اس کا عہد ۱۴۷۹ء سے شروع ہوکر ۱۴۸۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس سال امراء نے اس کو معزول کرکے نرسمہا کو جس نے ویروپکشا کو معزول کیا تھا، تخت نشین کیا۔

بہر طور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت سنگما خاندان سے نکلکر ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہوگئی۔

اور اگر نرسمہا کے خاندانی حالات دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ تلنگا اور سلووا خاندان سے تھا۔

اگلے صفحات میں جن راجاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سنگما خاندان سے ہیں۔ جس میں حکومت ہری ہر اول سے ۱۳۳۶ء میں شروع ہو کر ویروپکشا کے دوسرے لڑکے پر ۱۴۸۶ء میں ختم ہو گئی۔

(نوٹ:- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۷۹ء سے ۱۴۸۶ء تک نرسمہا بطور ایجنٹ رہا تھا)

نرسمہا۔اول

۱۴۸۶ء۔۱۴۸۹ء

(معاصرین:- یوسف عادل شاہ بیجاپور ۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۰ء۔ احمد نظام شاہ احمد نگر ۱۴۹۰ء سے ۱۵۰۸ء)

نرسمہا خاندان سلوواکا پہلا راجہ تھا جو تخت نشین ہوا۔ نرسمہا کو تخت جن حالات میں ملا تھا۔ پچھلی سطروں میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے آبا و اجداد قدیم زمانہ میں ملک کنارا میں حکومت کرتے تھے۔ اس کی پیدائش عجیب و غریب حالات میں پنا او بلم میں جو دریائے پنار پر اروا کنڈہ اور انت پور کے درمیان ہے ہوئی۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ اولاد سے مایوس ہو کر اس کے ماں باپ نے پنا او بلم کے مندر میں منت مانی تھی۔ اور یہیں اس کی پیدائش ہوئی۔ نرسمہا نہ صرف کنارا کا حاکم تھا۔ بلکہ اس نے وجیانگر کے راجاؤں کے ماتحت مختلف مقامات پر گورنر بھی رہا۔ اور جنگوں میں شریک بھی ہوا تھا۔

اس کی تخت نشینی کے متعلق ہندو مورخین نے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ جو تاریخی صداقت سے بالکل معرا ہیں۔ میسور گزیٹیر کا مصنف ہیودن راؤ اسی زمانہ کی ایک کتاب سلو وابھیا دیم سے یہ روایت نقل کرتا ہے:-

" اس نے رامیشورم تک تمام علاقہ کو فتح کر کے شمال میں دسرنا کے ملک پر چڑھائی کی۔ اور فتوحات حاصل کرتا ہوا ہمالیہ تک پہنچ گیا۔ اور یہاں سے پلٹ کر بنارس

میں تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر خداؤں (بتوں) نے خوش ہو کر اس پر پھول
برسائے۔ اور ملک کے تمام راجہ جو اس موقع پر حاضر تھے۔ انہوں نے اس کو
اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا۔"

یہ کتاب نظم میں نرسمہا کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ شاعر نرسمہا کا درباری شاعر ہو۔ لیکن اس زمانے میں جب تحقیقات کیلئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ اور ناقابلِ انکار تاریخی شواہد موجود ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ میسور گزیٹیر کا ہندو مصنف آنکھ بند کر کے اس پر یقین کر لے۔ گو کہیں کہیں خود ہی اس روایت کے بعض واقعات کو جھٹلایا بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

" یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس روایت میں جس قدر واقعات ہیں۔ سب
جھوٹ ہیں۔ دوسرا کے ملک پر چڑھائی کا قصہ مبالغہ سے خالی نہیں۔ لیکن یہ ایک
واقعہ ہے۔ کہ اسکی تاجپوشی بنارس میں ہوئی۔ ممکن ہے کہ نرسمہا خود بنارس
نہ گیا ہو۔ لیکن اپنی غاصبانہ حکومت کو مذہبی نقطۂ نظر سے جائز ثابت کرنے
کیلئے اپنے نائب کو وہاں بھیجا ہو۔"

جس کسی نے بھی ہندوستان کی تاریخ کو ایک سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ وہ فوراً کہہ اٹھیگا کہ نرسمہا کے درباری شاعر نے صرف اپنے آقا کو خوش کرنے کیلئے اس قدر مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مشرقی شاعر جب مبالغہ پر اتر آتے ہیں تو اسکی کوئی حد نہیں رہتی۔ یہی بات اس نظم میں بھی ہے۔ اور اسی لئے تمام مغربی اور مسلمان مورخین نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وجیا نگر سے متصل دریائے تنگ بھدرا کے اس پار تمام ملک پر مسلمانوں کی بہمنی سلطنت تھی۔ اور مشرق میں اڑیسہ کا راجہ

گنج پتی تھا۔ جو وجیا نگر کا جانی دشمن تھا۔ بہمنی سلطنت سے شمال میں تمام ہندوستان پر خاندان لودھی کی حکومت تھی۔ بنگال میں پٹھان حکومت کر رہے تھے۔ بنارس مسلمانوں کے زیر فرمان تھا۔ نرسمہا بنارس تو کجا بلکہ دریائے تنگ بھدرا کو بھی کبھی عبور کرکے بہمنی حکومت پر حملہ نہیں کر سکا۔ بلکہ اس وقت جب وہ ویروپکشا کو معزول کرکے تخت نشین ہوا تو سارا مشرقی علاقہ مچھلی بندر سے لیکر جنوب میں چنگل پیٹ تک مسلمانوں کے ماتحت تھا۔ یہیں یہاں کے مقامی راجہ اور پالیگار محمد شاہ بہمنی کو خراج دے رہے تھے۔ اس لئے یہ روایت تاریخی شواہد سے بالکل معرا اور صرف شاعرانہ تعلیوں سے بھری ہوئی ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ نرسمہا ایک نہایت تجربہ کار اور عاقل راجہ تھا۔ اس نے تخت نشیں ہوتے ہی فوج پر توجہ کی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے :-

"اس نے عرب سوداگروں سے گھوڑوں کی فرمایش کی۔ انہیں معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ گھوڑے بندرگاہ عدل وم ہرمز سے لائے جاتے تھے۔ جو گھوڑے راستہ میں تلف ہو جاتے تھے۔ ان کی قیمت دُم اور کھال دکھانے پر مل جاتی تھی۔ اس نے گھوڑوں کی قیمت مقرر کر دی تھی۔ تین گھوڑوں کے لئے ایک ہزار طلائی پگوڈا (ایک طلائی سکہ جس کی قیمت ۴½ روپیہ ہوتی ہے) دیئے جاتے تھے"

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

"نرسمہا کی یہ کارروائی بہمنی سلطان کے خلاف تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکے حریف گھوڑے خرید کر سکیں"

نرسمہا نہایت خاموشی سے فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اوراس وقت جب گلبرگہ میں محمد شاہ بہمنی کا ۱۴۸۲ء میں انتقال ہوا۔ اور محمود شاہ دوم کی تخت نشینی سے بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ تو اس نے ان علاقوں پر فوج کشی کی جو اسکی گورنری کے عہد میں جا چکے تھے۔ بہمنی سلطنت نے اپنی اندرونی مشکلات میں مبتلا رہنے کی وجہ ادہر توجہ نہ کی۔ اس لئے نرسمہا نے ان مقامی راجاؤں کو (جو محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کے باجگذار بن گئے تھے) شکست دیکر اس تمام علاقے پر۔ جو دریائے کرشنا سے جنوب میں چنگل پیٹ تک تھا۔ پھر قبضہ کر لیا۔"

سیاح نیونز لکھتا ہے :۔

"نرسمہا نے بسناگر کا راجہ ہو کر انصاف سے حکومت کی۔ اس نے وہ تمام علاقے واپس لے لئے جو گذشتہ عہد میں ہاتھ سے جا چکے تھے۔"

نرسمہا کے ذاتی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت کا عالم تھا۔ اس کے نام سے راماہبودیم کی ایک نظم مشہور ہے۔ جو سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ اس کے زمانے میں بہت سے تلگو زبان کے شاعر گذرے ہیں۔ ان میں پنا ویرا بھدریا نہایت مشہور ہے۔ اس کی وفات ۱۴۸۹ء میں واقع ہوئی۔

نرسمہا دوم

۱۴۸۹ء تا ۱۴۹۳ء

معاصرین :۔ محمد شاہ ثانی بہمنی ۱۴۸۲ء سے ۱۵۱۸ء۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور ۱۴۸۹ء سے

سنہ ۱۵۱۰ء - احمد نظام شاہ احمد نگر سنہ ۱۴۹۰ء سے سنہ ۱۵۱۰ء

نرسمہا اول کی وفات پر اس کا بیٹا نرسمہا دوم تخت نشین ہوا۔ نرسمہا اس وقت نہایت کم عمر تھا۔ اس لئے تمراج جس کا مشہور تاریخی نام نرسا نایک ہے۔ بطور نائب السلطنت حکمرانی کرنے لگا۔ چار سال کے بعد اس نے نرسمہا دوم کو زہر دیکر اس کے چھوٹے بھائی کو جو ابھی شیر خوار تھا۔ تخت نشین کیا۔

چنانچہ سکاٹ لکھتا ہے :-

"تیمراج (نرسا نایک) غاصب سلطنت تھا۔ اس نے وجیانگر کے کمسن راجہ کو زہر دے کرا کے شیر خوار بھائی کو تخت نشین کیا۔ رفتہ رفتہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لیکر سلطنت کا مختار کل بن گیا"

اس شیر خوار بچے کو تخت نشین کرنے کے چھ سال بعد نرسا نایک نے اس کو بھی زہر دیکر مار ڈالا۔ اور سنہ ۱۴۹۰ء میں آپ خود تخت نشین ہوا۔

نیوز لکھتا ہے :-

"نرسا نایک نے سازش کر کے بادشاہ کو بالکل خاموشی سے مروا ڈالا۔ اور لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کہ بادشاہ کہاں ہے اور اس کا کیا ہوا۔ جب بادشاہ لاپتہ ہو گیا تو اس نے خود تخت پر قبضہ کر لیا"

مورخین میں سے بعض پہلی روایت کو صحیح مانتے ہیں اور بعض دوسری کو۔ ہمیں یہاں اس بحث سے سروکار نہیں۔ صرف اس حقیقت کو لیا جاتا ہے کہ نرسا نایک نے سلطنت کے جائز وارث نرسمہا دوم اور اس کے کمسن بھائی کا کسی نہ کسی حیلہ سے خاتمہ کر دیا۔ اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔

اس طرح وجیانگر میں یہ دوسرا انقلاب بغیر کسی خونریزی کے عمل میں آیا۔ اور سلطنت سلوا خاندان سے نکل کر نلوا خاندان میں آگئی۔

نرسانایک کا حال لکھنے سے پہلے تاریخی واقعات کا تسلسل قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مسلمانوں کی بہمنی سلطنت کا حال بھی لکھ دیا جائے۔ کیونکہ نرسانایک کی تخت نشینی کے بعد یہ سلطنت اس کی حریف نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس کے عوض دکن کی دوسری اسلامی سلطنتیں مقابلہ میں آگئی تھیں۔

محمد شاہ بہمنی دوم کی وفات پر گلبرگہ میں امیر بریدسب سے زبردست شخصیت کا مالک بن گیا تھا۔ محمد شاہ بہمنی دوم صرف برائے نام بادشاہ تھا۔ امیر برید نے سیاہ وسفید کا مختار ہو کر اپنی ایک علیحدہ حکومت بریدشاہی کے نام سے بیدر میں ۱۴۸۷ء میں قایم کر لی تھی۔ اس کی اس چیرہ دستی نے دوسرے امراء کو علیحدہ کر دیا۔ اور انہوں نے بھی اپنی اپنی علیحدہ حکومتیں قایم کر لیں۔ اس طرح بہمنی سلطنت کے خاکستر پر نئی سلطنتیں قایم ہونی شروع ہوئیں۔

(۱) بیجاپور میں ترکی امیر یوسف عادل نے اپنی حکومت قایم کر کے ۱۴۸۹ء میں عادل شاہیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔

(۲) اسی سال احمد نگر میں احمد نظام شاہ نے نظام شاہی سلطنت قایم کی۔

(۳) برار میں فتح اللہ عماد نے عماد شاہی خاندان کی حکومت بھی اسی سال قایم کی۔

یہ تینوں سلطنتیں محمد شاہ کی وفات کے آٹھ سال بعد قایم ہوئیں۔ ان سلطنتوں کے قایم ہونے کے بعد بھی بہمنی سلطنت اور چند سال تک قایم رہی۔ لیکن اس کے سلاطین اس قدر کمزور تھے کہ امرائے حکومت جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ چند سال بعد یعنی ۱۵۱۲ء میں امیر قطب الملک نے بھی گولکنڈہ میں اپنی سلطنت قایم کرتے ہوئے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ بہمنی

سلطنت کے سلاطین گلبرگہ میں برائے نام ۱۵۲۵ء تک حکمران رہے۔ اور اس کے بعد یہ حکومت بالکل مٹ گئی۔ اور گلبرگہ پر عادل شاہیوں نے قبضہ کر لیا۔

(نوٹ :۔ اس کتاب میں دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کی تاریخ سے صرف ان واقعات کو لیا گیا ہے۔ جن کا تعلق راجگان وجیانگر اور جنوبی ہند سے ہے۔ ان سلطنتوں میں صرف تین یعنے احمدنگر۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کو ہی وجیانگر یا جنوبی ہند سے تعلق رہا۔ باقی دو دوسری سلطنتوں کو کچھ تعلق نہیں تھا۔)

اگر وجیانگر کے پہلے اور دوسرے انقلاب اور اس کے ساتھ اس سلطنت کی حریف بہمنی سلطنت کے حالات کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں حریف ہندو اور مسلمان اس تمام عرصہ میں اپنے اندرونی خلفشار میں اس قدر گھرے رہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکے۔ محمد شاہ بہمنی کی وفات کے بعد اگر بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا نہ ہوتا تو یہ یقین تھا کہ وجیانگر کے انقلابوں سے فائدہ اٹھا کر وہ جنوبی ہند پر مستقل طور پر قابض ہو جاتی۔ یا وجیانگر میں اگر انقلاب نہ ہوتا تو مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندو دریائے کرشنا کو عبور کر کے دکن پر قبضہ کر لیتے۔ قدرت نے دونوں حریفوں یعنے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ساتھ کمزور کر دیا کہ اس مدت میں ایک دوسرے کے مقابل نہ ہو سکیں۔

جس طرح ہندوؤں کی وجیانگر اور مسلمانوں کی بہمنی سلطنت کے قایم ہونے سے پیشتر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بے تعلق رہے تھے۔ اسی طرح تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا کر چالیس سال کی مہلت دونوں قوموں کو دی کہ پھر نئے سر سے تیار ہو کر میدان میں آئیں۔

انقلاب کے بعد وجیانگر جب سنبھل گیا تو مسلمانوں کی حالت بھی دکن میں سنبھل گئی تھی۔ اور اب ان کے مدمقابل ایک بہمنی سلطنت کے عوض سرحد پر پانچ سلطنتیں قایم ہو گئی تھیں۔ یعنے بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار۔ جن میں اول الذکر تین کو وجیانگر سے بہت زیادہ

تعلق رہا ہے۔ ان اسلامی سلطنتوں کی باہمی رقابت سے ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اوڑیسہ کے راجہ نے شمالی سرکار کے اضلاع گنجام، اسحٰق پٹن، گوداوری اور کرشنا جن پر مسلمانوں کا تسلط تھا۔ دوبارہ قبضہ کرلیا۔ لیکن جنوب میں گو فوراً اسی وقت تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں ہونے والے واقعات نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا۔

خاندان تلووا

نرسا نایک

سنہ ۱۴۹۹ء تا سنہ ۱۵۰۳ء

(معاصرین:۔ محمود شاہ بہمنی ثانی سنہ ۱۴۸۲ء سے سنہ ۱۵۱۸ء۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور سنہ ۱۴۸۹ء سے سنہ ۱۵۱۰ء۔ احمد نظام شاہ سنہ ۱۴۹۰ء سے سنہ ۱۵۱۵ء)

یہ خاندان تلووا کا پہلا راجہ ہے جو سلووا خاندان سے حکومت غصب کرکے تخت نشین ہوا۔ اس کے متعلق دو روایات تو پہلے نقل کی گئی ہیں۔ ایک اور روایت فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

" وجیا نگر کی سلطنت سات سو سال سے ایک ہی خاندان میں چلی آتی تھی۔ اس کے بعد سلووا خاندان میں منتقل ہوگئی۔ اس راجہ (نرسیہا اول) کی وفات پر اس کا کم عمر لڑکا تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا چھوٹا بھائی راجہ بنا۔ لیکن ہیمراج نے جو عرصہ سے شاہی محل میں خاص

اقتدار رکھتا تھا۔ اس راجہ کی زندگی کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔

"نرسا نایک ۱۴۹۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اگرچہ تخت پر اس کا اقتدار ۱۴۹۶ء سے ہی مسلّمہ تھا۔"

نرسا کے عہد میں کسی بیرونی دشمن سے جنگ نہیں ہوی۔ اور نہ ملک کے اندر کوئی بغاوت ہوی۔ اس کے عہد کے دو تلگو شاعر مشہور رہیں۔ جن کا نام نندی ملیا اور گھنٹا سنگیا ہے۔ لیکن اس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۴۹۸ء میں پرتگال والے ہندوستان میں آئے۔ نرسا نایک کی وفات ۱۵۰۳ء میں ہوی۔

ویرا نرسمہا

۱۵۰۳ء تا ۱۵۰۹ء

(معاصرین :۔ محمود شاہ بہمنی ثانی، یوسف عادل شاہ۔ احمد نظام شاہ)

نرسا نایک کی وفات پر اس کا بیٹا جو پہلی رانی کے بطن سے تھا۔ تخت نشین ہوا۔ اس کے چھ سالہ عہد کے متعلق نیونز لکھتا ہے :۔

"یہ ہمیشہ جنگوں میں مصروف رہا۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد ملک میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے راجا اور سردار خود مختار ہو گئے تھے۔ ویرا نرسمہا نے ان پر فوج کشی کرکے انھیں پھر مطیع کرلیا۔"

لیکن میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔

"کوئی عملی ثبوت یا کوئی کتبہ اب تک ایسا نہیں ملا۔ جس سے معلوم ہوتا کہ اس

کا عہد کامیاب تھا ۔ بلکہ اس کے عہد میں کسانوں کا حال اس قدر تباہ تھا کہ انہیں

محصولات ادا کرنے کیلئے اپنی زمینوں کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔"

اسکی وفات ۱۵۰۹ء میں ہوئی ۔ اور تخت پر اس کا بھائی کرشنا دیوا بیٹھا ۔ جس کو ہندو مورخین "کرشنا دیورایا اعظم" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

کرشنا دیوارایا

۱۵۰۹ء تا ۱۵۳۰ء

معاصرین :- بیجاپور ۔ عادل شاہی ۔ یوسف عادل تا ۱۵۱۰ء ۔ اسمٰعیل عادل ۱۵۱۰ء تا ۱۵۳۴ء ۔

گولکنڈہ قطب شاہی ۔ سلطان قلی قطب شاہ ۱۵۱۲ء تا ۱۵۴۳ء

بیدر ۔ امیر علی برید ۱۵۰۴ء ۔ ۱۵۴۲ء

احمد نگر ۔ احمد نظام شاہ ۱۴۹۰ء تا ۱۵۱۰ء ۔ برہان نظام شاہ اول ۱۵۱۰ء تا ۱۵۵۴ء

کرشنا دیوارایا کے بچپن کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا باپ نرسا نایک نے اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے اپنے وزیر تمراج کو حکم دیا کہ کرشنا دیوا کی آنکھیں نکالدی جائیں ۔ کہ ویرا نرسمہا جو خاص رانی کے بطن سے تھا ۔ تخت نشین ہو ۔ لیکن وزیر نے دور اندیشی سے کام لیکر کرشنا دیوا کو چھپا دیا ۔ اور بکری کی دو آنکھیں راجہ کے حضور میں پیش کیں ۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

" اگر اس حکم کی تعمیل ہو جاتی تو جنوبی ہند کی تاریخ ایک ایسے بادشاہ کے عہد سے خالی رہتی ۔ جو سب سے اہم شخصیت کی مالک تھی ۔"

کرشنا دیورایا ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوا تھا ۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۳ سال

کی تھی۔اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھتیجے اور تین سگے بھائیوں کو چندر گیری کے قلعہ میں قید کردیا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ سال تک گذشتہ راجگان وجیانگر کے کارناموں کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ نیونز لکھتا ہے :-

"ان کاغذات میں اس کو نرسمہا اول کا ایک وصیت نامہ ملا جس میں تحریر تھا کہ اسکے جانشین کو چاہئے کہ قلعۂ اودگیری کو اڑیسہ والوں کے قبضہ سے اور قلعۂ رائچور اور مدگل کو مسلمانوں کے تصرف سے نکالکر اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔"

تخت نشینی کے تین سال بعد اس نے میسور پر فوج کشی کرکے سیوا سمندرم اور سرنگاپٹم پر قبضہ کرلیا۔اسی سال کے اخیر میں اودگیری پہ قبضہ کرلیا گیا۔ اودگیری پر حملہ ان مسلسل جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جس نے اسے آئندہ چار سال تک اڑیسہ والوں سے لڑائیوں میں مصروف رکھا۔ ان تمام جنگوں میں یہ مظفر و منصور ہوکر نکلا۔ خلیج بنگالہ تک تمام مشرقی علاقہ اس کے قبضہ میں آگیا۔ دریائے کرشنا کو عبور کرکے اضلاع شمالی سرکار کو پائمال کرتا ہوا وہ سمہاچلم تک پہونچ گیا۔اس جنگ میں تلنگانہ والوں کو سخت شکست ہوئی۔ گو ان کی تائید پر گولکنڈہ کے قطب شاہی مسلمان بھی تھے۔ آخر تنگ آکر پرتاب رودرا دیوا نے صلح مانگی۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ پرتاب رودرا دیوا اپنی بیٹی کی شادی کرشنا دیوا سے کردے۔ اور ان تمام مقبوضات سے دست کش ہوجائے۔ جن پر اس کا قبضہ ہوچکا ہے۔

اس جنگ سے فارغ ہوکر کرشنا دیوا نے تین سال جنوب کی فتوحات میں صرف کئے۔ چدمبرم، ویلور، مدورا، طیبار اور ٹراونکور کے راجہ جو اگلے عہدوں میں آزاد ہوچکے تھے۔ از سرنو باجگذار بنائے گئے۔ اس طرح اب وجیانگر یا کرشنا دیوا کی سلطنت جنوب میں دریائے کرشنا سے لیکر راس کماری تک اور مشرق میں خلیج بنگالہ سے لیکر بحر عرب تک مستحکم ہوگئی۔ دریائے کرشنا سے

شمال میں مشرقی ساحلی ملک اسحق پٹن تک اس کے قبضہ میں آگیا تھا۔

وجیانگر کی سلطنت اس سے پہلے کبھی اس قدر وسیع اور زبردست نہیں ہوئی تھی۔ اسوقت جب ملک کے اندرونی استحکام سے اطمینان ہوگیا تو اس نے دکن کی اسلامی سلطنتوں پر نظر ڈالی۔ مسلمان پہلے سے ایک دوسرے کے حریف تھے۔ اور مسلسل جنگوں میں مصروف تھے۔ کرشنا دیورایا نے مناسب سمجھا کہ انہیں اور کمزور بنا کر ان کے ممالک پر قبضہ کرلے۔ سب سے پہلے اس نے بیجاپور پر توجہ کی۔ جس کے قبضہ میں دریائے کرشنا و تنگ بھدرا کا دوآبہ اور رائچور و مدگل کے قلعے تھے۔ اس کی حکمت عملی برار، بیدر، گولکنڈہ اور احمدنگر کے مسلمان حکمرانوں کو اس جنگ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے :۔

"کرشنا دیورایا نے اس قدر فریب سیاست سے کام لیا۔ کہ برار، بیدر، گولکنڈہ اور احمدنگر کے مسلمان سلاطین نے نہ صرف اس آنے والی جنگ سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کیا۔ بلکہ انہوں نے بیجاپور کے خلاف کرشنا دیوا کی مدد بھی کرنی چاہی۔ ان پانچوں اسلامی حکومتوں میں بیجاپور کی سلطنت سب سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور دوسری چار اسلامی حکومتیں یہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔"

فبروری ۱۵۲۰ء میں کرشنا دیورایا اس قدر کثیر فوج لیکر پایۂ تخت سے نکلا کہ جنوبی ہند نے اس سے پہلے اس قدر قہار فوج نہیں دیکھی تھی۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔ (صفحہ ۱۸۲۴)

"صرف کما نایک کے ہراولی دستہ میں تیس ہزار تیرانداز سوار اور چھ ہزار ہاتھی تھے۔ اس کے پیچھے سیوا سمندرم کے گورنر کے ماتحت پچاس ہزار پیادہ فوج

دو ہزار سوار اور بیس ہاتھی تھے۔ وزیر اعظم کی فوج اسکے علاوہ تھی۔ اس میں ساٹھ ہزار پیادے
ساڑھے تین ہزار سوار اور تیس ہاتھی تھے۔ سپہ سالار فوج اڈپا نایک کے ماتحت ایک لاکھ
پیادہ فوج، پانچ ہزار سوار اور پچاس ہاتھی تھے۔ اسکے بعد صوبہ دار اودگیر کی فوج تھی۔ راج
کمار کی فوج میں اسی ہزار پیادے۔ ڈھائی ہزار سوار اور چالیس ہاتھی تھے۔ یہاں تک
کہ راجہ کے اس ملازم کے کمان میں جو راجہ کو پان بنا کر دیتا تھا۔ پندرہ ہزار
پیادے اور دو سو سوار تھے۔ خاص راجہ کرشنا دیوا کے ماتحت چھ ہزار سوار
چالیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی تھے۔ راجہ کی یہ فوج ان جنگ آزما
سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جنہوں نے گذشتہ جنگوں میں ناموری حاصل کی تھی۔ راستہ
میں بکاپور وغیرہ کے سردار بھی آ کر مل گئے۔

نیونز لکھتا ہے:-

"اس لشکر میں ساڑھے پانچ سو ہاتھیوں کے علاوہ صرف جنگی سپاہیوں
کی تعداد سات لاکھ چھتیس ہزار تھی۔ ان کے ساتھ پرتگالی سپاہی بھی تھے۔
جنہیں کرشنا دیورایا نے گوا سے طلب کیا تھا۔ پرتگالی فوج کی کمان فگریڈو
کے ہاتھ میں تھی۔

(نوٹ:- معلوم ہوتا ہے کہ یورپین اقوام میں سے اہل پرتگال نے سب سے اول کرشنا دیورایا
کے عہد میں ہندوستانیوں کی جنگ میں حصہ لیا ہے۔)

دیورایا کے کیمپ کے متعلق یہی سیاح لکھتا ہے:-

"میں یہاں ان دھوبیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ جو اس کیمپ میں بے شمار
تھے۔ اور نہ میں ان ناچنے والیوں کا ذکر کرونگا۔ جو بیس ہزار کی تعداد میں

سپاہیوں کا دل لبھانے کیلئے موجود تھیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کیمپ میں بار برداری کا کس قدر سامان ہوگا۔ کیمپ کے آگے آگے دش سے بارہ ہزار بہشتی گذرنے والی فوج کو پانی پلانے کیلئے راستہ میں کھڑے رہتے تھے۔ اوراسی قدر بہشتی کیمپ میں موجود تھے۔ اس تمام مجمع سے آگے آگے کوئی تین چار فرسنگ کے فاصلہ پر پچاس ہزار سپاہی بطور ہراولی دستہ کے دشمن کی جستجو پر مامور تھے۔ ان کے دونوں بازوؤں پر دو ہزار سوار تھے۔ جو تیر و کمان لیئے ہوئے انکی حفاظت کرتے تھے۔ کیمپ میں ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ہیرے جواہر بھی ملتے تھے۔"

مورخ بھٹاچاری لکھتا ہے :-

"کہ یہ جنگی کیمپ نہیں تھا۔ بلکہ ایک نہایت عالیشان شہر معلوم ہوتا ہے۔ جس میں ہر قسم کی ضروریات ملتی تھیں۔ یہاں تک کہ تفریح کے لیئے بیس ہزار رقاصہ عورتیں بھی تھیں۔"

مورخ ہیگ لکھتا ہے :-

"یہ فوج وبیانگر سے نکل کر تین ماہ کے سفر کے بعد رائچور کے قریب ملی آباد میں ٹھہری۔ جب یہاں تمام جنگی انتظامات مکمل ہو گئے۔ تو رائچور کا محاصرہ کر لیا گیا۔"

قلعہ کی محصور اسلامی فوج کے پاس ڈیڑھ سو بھاری توپیں تھیں۔ اور اس فوج نے تین ماہ تک نہایت کامیابی سے مدافعت کی۔ تیسرے ماہ کے اخیر میں معلوم ہوا کہ اسمٰعیل عادل شاہ والئی بیجاپور مدد کیلئے آرہا ہے۔ اسمٰعیل عادل کے ماتحت ایک لاکھ بیس ہزار پیادے

اٹھارہ ہزار سوار اور ایک سو پچاس ہاتھی تھے۔ بیجا پور کی فوج دریائے کرشنا کے شمالی ساحل پر آکر ٹھہری۔

مورخ ہیگ لکھتا ہے:-

"ہندوؤں کی اس قدر کثیر فوج دیکھ کر اسماعیل عادل نے واپس ہونا چاہا۔ کہ کسی دوسرے بہترین موقع پر ان سے لڑے۔ لیکن اس کے سرداروں نے کہا کہ اس قدر فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک مسلمان بادشاہ کے یہ شایانِ شان نہیں کہ بغیر مقابلہ کئے واپس چلے جائے۔ لیکن اسماعیل آمادہ نہیں ہوا۔ مگر اتفاق سے ایک شام کو جب وہ شراب کے نشہ میں مخمور تھا۔ تو ہاتھی پر سوار ہو کر ہندو فوج کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھکر کوئی ۲ دو ہزار مسلمان سپاہی بادشاہ کے ساتھ ہو گئے۔ ابھی بمشکل سے دریا کے پار ہوئے تھے۔ کہ ہندوؤں کے ۳۰ تیس ہزار سوار اور ۲ دو لاکھ پیادہ فوج نے جو دریا کی حفاظت پر متعین تھی۔ ان پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان یا تو سب کے سب مارے گئے۔ یا جو واپس پلٹے دریا میں غرق ہو گئے۔ اسماعیل عادل بڑی مشکل سے واپس ہوا۔ اور اس وقت اس کے ساتھ جب وہ اپنی کیمپ میں پہونچا تو صرف سات سوار باقی تھے۔"

اسماعیل نے یہاں اپنے امراء سے مشاورت کی۔ اسد خاں لاری نے کہا کہ بیجا پور واپس ہو کر برہان نظام شاہ والئ احمد نگر سے اتحاد کر لیا جائے۔ اور اس کے بعد اپنے اصلی دشمن امیر برید سے بدلہ لیا جائے۔ جس نے ہندوؤں کو اس جنگ پر آمادہ کیا ہے۔ اسماعیل نے اس وقت قسم کھائی کہ جب تک رائچور اور مدگل واپس نہ ملے۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیگا۔

نیونز اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے:-

"دیورایا کی اس قدر کثیر فوج دیکھ کر اسماعیل عادل نے پہلے پہل دریا کو عبور کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ لیکن بعد میں چند جنگ جُو سرداروں کی تجویز پر دریا کو عبور کرکے ساحل پر خیمہ زن ہوا۔ اسماعیل کی آمد کی خبر سنکر دیورایا نے اپنی فوج کو سات حصوں میں تقسیم کرکے ہفتہ کے دن مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں دیورایا نے اپنی جنگی قابلیت کا اظہار حیرت ناک طور پر کیا۔ یہاں تک کہ مسلمان قریب قریب سب ہی مارے گئے۔ یہ حالت دیکھکر اسد خاں نے بادشاہ سے کہا کہ اگر جان عزیز ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔ چنانچہ بادشاہ کو لیکر وہ نہایت مشکل سے دریا کے پار پہونچا۔"

اسلامی کیمپ کو لوٹ لیا گیا۔ دیورایا کو علاوہ باربرداری اور دوسرے جنگی سامان کے چار ہزار عربی گھوڑے سو ہاتھی اور چار سو بھاری توپیں اور نو سو گاڑیاں ملیں۔ میدان جنگ میں جب مسلمان مقتولوں کو دیکھا گیا تو ان میں مسلمانوں کے کئی ایک نامی سرداروں کی لاشیں تھیں۔ اسیران جنگ میں پانچ سردار بھی تھے۔ جن میں ایک صلابت خاں نامی سردار بھی تھا۔ جو زخموں سے بالکل چور چور تھا۔"

صلابت خاں کے متعلق نیونز کے حوالے سے سیول اپنی تاریخ فرگاٹن ایمپائر کے صفحہ ۲۴۲ پر لکھتا ہے:۔

"صلابت خاں اسمٰعیل عادل کا سپہ سالار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اسلامی فوج شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ تو اپنے پانچ سو پرتگالی جوانوں کو لیکر اس کو روکنا چاہا۔ لیکن ہندوؤں کا حملہ اس قدر زبردست تھا کہ صلابت خاں کی کچھ پیش نہیں گئی۔

یہ دیکھکر صلابت خاں نے موت کو شکست پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے پانچ سو پرتگالی سواروں کو لے کر اس بہادری سے ہندوؤں پر حملہ کیا کہ جدہر نظر اٹھتی تھی۔ ادہر صلابت خاں ہی نظر آتا تھا۔ صلابت خاں بڑھتے بڑھتے دیورایا کے خاص محافظ دستہ تک پہونچ گیا۔ یہاں صلابت خان کا گھوڑا مارا گیا۔ پرتگال والوں نے یہ دیکھ کر اس قدر کثیر تعداد میں ہندوؤں کا قتل کر کے اسکے پاس پہونچے کہ ہندو فوج کے درمیان ایک راستہ بن گیا تھا۔ یہاں انہوں نے ایک دوسرا گھوڑا صلابت خاں کو فراہم کیا۔ صلابت خان پھر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑوں کے گلہ میں کوئی شیر آ گیا ہے۔ پرتگالی سپاہی، اور صلابت خاں اخیر وقت تک لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام پرتگالی مارے گئے اور صلابت خاں زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا"

(نوٹ :- معلوم ہوتا ہے کہ پرتگالی بھاڑے کے ٹٹو تھے۔ جو دونوں حریفوں کو مدد دے رہے تھے۔ اس قسم کا کرایہ کی فوج کو انگریزی میں مرسینری سولجرس (Mercinary Soldiers) کہا جاتا ہے کرایہ کے سپاہی یورپ میں رواجاً ہوتے تھے۔ اہل پرتگال نے سرزمین ہند پر بھی یہی رواج شروع کر دیا)

جنگ کا نتیجہ فیصلہ کن نکلا۔ اس جنگ کے بعد ہندوؤں نے رائچور کا اور سختی سے محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے بھی امکان بھر کوشش کی۔ لیکن سپہ سالار کے مارے جانے پر انہوں نے ہندوؤں کو قلعہ سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مدگل کا قلعہ بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گیا۔ رائچور اور مدگل کے قلعوں کو فتح کرنے میں پرتگالی فوج اور ان کے سردار فگریڈو نے بہت کارہائے نمایاں دکھائے۔

اس فتح سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اورانہوں نے کرشنا دیوا کی صلاح دی۔ کہ مسلمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے بیجاپور پر چڑھائی کرے۔ لیکن کرشنا دیوا نے دریائے کرشنا کو عبور کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اس جنگ کے فیصلہ کے ساتھ دوآبہ رائچور کی قسمت کا فیصلہ بھی دس سال کے لئے ہو گیا۔ یعنے مسلمان دس سال تک پھرادھر کا رخ نہیں کر سکے۔

کرشنا دیوا نے اس جنگ سے چند سال پیشتر اپنی ایک معشوقہ ناگلا کے نام پر ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ رائچور اور مدگل کی فتح کے بعد کرشنا دیوا اس نئے شہر میں پہونچا۔ یہاں اسمٰعیل عادل کے سفیر نے آکر باریابی چاہی۔ دیورایا نے ایک مہینے بعد اس کو باریابی بخشی۔ سفیر نے اپنے سلطان کی جانب سے کہا کہ " دونوں سلطنتوں کے درمیان جو اتحاد عرصۂ درازسے چلاآتا تھا۔ اس کو دیورایا نے توڑتے ہوئے بے وجہ بیجاپور کے علاقوں پر حملہ کرکے انہیں اجاڑ دیا ہے "۔

اسمٰعیل نے اپنے سفیر کے ذریعہ یہ بھی درخواست کی تھی کہ " مفتوحہ علاقہ اور تمام مال غنیمت واپس کر دیا جائے "۔ دیورایا نے جواب دیا " اسمٰعیل کے تمام مطالبات کو وہ منظور کرنے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ اسمٰعیل آکر اس کے پاؤں چومے "۔ سفیر یہ سن کر پلٹ گیا۔ اسمٰعیل عادل نے اس کا نہایت سختی سے جواب دیا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ " تلوار اس کا فیصلہ کریگی "۔ لیکن ہندو مورخ لکھتے ہیں کہ " اسماعیل عادل نے دوبارہ سفیر سے کہلا بھیجا کہ وہ دیورایا کے پاؤں چومنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن وہ کس منہ سے پھر اپنے پایۂ تخت کو جاکر اپنی فوج اور رعایا کو منہ دکھا سکتا ہے "؟

(نوٹ :۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اسماعیل عادل ہزیمت خوردہ تھا۔ اور اس نے اپنے علاقہ کی واپسی کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن یہ بات کہ وہ کرشنا دیورایا کے پاؤں چومنے کیلئے آمادگی ظاہر کی۔ ایک مسلمان کی اسلامی

غیرت کے منافی ہے۔ اسماعیل کی غیرت کا ثبوت نیوز اور دوسرے مورخین کی تحریروں سے ملتا ہے۔ اس نے رائچور اور مدگل واپس لینے کے لئے قسم کھائی تھی کہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیگا۔ ایک شخص جس نے یہ عہد کیا اور نبھایا ہو۔ وہ اس قدر بے غیرت نہیں ہو سکتا۔ اسماعیل کی بہادری کا ثبوت گذشتہ جنگ میں مل چکا ہے۔ کہ کس طرح اس نے مٹھی بھر سپاہ کے ساتھ دریا پار کر کے کرشنا دیورایا کی ٹڈی دل فوج پر حملہ کیا تھا۔ ایک ایسے بہادر اور جوانمرد بادشاہ کو یہ الزام دینا کہ وہ دیورایا کے پاؤں چومنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ہندو مورخین کے تعصب کا ہی ثبوت ہے۔)

یہ جواب سن کر دیورایا بیجاپور پر چڑھا۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کرشنا دیورایا اس وقت تلا بیٹھا تھا کہ اسماعیل کو پکڑ کر یا تو قتل کر دے یا اسیر کر لے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسمٰعیل نے کوئی ترحم آمیز درخواست نہیں کی تھی بلکہ سختی سے مطالبہ کیا تھا) لیکن اسمٰعیل بیجاپور خالی کر کے نکل چکا تھا۔ ہندوؤں نے بیجاپور کو تباہ کر دیا۔ ہیزم کے لئے عمارتوں کو ڈھا دیا گیا۔ مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ ان میں سور کاٹے گئے۔ منبروں کو توڑ کر رکھ دیا گیا۔ قرآن مجید کے نسخے جلا دئے گئے۔ اور پردہ نشین عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ بیجاپور جب تباہ ہو گیا اور پانی کی قلت ہونے لگی تو ہندو فوج یہاں سے مدگل کو پلٹ گئی۔ میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸۵۰ پر لکھتا ہے:۔

"(ہندو) فوج نے عملی طور پر کُل شہر (بیجاپور) کو تباہ کر دیا اور ہیزم کے لئے جس کا ملنا مشکل تھا، تمام گھروں کو ڈھا دیا گیا۔ صرف ایک ہی عمارت محفوظ رہی۔ جو اسماعیل عادل کا محل تھا۔ جس میں کرشنا دیورایا خود اقامت گزین تھا"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندو فوج نے بیجاپور پر کس قسم کی تباہی لائی تھی۔ ہندو

یہاں پھر اس نے اپنے ایک سردار اسد خاں کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اسد خاں کو معلوم تھا کہ صلابت خاں کرشنا دیورایا کی قید میں ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صلابت خاں زندہ رہے۔ اس لئے کہ صلابت خاں، اسمٰعیل عادل کا منظور نظر ہے۔ اس کی زندگی میں اسد خاں کو کامیابی مشکل تھی۔ اس نے دیورایا سے کہا کہ "علی عادل تمام شرائط قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن صلابت خان نے ایک خفیہ خط لکھکر روک رکھا ہے"۔ یہ سن کر دیورایا نے صلابت خان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اسد خاں نے دیورایا سے کہا کہ "اسمٰعیل عادل اور اس کی والدہ ملکۂ جہاں سرحد پر دیورایا سے ملاقات کریں گے"۔ یہ کہہ کر اسد خان واپس ہوا۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں اصل حال معلوم ہونے پر اسمٰعیل اس کو قتل نہ کر دے۔ یہ بلگام کی طرف چلا گیا لیکن جاتے ہوئے اسمٰعیل کو پیغام بھیجا کہ وہ دیورایا کا اعتبار نہ کرے۔

جب وقت مقررہ پر علی عادل اور ملکۂ جہاں سرحد پر نہ پہونچے تو دیورایا کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس نے پھر مملکت بیجاپور پر چڑھائی کی۔ اور اس وقت اس کی فتوحات کا دائرہ گلبرگہ تک پہونچ گیا۔ یہاں عادل خاں سپہ سالار تھا۔ اس نے سختی سے مدافعت کی۔ لیکن جنگ میں مارا گیا۔

ایک ہندو مورخ لکھتا ہے :-

> "دیورایا نے گلبرگہ میں ایک بہمنی شہزادے کو جو قید میں تھا، رہا کر کے تخت نشین کیا"۔

لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں :-

> "گلبرگہ میں گجسری کلیان راؤ کو گورنر مقرر کیا گیا"۔

"تاریخ اموکٹا ملیاڈا" میں تفصیل سے یہ بیان آیا ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ

ہندوؤں نے راستہ بھر تمام مقامات کو اجاڑ دیا۔ مساجد اور دوسرے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی۔

دیورایا اس طرح مظفر و منصور ہو کر گلبرگہ سے اپنے پائے تخت کو نہایت شان و شوکت سے واپس ہوا۔

اس جنگ سے واپسی کے بعد کرشنا دیورایا نے ملیبار پر چڑھائی کرکے سامری کو، جو باغی ہو گیا تھا مطیع کر لیا۔ یہاں سے اس کی فوج جزیرۂ سیلون پر بڑھی اور یہاں کے راجہ نے خراج دینا منظور کر لیا۔

وجیانگر کا یہ انتہائی عروج تھا اور یہی عروج اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سیول اپنی تاریخ "فرگاٹن ایمپائر" کے صفحہ ۱۵۵۔ ۱۵۶ پر لکھتا ہے:۔

"یہ سچ ہے کہ ان فتوحات کا اثر اسماعیل عادل شاہ والیٔ بیجاپور پر نہایت برا پڑا اس کی طاقت اور اس کے گھمنڈ کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ وہ اب اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے دوستی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری طرف ان فتوحات کا اثر یہ ہوا کہ وجیانگر کے راجاؤں میں ایک نیا گھمنڈ اور فخر پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ہمسایہ طاقتوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے غرور نے ان کے ہمسایوں کو ان کا دشمن بنا دیا"

کرشنا دیورایا کے عہد میں باربوسا، پیئز، نیونز وغیرہ سیاح وجیانگر میں آئے تھے اور انہوں نے اس سلطنت کا ذکر اپنے سفرناموں میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

کرشنا دیورایا نے اپنے عہد میں بہت سے مندر تعمیر کئے۔ ان میں سب سے مشہور "فتح گھر" ہے جس کی تعریف فرگوسن نے اپنی کتاب "دھاڑواڑ و میسور میں فن تعمیر" میں کیا ہے۔ اور اس

نے اس تعمیر کو قدیم نینوا کی تعمیرات سے تشبیہ دی ہے۔ وتھل سامی کا مندر بھی جسکی خوبصورتی کی تعریف مسٹر ری نے کی ہے۔ اسی راجہ کی تعمیرات میں سے ہے۔

اس زمانے میں رفاہ عام کے بہت سے کام ہووے ۱۵۲۱ء میں اس نے کوریگال کے پاس دریا پر بند تعمیر کیا۔ اور نہر بسونا اسی کی نکالی ہوئی تھی۔ جو ضلع بلاری کو سیراب کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پرتگالی انجینئر ڈی لا پانٹے کی مدد سے اس نے شہر وجیا نگر میں ایک بہت بڑا تالاب بھی بنوایا۔

نیونز لکھتا ہے کہ کرشنا دیورایا نے بہت سی شادیاں کیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اس کی محبوب ناگلا دیوی تھی۔ جس کے نام پر اس نے شہر ناگلا پور (موجودہ ہوس پیٹ) بسایا۔ اس شہر کی تعریف میں نیونز لکھتا ہے :-

"راجہ نے یہ شہر اس عورت کے نام پر آباد کیا جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔ شہر کے اطراف ایک نہایت خوشنما دیوار تعمیر کی گئی۔ شہر کے اندر سب سے بڑی گلی کے دونوں طرف خوشنما سنگیں عمارتیں تھیں۔ اس کی وسعت چالیس قدم کی تھی۔ کرشنا دیورایا نے اپنے امیروں کو یہاں محلات بنانے کا حکم دیا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی۔ اس شہر کی تجارت سے سرکار کو بیالیس[۴۲] ہزار پگوڈا کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس شہر کے علاوہ ضلع تناولی میں بھی اس نے اپنے نام پر ایک شہر تعمیر کیا۔ جس کا نام "کرشنا راپا سمندرم" ہے۔"

کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ کرشنا دیوا نے ملک کے طول و عرض میں بہت سے مندروں کو معقول جاگیریں دیں۔

سیول اپنی کتاب "فرگاٹن ایمپائر" میں نیونز کے حوالے سے لکھتا ہے :-

"۱۵۲۵ء یا ۱۵۲۶ء میں دیورایا کو معلوم ہوا کہ اسماعیل عادل شاہ والی بیجاپور پھر ایک دفعہ رائچور لینے کی تجویز کر رہا ہے۔ دیورایا اس خبر کے سنتے ہی ایک بڑی فوج لیکر رائچور کی طرف گیا۔ اور اسماعیل کو لکھا کہ "اسماعیل نے دو دفعہ بذات خاص حاضر ہو کر اطاعت کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ابھی تک ایفا نہیں ہوا ہے۔"

اس خط میں اس نے لکھا کہ "وہ عنقریب پھر بیجاپور کی مملکت پر حملہ کریگا"

معلوم نہیں کہ اسماعیل نے اس خط کا کیا جواب دیا۔ لیکن دیورایا بارش کا موسم شروع ہو جانے کی وجہ سے پائے تخت کو واپس چلا گیا۔ اور یہاں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ابھی یہ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ دیورایا بیمار ہو کر ۱۵۳۰ء میں فوت ہو گیا۔"

دیورایا کے عہد میں ملک کی حالت کے بارے میں سیاح پئس لکھتا ہے:-

"تمام ملک میں بالکل امن وامان تھا۔ زمین نہایت سرسبز و شاداب تھی۔ اور ہر جگہ تالاب بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ محصولات سے جملہ آمدنی ۱۲۰ لاکھ پگوڈا ہوتی تھی۔ جس میں نصف راجہ کو دیا جاتا تھا۔ اور باقی نصف فوج پر خرچ ہوتا تھا۔"

نیونز لکھتا ہے:-

"کاشتکاروں کی حالت بالکل تباہ تھی۔ کیونکہ ان پر مالگذاری کا نرخ بہت زیادہ لگا ہوا تھا۔"

تمام ملک کئی حصّوں میں منقسم تھا۔ اور ہر حصہ میں ایک گورنر رہتا تھا۔ وجیانگر کے خراج گذار راجاؤں میں مشہور یہ تھے۔ بنکاپور، گرسپا، برکلور، کلیکٹ اور بھٹکل۔ گورنری کے عہدوں پر زیادہ تر برہمن فائز تھے۔ یہ گورنر فیڈرل (وفاقی) طریق پر راجہ کے ماتحت ہو گئے تھے۔

اوران میں سے ہر ایک اپنی ایک خاص فوج رکھتا تھا۔ ہر گورنر کا ایک نمایندہ پایۂ تخت میں رہکر ایک روزانہ رپورٹ دیتا تھا۔ دسہرہ نہایت شان وشوکت سے منایا جاتا تھا۔ جس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ (نوٹ۔ اس کی تقلید میں میسور میں اب بھی دسہرہ نہایت شان سے منایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ راجگان میسور وجیانگر کے بعد اپنے آپ کو ان کا وارث سمجھتے ہیں۔)

ملک کے مغربی حصے میں سات بڑی بندرگاہیں تھے۔ جن سے مال تجارت کی درآمد ہوتی تھی۔ ان میں بھٹکل سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مشرقی ساحل پر کائل اور دیوی پٹم تھے دیورایا کے زمانے میں تعزیرات جرائم کے متعلق نیونز لکھتا ہے :۔

"چوری کا ثبوت ملتے ہی چور کے ہاتھ اور پاؤں اسی وقت کاٹ دیئے جاتے تھے اگر چوری بڑی ہوتی تو چور کو سولی دیدی جاتی تھی۔ امرا جو باغی ہوجاتے تھے۔ تو ان کے پیٹ میں لکڑی گھسیڑ کر مار دیا جاتا تھا۔ عام لوگوں کو معمولی خطاؤں پر یہی سزا دی جاتی تھی۔ ان کے سر کاٹ کر بازار میں لٹکا ئے جاتے تھے۔ بادشاہ کا حکم ہر شخص کو بے چون وچرا ماننا پڑتا تھا۔ اکثر ڈیول (مبارزت) لڑے جاتے تھے۔ جن میں جیتنے والا ہارنے والے کی تمام املاک پر قابض ہوجاتا تھا بعض اوقات بادشاہ لوگوں کو ہاتھیوں کے آگے بھی ڈال دیتا تھا کہ وہ انہیں پھاڑ دیں۔ برہمن بھاری سزاؤں سے بالکل معاف تھے۔ اور انہیں جرم کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنا معاف کر دیا جاتا تھا"

بادشاہ کو شکار کا شوق بھی تھا۔ اکثر سوَر کا شکار ہوتا تھا۔ اور کتے استعمال کئے جاتے تھے۔

دیورایا خود بھی عالم وشاعر تھا۔ اوراس کے زمانے میں بہت سے مصنف اور شعراگذرے ہیں، جواس کواس زمانے کا راجہ بھوج سے تشبیہ دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے کا سب سے بڑا شاعر الّسانی پدما تھا۔

کرشنا دیورایا سے کتاب راج نیتی منسوب کی جاتی ہے کہ یہی راجہ اس کا مصنف ہے۔ یہ کتاب نظم میں ہے۔اور دراصل ہدایت نامہ راجگان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے ولی عہد کے لئے لکھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہاں دیا جاتا ہے۔جس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کے خیالات کیا تھے۔ اور ملکی سیاست کیا تھی :۔

(۱) دن اور رات محنت کئے جاؤ۔ جو فریادی تمہارے پاس فریاد لائے اسکی داد کو پہونچو

(۲) رعایا سے اس طرح سلوک کرو کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ یہ مت کہو کہ ان کی دعا کس کام کی ہے۔

(۳) قلعوں کی کمان صرف عمدہ تربیت یافتہ برہمنوں کے قبضہ میں رکھی جائے۔ یہی لوگ قلعوں کی محافظت کرسکتے ہیں۔

(۴) کسی شخص کو بڑا رتبہ دیکر بعد میں اس کے رتبہ کو نہ گھٹاؤ۔ اس سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگی۔ اس لئے رتبہ بتدریج بڑھاؤ۔

(۵) کسی برہمن کو ان عہدوں پر مقرر نہ کرو۔ جن کی وجہ سے انہیں اچھوت ذاتوں میں رہنا سہنا پڑے۔ اور انہیں ایسے عہدے بھی نہ دئے جائیں۔ جن کی وجہ سے انہیں دغابازوں اور جھوٹوں اور بدنام لوگوں سے سابقہ پڑے۔ غیر ملکوں میں جہاں کے باشندوں میں نیکی کا عنصر نہیں ہے۔ برہمنوں کو نہ بھیجا جائے۔ اور ایسے عہدے برہمنوں کو نہ دئے جائیں جو کمتر درجے میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۶) جو برہمن اپنے اصلی صفات سے معرا ہوگیا ہو۔ اس کو ملازمت مت دو

(۷) ایک تعلیم یافتہ برہمن کو خاص اپنی درخواست سے ملازمت دینے سے سلطنت کے سات بازو قوی ہوتے ہیں۔ اس کو سیاست اور فلسفہ میں ماہر ہونا چاہئے۔ اور اس کی عمر ۵۰ اور ۷۰ سال کے درمیان ہو۔ اس کو دنیاوی محبت اور جسمانی مرض نہ ہو۔ اور جس کے خاندان نے اسی راجہ کے خاندان میں پہلے ملازمت کی ہو۔

(۸) ایک بادشاہ جو نالائق وزیر کے ماتحت ہو۔ ایسا ہے کہ جیسا ایک شخص جس کے پاس جواہرات ہیں۔ لیکن وہ انہیں استعمال نہیں کر سکتا۔

(۹) ایک شخص کو ایک بڑا کام دینے سے بہتر ہے کہ اس کو بہت سے شخصوں پر تقسیم کر دیا جائے کہ جلد ختم ہو۔

(۱۰) دولت ہی راجہ کیلئے سب کچھ مہیا نہیں کر سکتی۔ اس کیلئے بہترین دوست اور مشیر بھی ہونا ضروری ہیں۔

(۱۱) ایک بھرا ہوا خزانہ اور فوج بادشاہ کو کچھ کام نہیں آ سکتے۔ جب تک اس کی ملازمت میں اچھے اور بااعتبار آدمی نہ ہوں۔

(۱۲) اگرچہ بادشاہ کیلئے چھتری اور اچھوت ذاتوں کی دوستی کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک برہمن ہی ہے جو اسکے اڑے وقت کام آ سکتا ہے۔

(۱۳) خیراتی کاموں کیلئے یعنے مندروں کی املاک کے محاصل وصول کرنے کیلئے برہمن کو مقرر نہ کرو۔

(۱۴) بادشاہ کو ایک کسان کی مثال اختیار کرنی چاہیئے۔ جو زمین کی پہلے حد بندی کر لیتا ہے۔ اور بعد میں گھانس پھوس جو زراعت کے دشمن ہیں۔ دور کرتا

ہے۔اس لئے پہلے زمین کو قبضہ میں لاکر بعد دشمنوں کو بھگانا چاہیئے۔

(۱۵) سرحد پر جو قدیم قومیں ہیں۔ان سے تعرض نہ کرو۔

(۱۶) یروکا لوگوں سے جو بسبب جنگلوں میں ہیں۔ تعرض نہ کرو۔ بلکہ ان کی حدبندی کرو وکہ شہروں میں آنہ سکیں (یروکا ایک جنگلی قوم ہے)

(۱۷) اگر سرحد پر بہت قدیم قوم کے لوگ ہیں۔ تو ان سے نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(۱۸) قدیم قوم کے لوگوں میں کوئی تمہارا مہمان ہو اور اس سے کوئی تقصیر ہوجائے تو نظرانداز کردو۔

(۱۹) اگر تم بازپرس کروگے تو وہ اپنی خطا کو نہیں دیکھے گا۔ بلکہ تمہارا دشمن ہو جائیگا۔

(۲۰) دوسرے بادشاہوں پر غلبہ پانے کیلئے ضروری ہے کہ ان کے سفراء کو خوب انعامات دو۔

(۲۱) گھوڑوں اور ہاتھیوں کی نگہبانی پر امراء کو مت مقرر کرو۔ وہ انہیں ذریعہ تفریح بنالیں گے۔

(۲۲) ایک مجلس میں ایک بڑی شخصیت جب کچھ بیان کرتی ہے۔ تو یہ لازمی بات ہے کہ حسد کرنے والے پہلے اس کی بات پر یقین نہیں کرتے۔

(۲۳) وزراء میں جب شرارت پائی جائے۔ اور انکی وجہ سے سلطنت کے کاموں میں خلل نظر آتا ہو۔ تو ایک نئے طاقتور وزیر کو مقرر کرو۔

(۲۴) خزانہ بھرا ویُر رکھو اور فوج کو اپنا طرفدار بنائے رکھو کہ وزراء کی

شرارت چل نہ سکے۔

(۲۵) اگر غذا میں ایک دانہ بھی کم ہو جائے تو یاد رکھو کھانے والا تم کو برا کہیگا۔

(۲۶) اگر کسی شخص سے برا کام ہوا اور اس سے چشم پوشی کی گئی تو یاد رکھو کہ برے کاموں کی کثرت ہو جائیگی۔

(۲۷) دشمن پر قابو پاکر پھر اس کو معاف کر دوگے تو تمہارا نام خوب چمکیگا۔

(۲۸) آمدنی بڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ زمین بڑھائی جائے۔ اگر زمین کا رقبہ بڑھایا نہیں جاسکتا تو موجودہ زمین کو ہی تالابوں اور نہروں کے ذریعہ زیادہ زرخیز بنانے کی کوشش کرو۔

(۲۹) اس بادشاہ کو ترقی نہیں ہو سکتی جس کے عہدہ دار تو ہوں۔ لیکن رعایا ملک چھوڑ کر جلا وطن ہو رہی ہے۔

(۳۰) ایک بادشاہ کو اپنی آمدنی چار حصوں میں تقسیم کرکے اس طرح استعمال کرنا چاہیئے :-

"ایک حصہ۔ اپنے خاص اخراجات اور تحفے تحائف دینے کے لئے"

دو حصے۔ فوجی ضروریات پر۔

چوتھا حصہ۔ خزانہ کی بھرتی پر۔ کہ دشمن ڈرتے رہیں۔

(۳۱) اگر بادشاہ کی پولیس اصلی مجرم کے عوض دوسرے کو گرفتار کرے تو اس کا الزام بادشاہ پر ہے۔

(۳۲) بادشاہ کو چاہیئے کہ تین چوتھائی معاملہ کو خود اپنی فراست سے پہچانے۔ چوتھا حصہ اسکے دوست اگر سچے ہیں تو اس سے بیان کریں گے۔ جو بادشاہ ایسا

کرتا ہے۔ وہ بے گناہوں کو سزا نہیں دیتا۔ اس سے سلطنت کو استحکام ہوتا ہے۔

(۴۳) ایک بادشاہ کو عیش و راحت میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنا چاہیئے۔ جس طرح بگلا درخت پر سوتے وقت اپنی ایک آنکھ کھلی رکھتا ہے۔

(۴۴) سنیاسی اور جٹا دھاری فقیروں کو نقد انعامات اور زمینیں مت دو ایسا سے ان کے اعتقادات متزلزل ہوجاتے ہیں۔ جب اعتقادات متزلزل ہوجاتے ہیں تو ملک میں قحط، وبائیں اور شیر خواروں کی اموات شروع ہو جاتی ہیں۔

(۴۵) سلطنت کے مجرموں سے کوئی رعایت نہ کرو۔

(۴۶) گو بادشاہ بذات خود کتنا ہی جوانمرد کیوں نہ ہو، اس کو دوسرے جوانمردوں کی بات بھی سننی چاہیئے۔

(۴۷) ایک بادشاہ کو اس طرح حکومت کرنی چاہیئے کہ اس کی بندرگاہوں میں تجارت کی ترقی ہو۔ گھوڑے، ہاتھی، قیمتی جواہرات، خوشبو، صندل اور موتی وغیرہ ہمیشہ ان مقامات پر فروخت ہوتے رہیں۔ بادشاہ کو ان تاجروں کی ذات پات اور اعتقادات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۴۸) جب تک موقع نہ آئے اسوقت تک ایک مجرم کے سامنے اپنا غصہ ظاہر نہ کرو۔

(۴۹) ایک بدترین دشمن کے آگے بادشاہ کو اپنی فوجیں لیکر آہستہ بڑھنا چاہیئے اور جب موقع ملے تو بجلی کی تیزی سے حملہ کرنا چاہیئے۔

(۵۰) جب یہ معلوم ہو کہ حریف کے عہدہ دار اس سے بدگمان ہیں۔ تو ان کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کرو۔ اور جہاں تک ہوسکے ان میں پھوٹ ڈالو۔

(۴۱) اگر تمہاری رعایا کی بددلی کی وجہ سے تخت سے دست برداری کی ضرورت ہو تو آدھا ملک دشمن بادشاہ کے حوالے کر کے اپنا تخت بچا لو۔

(۴۲) ہزار الفاظ کہنے سے بہتر ہے کہ دشمن کو تباہ کر کے ملک میں آزادی سے چلو پھرو

(۴۳) دشمن پر قابو پانے کے لئے سختی سے کام لو۔ اگر کام نہ نکلے تو فریب سے کام لو

(۴۴) ایک بادشاہ میں یہ عادتیں نہیں ہونی چاہئیں :-

(۱) مجرموں کو بغیر تحقیق سزا دینا

(۲) قلعوں کی دیکھ بھال نہ کرنا۔

(۳) دشمن کو خط وکتابت کا موقع نہ دینا۔

(۴) غیر ملکیوں کو جو اعتبار کر کے ملک میں آئیں انہیں تباہ کر دینا۔

(۵) وزیروں سے گہری دوستی رکھنا

(۶) بدخواہوں سے ملے رہنا۔

(۷) وفاداروں کو غیر وفادار سمجھنا۔

(۸) خوشامد کو پسند کرنا

(۹) ایسے آدمیوں کو سزا نہ دینا جو سلطنت کے بھید دوسرے آدمیوں کو بتلا دیتے ہیں۔

(۱۰) اہم معاملات پر توجہ نہ دینا۔

(۱۱) عالموں (لائق ادب لوگوں) کا ادب نہ کرنا۔

(۱۲) کم درجہ اور خراب لوگوں سے ملنا۔

(۱۳) شہوت اور جوئے بازی سے رغبت رکھنا۔"

(۴۵) جب بادشاہ پر تین قسم کی آفتیں نازل ہوں۔ ایک جو دیوتاؤں کی طرف سے ہو دوسری جو آسمان سے نازل ہو۔ اور تیسری جو زمین سے پیدا ہو تو برہمنوں کے ذریعہ خوب خیرات اور قربانی کی جائے۔

(۴۶) ایک بادشاہ کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے بڑے عہدہ دار ایک دوسرے کی سخت مخالف رہیں

(۴۷) بادشاہ کو آپ خود سفارت پر نہ جانا چاہئے بلکہ ایسے شخص کو بھیجنا چاہئے جو عالی صفات رکھتا ہو۔ اور اس کے ساتھ خزانہ، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ ہوں۔ کہ وقت ضرورت نمایش کے ساتھ ساتھ خرچ بھی کر سکے۔ ایسا شخص وہ ہونا چاہئے جو بادشاہ کی ذات سے محبت رکھے، ورنہ ممکن ہے کہ وہ دولت حاصل کرنے کے بعد خود بادشاہ پر پلٹ پڑے۔

(۴۸) اپنے ملک کی سرحد پر گھنے جنگلات کو ترقی دو۔ لیکن ملک کے اندر زمین کو قابل زراعت بناؤ۔

(۴۹) سرحد پر جو سردار متعین ہیں۔ ان سے آشتی کے ساتھ پیش آؤ۔

(۵۰) جو سوداگر تمہارے ملک میں باہر سے آئیں۔ ان کی ہمت افزائی کرو۔ اور انہیں انعامات دو۔

(۵۱) بادشاہ کو غیر ممالک کے سفیروں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہئے۔

(۵۲) ایک بادشاہ کو اس شخص سے خفیہ مشورہ لینا نہ چاہئے۔ جس کی ابھی ابھی نئی عزت افزائی ہوئی ہے۔

(۵۳) وہی بادشاہ آرام کی نیند سوتا ہے۔ جو اپنے قلمرو میں ایسے برہمنوں

کو مقرر کرے جو قابل، جوانمرد اور قدیم خاندان سے ہیں۔

(۵۴) جو روپیہ ہاتھی، گھوڑوں۔ فوج اور برہمنوں اور دیوتاؤں پر اور اپنی شان وشوکت دکھانے پر خرچ ہوتا ہے۔ وہ رائگاں نہیں جاتا۔

(۵۵) اگر ہمالیہ جیسی اونچی دولت بھی مل سکتی ہے تو بادشاہ کو لازم نہیں۔ کہ ملیچھوں (مسلمانوں) کے ملک میں جائے۔ اس کو صرف اپنی فوج ان کے ملک میں بھیجنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ملیچھوں سے موافقت ہو نہیں سکتی۔

(۵۶) بادشاہ کے پاس تین قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ خیر خواہ - وہ جو نہ خیر خواہ ہیں نہ بدخواہ - بدخواہ

(۱) خیر خواہ یہ لوگ ہیں۔ حکیم، طبیب، نجومی، عالم، شاعر، پروہت اور خاندانی پجاری۔

(۲) جو لوگ محاصل وصول کرتے ہیں۔ وہ نہ خیر خواہ ہیں نہ بدخواہ۔

(۳) جو لوگ خزانہ کو دیا ہوا روپیہ پھر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بدخواہ ہیں۔

(۵۷) شاہی انعامات کے مستحق صرف برہمن ہیں۔ یہ روپیہ ان کی حفاظت پر خرچ کرنا چاہیئے۔

(۵۸) مار کے خوف سے ہی عورت اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے۔

(۵۹) ہفتہ کے سات دن ہیں اور ہر دن کوئی نہ کوئی قیمتی پتھر اپنے جسم پر بطور زیور پہنو۔"

کرشنا دیو رایا کی کامیابی کے اسباب میں میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹۵۶

پر لکھتا ہے :-

"(۱) بہترین فوجی تنظیم

(۲) اس کی سیاسی چالیں۔

(۳) اس کی ذاتی وجاہت۔

(۴) اس کی ہمسایہ سلطنتوں میں باہمی رقابت۔"

۱۵۲۴ء میں اس کے وزیر تمراج نے کرشنا دیورایا کے بیٹے کو جو چھ سال کا تھا، زہر دیدیا اس راز کے فاش ہونے پر تمراج کو اندھا کرکے قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ مرگیا۔ تمراج شاید کرشنا دیورایا کے بعد اس کے چھوٹے بھائی یا نرسمہا کے بیٹے کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ اسکی وفات کے وقت اس کی دو بیٹیاں اور ایک صغیر سن بیٹا تھا۔ اس کی دو بیٹیوں کی شادی رام راج اور ترملا سے ہوئی۔ جن کا ذکر بعد میں آئیگا۔ غالباً تمراج کے اس فعل سے اسمٰعیل عادل نے دوبارہ بیجاپور پر چڑھائی کی تجویز کی ہو۔

کرشنا دیورایا کے عہد پر ایک نظر

تاریخی نقطۂ نظر سے کرشنا دیوا کا عہد ایک نہایت کامیاب عہد ہے۔ زمانۂ حال کے بعض ہندو مورخین نے اس کی فتوحات کو دیکھکر اس کو نپولین (Napoleon) سے تشبیہ دی ہے۔ جو کسی طرح مناسب نہیں۔ کہاں نپولین کی فتوحات اور کہاں کرشنا دیوا۔ نپولین نے تمام یوروپ کو نیچا دکھا دیا تھا۔ لیکن دیورایا بیجاپور کی ایک چھوٹی سی سلطنت کو بھی کامل طور پر فتح نہ کرسکا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندو راجاؤں میں یہ پہلا راجہ تھا۔ جس نے اپنی بابتی

سے مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر خود فائدہ اٹھایا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اسی راجہ کے عہد میں وجیانگر کی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہونچی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ انتہائی نقطہ تھا۔ جہاں پہونچکر زوال شروع ہو جاتا ہے۔ گو اس وقت اس کے آثار ظاہر نہیں ہوسے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کرشنا دیورایا میں جنگی قابلیت و فرزانگی موجود تھی۔ لیکن جب فتح حاصل ہو چکی تو اس نے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔ بخلاف اس کے اس نے اپنے حریف کے مذہبی جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اسمٰعیل عادل کو اپنے قدم چومنے کیلئے طلب کرنا اور اس پر اصرار کرنا ایک ایسی فاش غلطی تھی۔ جس نے مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا۔ ایک مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن سوائے خدا کے کسی کے آگے اپنا سر نہیں جھکا سکتا۔ اگر کرشنا دیورایا بیجاپور پر کامل قبضہ کر لیتا تو دکن کے مسلمان جو خود ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوسے تھے، خوش ہو جاتے۔ لیکن اس توہین نے سب کو برگشتہ خاطر کر دیا۔ اور اس پر مزید طرہ یہ ہوا کہ کرشنا دیوا کے جانشینوں نے بھی اس کی ہی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث اس سلطنت پر نہایت جلد زوال آگیا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشنا دیورایا نے جہاں سلطنت کو عروج پر پہنچایا۔ وہاں اپنے جوش اور مذہبی تعصب سے خود اس کے زوال کے اسباب بھی مہیا کر گیا تھا۔

اچھوت رایا

۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۲ء

(معاصرین :۔ اسمٰعیل عادل شاہ ۱۵۳۴ء۔ ابراہیم عادل ۱۵۳۴ء سے ۱۵۵۸ء۔ احمد نگر

برہان نظام شاہ (۱۵۱۰ء تا ۱۵۵۴ء)

کرشنا دیورایا کی وفات پر اس کا سوتیلا بھائی اچھوت رایا تخت نشین ہوا۔ ہندو تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تخت کیلئے وجیانگر میں نزاع ہوا۔ فرشتہ اور نیونز کے بیان سے بھی زیادہ واضح نہیں ہوتا۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"کرشنا دیورایا کی وفات پر اس کی چھوٹی بیٹی تخت کی وارث تھی۔ مقامی زبان کی کتابوں اور کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشنا دیورایا کا ایک چھوٹا بیٹا بھی تھا۔"

کرشنا دیورایا کے متعلق تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کی بارہ رانیاں تھیں۔ جن میں چار سب سے ممتاز تھیں۔ ان میں بڑی رانی ترمل دیوی کی لڑکی سے رام راج کی شادی ہوئی تھی اور دوسری رانی کی لڑکی سے ترمل راج نے شادی کی تھی۔ ان بنے ان رانیوں نے چاہا کہ رام راج بحیثیت بڑا داماد ہونے کے تخت نشین ہو۔ لیکن تیسری رانی نے اپنے بھائی ہوجے ترملا کے بل پر جس کے ساتھ محل کا ایک غلام بھی شامل ہو گیا تھا۔ اپنے شیرخوار بچے کو تخت نشین کرنا چاہا۔ ایک تیسری پارٹی اچھوت رایا کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی۔

اس خانہ جنگی کی خبر جب اسماعیل عادل شاہ کو بیجا پور میں پہونچی تو اس نے ۱۵۳۰ء میں کرشنا دیورایا کی وفات کے تین ماہ بعد دریائے کرشنا کو عبور کر کے رائچور اور مدگل پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح دوآبہ رائچور پھر دس سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس وقت اسماعیل عادل شاہ کی حمایت پر علاؤالدین عماد شاہ والئ بیدر اور امیر برید بھی تھے۔ امیر برید بیجاپور کا باجگذار بن چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجیانگر والوں نے اپنی خانہ جنگی کی وجہ سے رائچور اور مدگل کی مقیم فوج کو کوئی کمک نہیں بھیجی۔ اس لئے تین ماہ کے محاصرہ کے بعد یہ دونوں قلعے مسلمانوں کے ہاتھ آگئے۔ اسمٰعیل عادل دوآبہ رائچور پر قبضہ کرکے بیجاپور کو واپس ہوگیا۔ اس کے بعد ہی اسمٰعیل عادل کا انتقال ہوگیا۔ اور ابراہیم عادل تخت نشین ہوا۔

وجیانگر اس تمام عرصہ میں سازشوں کا گھر بنا رہا۔ یہاں تک کہ ہوجے ترملا اور تیسری رانی نے جو اپنے شیر خوار لڑکے کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل سے مدد مانگی اور اس تائید کے عوض خراج دینا منظور کرلیا۔ ابراہیم عادل نے اس دعوت کو منظور کرلیا ابراہیم عادل کے آنے کی خبر سن کر دوسری دو پارٹیوں نے آپس میں اتحاد کرلیا۔ اور ہوجے ترملا اور تیسری رانی کے مطالبہ کو قبول کرتے ہوئے اس کے شیر خوار لڑکے کی تخت نشینی کو منظور کرلیا گیا۔ اس طرح سمجھوتہ کرنے کے بعد ابراہیم عادل والئی بیجاپور کو جو راستہ میں تھا، لکھدیا گیا کہ وجیانگر میں آپس میں سمجھوتہ ہوچکا ہے۔ اسی سفیر کے ذریعہ یہ بھی درخواست کی گئی کہ ابراہیم عادل وجیانگر آنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ حسب وعدہ اس کو امداد کے عوض جو رقم دینا منظور کی گئی تھی۔ بھیجدی گئی۔ ابراہیم عادل رقم لے کر اُدھر سے اُدھر ہی واپس چلا گیا۔

حقیقت میں یہ ایک نہایت گہری سیاسی چال تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وجیانگر باجگذار بن گیا تو اس ہندو سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائیگا۔ ابراہیم عادل کے واپس جاتے ہی دوسری پارٹیوں نے سازش کرکے وجیانگر پہ فوجی قبضہ کرتے ہوئے محل کا محاصرہ کرلیا۔ مجبور ہوکر ہوجے ترملا نے خودکشی کرلی۔

اب ان دونوں پارٹیوں نے ملکر اچھوت رایا کو تخت نشین کیا۔ اور سلطنت کے

کے نظم ونسق میں اس کے دونوں سالے پداسلو کا ترملا اور چنا سلو کا ترملا کے ساتھ رام راج اور اس کے بھائی ترملا کو بھی حصہ دیا گیا۔ جو پہلی اور دوسری رانی کے داماد تھے۔

نیوزنز لکھتا ہے :-

"ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور کو وجیانگر آنے کی دعوت کسی نے بھی نہیں دی۔ وجیانگر کی خانہ جنگی کی حالت سن کر وہ خود حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ وہ پائے تخت سے ایک منزل پر پہونچ گیا۔ اچھوت رایا اگر چاہتا تو اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ہمت ہار دی۔ ابراہیم عادل کے ماتحت اس وقت صرف بارہ ہزار سوار اور تین ہزار پیدل سپاہ تھی۔ اس نے شہر ناگلا پور پر حملہ کر کے اس کو بالکل تباہ کر دیا۔ اچھوت رایا نے دس لاکھ طلائی پگوڈا اور ایک لاکھ کے جواہرات دیکر صلح کر لی۔ رائچور پر اس کے قبضہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے بعد ابراہیم عادل واپس ہو گیا۔ اسکے واپس ہوتے ہی وجیانگر میں امراء اور رعایا نے رانیوں کو غیرت دلائی کہ ان کی ضد کی وجہ سے وجیانگر کو یہ روز دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر ان تمام ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھوت رایا کو سب نے راجہ تسلیم کر لیا۔ اور سلطنت کے انتظام میں اس کے سالوں کے ساتھ رام راج اور اس کے بھائی ترملا کو بھی حصہ دیا گیا"۔

روایات میں خواہ کس قدر اختلاف ہو۔ لیکن نتیجہ ایک ہی ہے۔ یعنے اچھوت رایا کو سب نے راجہ تسلیم کر لیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اچھوت رایا کے سالے پداسلو کا ترملا اور چنا سلو کا ترملا نے اس قدر ظلم وستم سے کام لیا کہ تمام ملک میں ایک شورش پھیل گئی۔ اور کئی ایک ماتحت سردار اور امراء باغی ہو گئے۔ اسی زمانہ میں اڈیسہ کا راجہ جس کا ملک

کرشنا ویورا یا نے فتح کر لیا تھا۔ حملہ کرکے دریائے کرشنا تک اپنا تمام ملک واپس لے لیا۔ انہیں حالات میں اچھوت رایا کا عہد ۱۵۴۲ء میں ختم ہوگیا۔

سداسیورایا

۱۵۴۲ء – ۱۵۷۰ء

معاصرین :-

ابراہیم عادل شاہ	والی بیجاپور	۱۵۳۵ء	۱۵۵۷ء
علی عادل شاہ	" "	۱۵۵۷ء	۱۵۸۰ء
علی برید	" بیدر	۱۵۴۲ء	۱۵۷۹ء
سلطان قلی قطب شاہ	" گولکنڈہ	۱۵۴۳ء	ــــ
جمشید قطب شاہ	" "	۱۵۴۳ء	۱۵۵۰ء
سبحان قطب شاہ	" "		۱۵۵۰ء
ابراہیم قطب شاہ		۱۵۵۰ء	۱۵۸۰ء
برہان نظام شاہ	" احمد نگر	۱۵۱۸ء	۱۵۵۴ء
حسین نظام شاہ	" "	۱۵۵۴ء	۱۵۶۵ء

اچھوت رایا کی وفات کے وقت ملک کی جو حالت تھی اس کا اندازہ ہوچکا ہے۔ اچھوت رایا کے مرتے ہی امراء نے اس کے سالوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیا۔ اور رام راج اور اس کے بھائی ترملا کی پارٹی برسر اقتدار آگئی۔ انہوں نے سداسیورایا کو جو اچھوت رایا کا سوتیلا بھائی تھا۔ تخت نشین کیا۔

سیاح گوا سپرے کو جو اس زمانے میں وجیا نگر میں تھا۔ لکھتا ہے :-

"اچیوت رایا کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے وینکٹا دری کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کو چھ ماہ بعد قتل کر دیا گیا۔ اور سدا سیو رایا کو تخت نشین کیا گیا۔ لیکن تمام انتظام سلطنت رام راج اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں رہا۔ یہ دونوں کرشنا دیو رایا کے داماد تھے۔"

رام راج نے ملک میں اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ راجہ برائے نام رہ گیا۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں:-

"سدا سیو رایا اس وقت نہایت کمسن تھا۔ اس لئے اس کو برائے نام راجہ بنا کر رام راج نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔"

سدا سیو رایا کو رام راج نے تمام عمر اپنی قید میں رکھا۔ سدا سیو رایا کو سلطنت کے کاموں میں بالکل دخل نہیں تھا۔ سدا سیوا کا نام تاریخ میں صرف اس لئے لکھا گیا ہے کہ رام راج نہایت ہوشیاری سے کام لیکر تمام احکام و فرامین سدا سیو رایا کے نام سے جاری کرتا تھا۔ ورنہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک صرف رام راج ہی تھا۔

رام راج ایک نہایت زبردست سیاسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سلطنت وجیا نگر کی تمام اندرونی کمزوریوں کو دور کر کے اس کو ایک ایسی سطح پر قایم کیا۔ جس کی وجہ سے تمام ملک میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ جنوبی ہند کے ہندو آج بھی رام راج کے عہد کو رعب اور عزت کی سی نگاہ سے دیکھتے اور یاد کرتے ہیں۔

رام راج نے اقتدار حاصل کرتے ہی سب سے پہلے فوجی تنظیم پر توجہ کی۔ رعایا کی مشکلات کو دور کیا۔ اور ایسے احکام جاری ہوئے جن کی وجہ سے شورشیں بالکل دب گئیں۔ تمام باغی سردار ایک ایک کر کے پھر سلطنت کے حلقۂ اطاعت میں آ گئے۔ صرف ایک ٹراونکور باقی رہگیا۔ اچھوت

رایا کے زمانے میں ٹراونکور کے راجہ نے بغاوت کرکے ضلع تناولی پر قبضہ کرلیا تھا۔ ٹراونکور پر چڑھائی کی گئی۔

ریورنڈ ہراس نے اپنی تاریخ "خاندان اراویدو" میں لکھا ہے:-

"ٹراونکور والوں نے حملہ آوروں کو سخت شکست دی۔ لیکن بعد میں وجیانگر والے ان پر غالب آگئے۔ ٹراونکور نے ضلع تناولی کو خالی کرتے ہوئے خراج دینا منظور کرلیا۔"

ملک کے اندرونی انتظام سے فارغ ہوکر رام راج نے اپنی شمالی سرحد پر نظر ڈالی۔ اس زمانے میں دکن کی اسلامی سلطنتوں میں تین سلطنتوں کی سرحدیں وجیانگر کی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ احمدنگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ان تینوں میں آپس میں نااتفاقی تھی۔ اور ہمیشہ ان میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان تینوں میں بیجاپور کی سلطنت سب سے زیادہ زبردست تھی۔ اور یہی سلطنت ہمیشہ وجیانگر کے مقابلہ میں صف آرا ہوتی تھی۔ رام راج نے سب سے پہلے اس کا خاتمہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کو جرأت نہیں ہوئی۔ کہ اکیلا اس سے مقابلہ کرے۔ اس لئے اس نے اپنے خسر کرشنا دیورایا کی تقلید میں ایک ایسی سیاسی روش اختیار کی۔ کہ جس کی وجہ سے تینوں سلطنتیں ایک دوسرے کی پہلے سے زیادہ دشمن بن گئیں۔ اور بیک وقت نہ صرف بیجاپور بلکہ احمدنگر اور گولکنڈہ بھی کمزور ہوگئے۔

رام راج کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلامی سلطنتوں اور خصوصاً بیجاپور کی طاقت کا سارا راز ان کی سوار فوج میں ہے۔ اس لئے اس نے اپنی سوار فوج کو مضبوط اور بیجاپور کی طاقت کو کمزور کرنے کیلئے پرتگال والوں سے ایک معاہدہ کیا۔

(نوٹ:- اس وقت پرتگال والے اپنی بحری طاقت کی وجہ سے ملک کی تمام تجارت سے عربوں کو بے دخل

کرکے اس پر اپنا قبضہ جما رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے بندرگاہ گوا وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔)

پرتگال والوں سے حال ہی میں احمدنگر والوں نے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس لئے رام راج نے پرتگال والوں سے معاہدہ کرنے میں احمدنگر کو بھی شریک کرلیا۔ اس معاہدہ سے اس کو نہ صرف وہ ذریعہ ہاتھ آگیا۔ جس سے بیجاپور کو کمزور کرسکے۔ بلکہ ایک حلیف (احمدنگر) بھی مل گیا۔ جو اس کی مقصد برآری کے لئے نہایت ضروری تھا۔ رام راج نے پرتگال والوں سے جو معاہدہ کیا۔ اس کی شرایط حسب ذیل تھیں :-

(۱) یہ معاہدہ گوا کے گورنر ڈی کاسٹروا اور راجہ سدا سیورایا نے بتاریخ ۱۹ ڈسمبر ۱۵۴۷ء میں طے کیا ہے۔

(۲) فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں۔ کہ ایک فریق کا دوست دوسرے فریق کا بھی دوست، اور ایک فریق کا دشمن دوسرے فریق کا بھی دشمن مانا جائیگا۔ اور جب کبھی ہندوستان بھر میں کسی بادشاہ یا حاکم سے جنگ کی ضرورت پڑجائے تو ایک فریق دوسرے فریق کی مدد کریگا۔ نظام شاہ والی احمدنگر کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے

(۳) بندرگاہ گوا میں جتنے گھوڑے عرب یا فارس سے اتریں۔ گورنر گوا کا فرض ہوگا۔ کہ وجیانگر کے راجہ کو مناسب وقفوں کے ساتھ اطلاع دیکر تمام گھوڑے اس کے لئے بہ ادائے قیمت خرید کرکے بھجوا دے۔ ہرگز کوئی گھوڑا بھی سلطنت بیجاپور کو نہ بھیجا جائے۔

(۴) وجیانگر کا راجہ اپنے ملک کے تمام سوداگروں کو اس امر پر مجبور کریگا کہ وہ اپنے تمام سوداگری کا مال انہیں بندرگاہوں سے روانہ کریں جو پرتگال والوں کے قبضہ میں ہیں۔ کوئی تاجر کو مجاز نہ ہوگا کہ سامان تجارت بیجاپور کے مقبوضہ

بندرگاہوں سے چڑھائے۔

(۵) ، جیانگر کا راجہ اپنے تمام تاجروں کو حکم دیگا کہ آئندہ شورہ اور لوہا بیجاپور کی بندرگاہوں سے نہ خریدیں بلکہ اپنی تمام ضروریات پرتگالی کوٹھیوں سے خریدیں۔

(۶) کپڑے ، تانبہ ، ٹین اور جست کیلئے بھی یہی مذکورہ بالا حکم ہے۔

(۷) ، جیانگر کا راجہ اپنی بندرگاہوں میں مسلمانوں کا کوئی جہاز یا بیڑا آنے نہ دیگا اور اگر اچانک کوئی آجائے تو اس کو گرفتار کرکے گوا بھیجا جائیگا

(۸) دونوں فریق اس کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ عادل شاہ والی بیجاپور سے جنگ کرینگے۔ اور وہ علاقہ جو فتح ہوگا وجیانگر کی ملکیت سمجھا جائیگا۔ اس کے عوض ان تمام مقامات پر جو مغربی گھاٹوں کے مغرب میں اور شمال میں باندے سے لیکر جنوب میں سنٹ کورے تک ہیں ۔ بادشاہ پرتگال کا علاقہ تسلیم کیا جائیگا۔"

(بمبئی گزٹیر صفحہ ۲۰۳۹)

(نوٹ :۔ اس عہدنامہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔ ایک یہ کہ جنوب کے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر جذبہ پایا جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ مغربی قوموں کو ملک میں نہ صرف دخل دہی کا موقع دیا گیا بلکہ ان کی حکومت بھی تسلیم کرلی گئی۔

اس عہدنامہ کے طے ہونے کے بعد رام راج نے بیجاپور پر توجہ کی۔ اس وقت بیجاپور اور احمدنگر میں شہر کلیان کے قبضہ کے متعلق اَن بن تھی۔ احمدنگر سے کسی گذشتہ جنگ میں بیجاپور نے کلیان پر قبضہ کرلیا تھا۔ رام راج نے کلیان کے حصول کیلئے احمدنگر کی تائید کرنے کا وعدہ کرلیا فرشتہ لکھتا ہے :۔

"اس اتحاد کو مضبوط کرکے رام راج نے برہان نظام شاہ والی احمدنگر اور جمشید قطب شاہ والی گولکنڈہ سے سازش کرکے بیجاپور والوں پر حملہ کیا"

ہند وتاریخ "واسو چترپہ" کا مصنف لکھتا ہے :-

"احمدنگر کا سلطان اس سے مدد کا خواہاں ہوا تو اس نے اس کی مدد کی"

۱۵۵۱ء میں دریائے بھیما کے کنارے ایک خونریز معرکہ میں بیجاپور والوں کو شکست ہوئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے یہ دیکھکر اپنے جنرل اسدخاں کے ذریعہ رام راج سے علحدہ صلح کر لی۔ اس صلحنامہ میں برہان نظام شاہ اور جمشید قطب شاہ کو بالکل علحدہ رکھا گیا۔ اس صلحنامہ میں رام راج نے یہ شرط بھی بیجاپور والوں سے منوائی کہ وہ آئندہ کبھی احمدنگر یا گولکنڈہ سے کبھی اتحاد نہ کریں گے اور شہر کلیان کو احمدنگر کے حوالے کر دیا گیا۔

اس جنگ کے تیسرے سال گولکنڈہ اور احمدنگر والوں نے اتحاد کرکے بیجاپور سے جنگ چھیڑ دی۔ متحدہ فوجیں گلبرگہ پر بڑھیں۔ رام راج نے اس وقت بیجاپور کی تائید کی۔ اور اپنے بھائی کو گولکنڈہ پر فوج کشی کے لئے بھیجدیا۔ رام راج کی اس فوج کشی سے گھبرا کر گولکنڈہ والے اپنا پائے تخت بچانے کیلئے واپس ہو گئے۔ جس کی وجہ سے احمدنگر والے بھی اپنے ملک کو واپس ہو گئے۔ گولکنڈہ والوں نے رام راج سے صلح کر لی۔ ان سے اقرار لیا گیا کہ وہ آئندہ کبھی احمدنگر سے اتحاد نہ کریں گے۔

ہند وتاریخ "سیوتارتن" کا مصنف لکھتا ہے :-

"رام راج نے ابراہیم قطب شاہ پر حملہ کرکے اس کو احمدنگر سے قطع تعلقات پر مجبور کیا"

اس کے بعد رام راج نے شہر کلیان کو احمدنگر کے قبضہ سے نکالکر بیجاپور کے حوالے کر دیا

ان دونوں جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تینوں اسلامی سلطنتیں مجبور ہوگئیں کہ ایک دوسرے سے کبھی اتحاد نہ کرسکیں۔ اب اس کے بعد رام راج نے ان سلطنتوں کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ گولکنڈہ میں جمشید قطب شاہ کی وفات پر امراء نے اس کے بیٹے کو تخت نشین کیا۔ لیکن رام راج نے جمشید قطب شاہ کے بھائی ابراہیم قطب شاہ کی حمایت میں گولکنڈہ پر فوج کشی کردی۔ جنگ میں امرائے گولکنڈہ کو شکست ہوی۔ اور ابراہیم قطب شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ہندوتاریخ نرسا بھوپالیہو کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس نے قطب شاہ کو مدد دیکر اس کی سلطنت اسے بحال کردی۔ اس تائید کے عوض ملک کا ایک حصہ رام راج نے حاصل کرلیا"

۱۵۵۸ء میں بیجاپور میں ابراہیم عادل کی وفات ہوگئی۔ اور اس کا بیٹا علی عادل تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کے چچا عبداللہ نے پرتگال والوں کی حمایت لیکر تخت کا دعوی کیا۔ اس تائید کے عوض اس نے سالسٹ اور بردیز کا خطہ پرتگال والوں کے حوالے کردیا۔ پرتگال والوں نے مملکت بیجاپور پر چڑھائی کی۔ علی عادل نے رام راج سے مدد چاہی اور اس کا منہ بولا لڑکا بن گیا۔ رام راج نے ایک زبردست فوج بھیجکر عبداللہ کو شکست دی۔ اور وہ مجبور ہوکر احمدنگر کی طرف فرار ہوگیا۔ جہاں رام راج کے خوف سے احمدنگر والوں نے اسکو گرفتار کرکے گوا کو بھیجدیا۔ اور یہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

اس واقعہ کے دوسرے سال یعنے ۱۵۵۹ء میں علی عادل والئ بیجاپور کی کم سنی اور ناتجربہ کاری کو دیکھکر احمدنگر والوں نے پھر ایک بار شہر کلیان کو حاصل کرنے کیلئے فوج کشی کردی۔ علی عادل بھاگ کر وجیانگر میں پناہ لی۔ رام راج نے اسکی تائید میں احمدنگر پر چسٹرھائی کردی۔ جنگ میں احمدنگر والوں کو شکست ہوی۔ اس تائید کے صلے میں بیجاپور

سے رائچور اور مدگل پر وجیانگر کے مستقل قبضہ کو تسلیم کرا یا گیا۔

ابھی اس واقعہ کو چند سال ہی گذرے تھے۔ کہ احمد نگر کے حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی کا نکاح ابراہیم قطب شاہ والی گولکنڈہ سے کیا۔ اور ان دونوں کی فوجیں پھر شہر کلبان کو حاصل کرنے کے لئے بیجاپور پر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت ان کے ساتھ علی برید والیٔ بیدر اور برہان عماد والی برار بھی شامل تھے۔ بیجاپور کے علی عادل نے یہ دیکھ کر رام راج سے تائید چاہی۔ جنگ میں پھر احمد نگر والوں کو شکست ہوئی۔ ہندو فوج نے دوبارہ احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔ اور اس بدقسمت شہر کی تباہی اور اسلام و مسلمانوں کی توہین میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔

"تاریخ فرشتہ کا مترجم برگس (Bnggo) اپنی کتاب کے جلد سوم کے صفحہ ۴۰۳ پر لکھتا ہے :۔

"ظلم و ستم کی انتہا نہیں رہی۔ مسجدوں میں سور کاٹے گئے۔ گھوڑے باندھے گئے۔ اور گھروں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قرآن مجید کے نسخے لاکر ان کی بے حرمتی کی گئی۔ اور انہیں سر بازار جلایا گیا۔ مسلمان پردہ نشین عورتوں کی دن دھاڑے رستوں میں عصمت دری کی گئی۔ مسجدوں اور دوسرے مذہبی عمارات کو ڈھا دیا گیا"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۲۷ پر لکھتا ہے :۔

" ہندوؤں نے اس موقع سے پھر فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی توہین کی۔ اور ان کی مسجدوں میں گھوڑے باندھے گئے۔ اور جب جلانے کو لکڑی نہ رہی تو مسجدوں کو ڈھا کر لکڑی لی گئی"

حسین نظام نے عاجز ہو کر صلح طلب کی اور وجیانگر میں حاضر ہو کر سر دربار رام راج

کے ہاتھ سے پان کا بیڑا لینا قبول کیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ رام راج کو اپنے سے برتر مانتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں نہ صرف احمدنگر کا بہت سا علاقہ وجیانگر کے قبضہ میں آیا بلکہ بیجاپور سے بھی نائید کے عوض کونڈاپلی کا علاقہ لے لیا گیا۔

رام راج کی اس مذکورۂ بالا پالیسی کی وجہ سے جب دکن کی تینوں اسلامی سلطنتیں ایک ایک کرکے کمزور ہوگئیں اور کسی میں وجیانگر کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اب رام راج نے اپنے مغلوب حریفوں یعنی مسلمانوں کی اسی طرح تحقیر شروع کردی جس طرح کرشنا دیورایا نے اپنے مغلوب حریف اسماعیل عادل کی کی تھی۔

مسلمانوں کا اس طرح عاجز و بے بس ہوجانا ہندو دنیا میں رام راج کے نام کو خوب چمکا دیا۔ اس وقت حقیقت بھی یہی تھی کہ سارے دکن اور جنوبی ہندوستان میں رام راج سے زیادہ زبردست حکمران اور کوئی نہیں تھا۔ وجیانگر اپنے پورے عروج پر تھا۔ مال و دولت کی فراوانی، ملک میں امن و امان، دشمنوں کی عاجزی اور بے بسی نے رام راج کے دماغ کو آسمان ہفتم پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے مسلمان سفیروں کو حکم دیا کہ اس کے دربار میں جب حاضر ہوں تو کھڑے رہیں۔ ان سے نہایت نفرت، حقارت اور غرور سے مخاطب ہوتا تھا۔ جب کبھی سفر میں ساتھ ہوتے تھے تو ان کو پیدل چلنے کا حکم تھا۔

صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ بلکہ مسلمان سلاطین بھی جب دربار میں آتے تھے تو ان سے بھی یہی سلوک کیا جانے لگا۔ اور بات بات میں ان کے مذہب کی توہین ہونے لگی۔ یہاں تک کہ عام ہندو بھی سربازار مسلمانوں اور اسلام کی توہین کرنے لگے۔

رام راج کی اس پالیسی کے متعلق میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۵ - اور ۲۰۶ پر لکھتا ہے :-

" رام راج کا ۲۳ سالہ عہد اور اس کی جنگی پالیسی اور شاطرانہ چالوں نے اس کے نام کو جنوب میں اس قدر چمکا دیا کہ یقیناً وہ اس وقت دریائے نربدا سے نیچے راس کماری تک سب سے زیادہ طاقتور حکمران تھا۔ جس کے نام سے جنوبی ہند کانپتا تھا حقیقت میں رام راج اسوقت جنوبی ہند و دکن کا ڈکٹیٹر تھا۔ جس کے اشاروں پر اس کے ہمسایہ رقصاں رہتے تھے۔ اور یہی ان کی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں اس قدر نخوت پیدا ہوگئی تھی کہ ہر شخص جو اس سے امداد کا طالب ہوا۔ وہ اسی کو دیکھکر اس سے اندرونی طور پر دشمنی کرتا تھا۔ گو ذاتی طور پر ہر ایک اس سے مدد کا خواہاں تھا۔ لیکن اندرونی طور پر اسکی چیرہ دستیوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے حسد کرتے تھے۔

اس (رام راج) نے بیجاپور، احمدنگر اور گولکنڈہ والوں کو ایک دوسرے کے خلاف مدد دی۔ بیدر اور برار والوں نے اسکے ہاتھ سے شکست کھائی۔ اس لئے انہوں نے اتحاد کر لیا۔ ان میں کوئی اس کا دوست باقی نہیں رہا"

رام راج کی پالیسی وقت کی مناسبت سے تھی نہ کہ کسی اصول پر۔ ضرورت کے مطابق اس نے ایک کے خلاف دوسرے کو مدد دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دوستی ان کے نزدیک قابل اعتماد نہیں رہی۔ اس لئے کہ تفریق ڈال کر وہ ہمیشہ اپنا فائدہ ملحوظ رکھتا تھا"

حالات دن بدن بد سے بدتر ہونے شروع ہوئے۔ مسلمانوں اور ان کے مذہب کی توہین کے لئے کوئی کسر باقی نہ رکھی گئی۔ آخر صبر اور مجبوری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ انکی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ جب تک وہ آپس کی خانہ جنگی

کو چھوڑ کر اتفاق نہ کرلیں گے ۔ ان کا پنپنا مشکل ہے ۔ اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے اتفاق کرلیا ۔ اور اس وقت وہ تمام امور جو ان کی آپس کی خانہ جنگی کا باعث بنے ہوئے تھے بالائے طاق رکھدئے گئے ۔ اس آپس کی نااتفاقی کی وجہ نہ صرف سیاسی تھی بلکہ مذہبی بھی ۔

(نوٹ :- دکن کی یہ سلطنتیں بلحاظ عقیدہ سنی اور شیعہ تھیں)

لیکن اس وقت سب کے سب اسلام کے نام پر ایک مرکز پر جمع ہوگئیں ۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس اتفاق کی بنیاد علی عادل شاہ والئ بیجا پور نے رکھی تھی ۔

کلنزی کے مخطوطات کا مصنف ولسن ہند و حوالجات سے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۱۹ – ۲۹۸ پر لکھتا ہے :-

" ایک دن بیجا پور کے سفیر نے رام راج کے دربار میں شکایت کی کہ محل کے ادنےٰ ملازموں کی خوراک کیلئے جو سوّر لائے جاتے ہیں وہ ہمیشہ اسی راستے سے اور اسی وقت لائے جاتے ہیں ۔ جب سفیر دربار کو آتا ہے ۔ اس شکایت کو سن کر رام راج نے جواب میں طنزاً کہا :-

" تم تو مرغ کھاتے ہو جو سوّروں کے پاخانہ سے اناج چنکر کھاتا ہے ۔"

سفیر نے اس کی اطلاع علی عادل کو دی ۔ علی عادل اس مذہبی توہین کو برداشت نہ کرسکا ۔

ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے :-

" آخر کار علی عادل نے طے کرلیا کہ اس (رام راج) کی مغروری کا خاتمہ کردیا جائے اور اس کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے پائمال کردے ۔ اس کی خاطر اس نے اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے اتحاد کی بنیاد ڈالی ۔ اس نے اپنے جنرل کشور خاں کو قطب شاہ والی گولکنڈہ کے پاس بھیجا ۔ جو فوراً اتحاد پر راضی ہوگیا ۔ احمد نگر کا حسین نظام

شاہ شولاپور کے معاملہ کی وجہ سے علی عادل سے اتفاق نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے ابراہیم قطب شاہ نے درمیان میں پڑکر دونوں میں اتحاد کی تجویز کی۔ اس کے لئے اس نے اپنے وزیر مصطفیٰ خاں کو نظام شاہ کے پاس بھیجا۔ مصطفیٰ خان نے نہ صرف اتحاد کرایا بلکہ دونوں خاندانوں (احمدنگر اور بیجاپور) میں شادی بھی کرادیا۔ مصطفیٰ خان نے حسین نظام شاہ سے کہا "جب مسلمانوں کی کل طاقت صرف ایک بہمنی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت تک مسلمانوں اور ہندوؤں میں توازن قایم رہا۔ اور جب مسلمان تقسیم ہو گئے تو انہیں شکستیں اٹھانی پڑیں مصلحت کا تقاضہ یہ ہے۔ کہ تمام دیندار بادشاہ پھر متحد ہوکر آپس میں ایک دوسرے کے صدور جہ دوست بنے رہیں۔ اور اسی صورت میں ایک عام دشمن کے مقابلہ میں انکی حفاظت ہو سکتی ہے وجیانگر کے راجہ نے تمام کرناٹک کے راجاؤں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ انہیں اسلامی ملکوں سے دور کریں۔ اور اس طرح ان لوگوں کو جن کو خدا نے ہماری ضمانت میں دیا ہے۔ بے دینوں کے ظلم وستم سے بچائیں۔ اور ہمارے مساجد و مقدس مقامات ان بے دینوں کی جائے رہائش نہ بنیں۔"

اس تقریر کا اثر حسین نظام شاہ پر نہایت گہرا ہوا۔ اس کو رام راج سے پہلے ہی نفرت تھی اور اس کے ہی مقبوضات اور پائے تخت کو رام راج نے سب سے بڑھکر تباہ کیا تھا۔ اس لئے حسین نظام شاہ نے اس اتحاد میں شرکت کرلی اور اس اتحاد کو مضبوط بنانے کیلئے مصطفیٰ خان کی رائے سے اپنی بیٹی چاند بی بی (دکن (احمدنگر) کی مشہور ملکہ جس نے بعد میں مغلوں کے مقابلہ میں داد شجاعت دی تھی) کی شادی علی عادل سے کردی۔ اور شولاپور کا قلعہ جو ہمیشہ وجہ نزاع

بنا رہا تھا۔ اس کے جہیز میں علی عادل کو دیدیا گیا۔ دوسری طرف علی عادل نے اپنی بہن فلاح بی بی کی شادی حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے سے کردی۔ اور اس کے جہیز میں شہر کلیاں دیدیا گیا۔ پرتگالی مورخ کوٹو لکھتا ہے :-

" اس اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی۔ اس اتحاد میں علی برید بھی شامل ہو گیا "

" وجیانگر کی تباہی " (Destruction of Vijaynagar) جو ایک مرہٹی تاریخ ہے۔ اس کا مصنف لکھتا ہے :-

" اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی۔ علی عادل اس اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کرتا رہا۔ اس لئے کہ رام راج نے بہت سے موقعوں پر اسکی مدد کی تھی۔ آخر حسین نظام نے علی عادل سے درخواست کی کہ " کم از کم اسکی فوجوں کو وہ اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دے "۔ علی عادل نے اس سے بھی انکار کیا۔ لیکن دوسری طرف اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رام راج سے مدگل اور رائچور کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رام راج نے علی عادل کے سفیر کو سر دربار ذلیل کر کے باہر نکال دیا۔ یہ خبر جب علی عادل کو پہونچی تو اس نے اتحاد میں شرکت کر لی۔ اور جنگ کی تیاری شروع کر دی گئی "

میسور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف جنگ کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۹۱ پر لکھتا ہے :-

(۱) احمدنگر میں رام راج کی ہندو فوج کا ظلم وستم اور اسلام کی توہین خاصکر ان مقامات پر جہاں جہاں ہندو فوج کا گذر ہوا۔

(۲) مسلمانوں کے مذہبی اور دوسرے عمارات اور ملک کی تباہی ۔

(۳) رام راج کا برتاؤ۔ اسلامی سلاطین اور ان کے سفیروں کے ساتھ اتنا اس سے اس طرح برتاؤ کیا جاتا تھا کہ ان کو دربار میں بیٹھنے کی تک اجازت نہیں تھی۔ ان سے انتہائی نفرت، حقارت اور غرور سے خطاب کیا جاتا تھا۔ جب کبھی یہ سفر میں ساتھ ہوتے تھے تو ان کو پیدل چلنے کا حکم تھا۔

(۴) رام راج کے فوجی افسر اور سپاہیوں کا مسلمانوں کے ساتھ پُرغرور اور ذلیل برتاؤ (خصوصاً احمدنگر میں)

(۵) جب کبھی موقع ملتا تو مسلمان سلطنتوں کا ایک نہ ایک حصہ غصب کر لیا جاتا تھا خصوصاً بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے "

یہ وہ اسباب تھے جن سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اتفاق کر لیا۔ خواہ بنیاد کسی نے رکھی ہو۔ اس اتفاق کے بعد وہ جنگ کی تیاری کرنے لگے۔

مورخ ہیگ اپنی تاریخ کے صفحہ ۱۲۹ پر لکھتا ہے:۔

" اس اتفاق کے بعد علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور نے رام راج سے دوآبہ رائچور اور ضلع ہپ گری کا مطالبہ کیا۔ جن پر رام راج نے قبضہ کر لیا تھا۔ رام راج نے بیجاپور کے سفیر کو سرِ دربار ذلیل کر کے شہر سے باہر نکالدیا۔ یہ خبر جب اسلامی پایۂ تختوں میں پہونچی، تو حسین نظام شاہ والی احمدنگر، ابراہیم قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید شاہ والیٔ بیدر اپنی اپنی فوج لیکر علی عادل شاہ سے آکر مل گئے۔ اور مسلمانوں کی یہ متحدہ فوج ۲۵ر ڈسمبر ۱۵۶۴ء میں کرسمس کے دن بیجاپور سے نکلی، اور نالیکوٹہ پر جو دریائے کرشنا سے ۲۵ میل شمال میں ہے مقام کیا

اس کی خبر جب رام راج کو ملی تو اس نے اپنے بھائی ترملا کو مدافعت کے لئے روانہ کیا۔"

فرشتہ لکھتا ہے :-

" ترملا کے ماتحت بیس ہزار سوار۔ ایک لاکھ پیدل سپاہی۔ اور پانچ سو ہاتھی تھے۔"

ترملا کو بھیجنے کے چند دن بعد رام راج نے اپنے بھائی ونکٹاوری کو بھی ایک زبردست فوج دیکر بھیجا اور بعد میں باقی ماندہ فوج لیکر خود بھی میدان میں پہونچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ رام راج کی عمر اس وقت اسّی سال کی تھی۔ میدان جنگ میں جس قدر فوج جمع ہوئی اس کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے :-

" ہندوؤں کے کل فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار۔ تین لاکھ پیادے۔ ۰۰ دو ہزار ہاتھی۔ اور پانچ سو توپیں تھیں۔ اور مسلمانوں کے پاس ان سے نصف فوج بھی نہیں تھی۔"

پرتگالی مورخ لکھتے ہیں :-

" ہندوؤں کے پاس اس وقت نو دو ہزار پیدل سپاہی۔ ستر ہزار سوار فوج تھی۔ مسلمانوں کے پاس پچاس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے۔"

دوسرے ہندو مورخ لکھتے ہیں :-

" اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے نصف ہی نہیں تھی۔"

ہندو فوج کی تعداد اور ان کے جنگی کیمپ کی شان و شوکت کے متعلق مرہٹی تاریخ "وجیانگر کی تباہی" (Destruction of Vijaynagar) کا مصنف لکھتا ہے :-

ہندو فوج کا کیمپ اس قدر بڑا تھا کہ وجیا نگر میں جس ہندو کے پاس بھی گھوڑا تھا وہ فوج میں داخل کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ فوجی کیمپ نہیں ہے۔ بلکہ ایک نہایت آباد اور وسیع شہر ہے۔ جس میں ہر جگہ ناچ رنگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے زنان بازاری کے طائفے بھی ہمراہ تھے۔ شراب کی دوکانیں ہر جگہ کھلی ہوئی تھیں۔ گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خزانہ، اناج سب کچھ کیمپ میں موجود تھے۔ رام راج نے پائے تخت سے نکلنے سے پہلے اپنی رانیوں اور ماں کے پاس گیا۔ ماں نے نصیحت کی کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ لیکن رام راج نے نہیں مانا۔"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر لکھتا ہے:۔

" رام راج نے پہلے اپنے چھوٹے بھائی تما کے ماتحت بیس ہزار سوار۔ پانچ سو ہاتھی اور دس ہزار پیادہ فوج بھیجی کہ مسلمانوں کو دریائے کرشنا عبور کرنے سے باز رکھے۔ تما کے بعد وینکٹ دری کو ایک اور زبردست فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا اسکے بعد آپ خود میدان جنگ کو روانہ ہوا۔ کل فوج کی تعداد جو ہندوؤں نے میدان جنگ میں لائی۔ ایک لاکھ سوار۔ تین لاکھ پیادے۔ دو ہزار ہاتھی۔ اور ایک ہزار توپیں تھیں۔"

کرشنا دیو رایا

رام راج والی بیجا
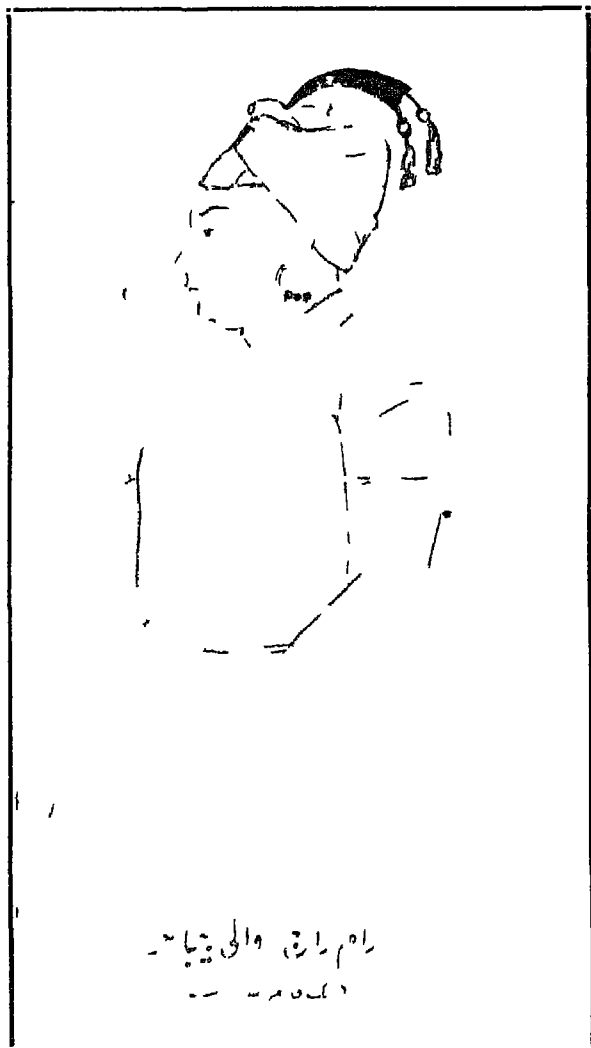
رکساس تنگڑی کی جنگ

یعنے

تالیکوٹہ کا قیامت خیز معرکہ

گذشتہ باب میں لکھا جا چکا ہے کہ مسلمان تالیکوٹہ میں جمع تھے۔ تالیکوٹہ سے نکل کر جب وہ دریائے کرشنا کے شمالی ساحل پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ ہندو فوج دریا کے جنوبی ساحل کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر چکی ہے۔ تاکہ مسلمان پار نہ اتر سکیں۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب "ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتا ہے :۔

"مسلمانوں نے سراغ رسانوں کو بھیجا کہ دریا سے پار اترنے کیلئے کوئی راستہ تلاش کریں۔ لیکن انہوں نے تمام راستے دیکھنے کے بعد یہی رائے دی کہ دریا عبور کرنے کیلئے یہی راستہ سب سے موزوں ہے جو ہمارے آگے ہے۔ اور یہیں سے توپیں وغیرہ لے جاسکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے ایک جنگی چال چلی۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ شمال میں ایک اور راستہ دریافت ہوا ہے۔ جہاں سے فوج دریا کے پار اتر سکتی ہے۔ اور سچ مچ ان کی فوج یہاں سے شمال کی طرف بڑھی۔ لیکن انہوں نے یہ ہوشیاری کی کہ بیس ہزار سوار فوج کو ایک کمین گاہ میں چھپا دیا۔ مسلمانوں کو شمال کی طرف بڑھتے دیکھ کر ہندو فوج بھی جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ اور انہوں نے یہ غلطی کی کہ اس جگہ پر جہاں پہلے کیمپ تھا کوئی فوج

نہیں چھوڑی۔ ہندوؤں کو اس طرح مغالطہ میں ڈالکر اسلامی فوج تین دن تک
آگے بڑھتی رہی۔ اور یکایک ایک شب میں کامل اندھیرے کا فائدہ اٹھاکر اسی جگہ
واپس آگئی۔ جہاں سے چلی تھی۔ اسلامی فوج نے تین دن کا راستہ ایک ہی دن میں
طے کر لیا۔ وہ اس جگہ پر شام کے وقت پہونچی۔ اور سر مغرب ان کے ہراولی دستہ
نے جو کمیں گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ دریا کو عبور کرکے جنوبی ساحل پر قبضہ کر لیا۔
دوسرے روز یعنے ۲۴ جنوری ۱۵۶۵ء کو مسلمانوں کی تمام فوج دریا کے پار اتر
گئی۔ سب سے پہلے نظام شاہ نے دریا کو عبور کیا تھا۔"

سیول اپنی تاریخ "فرگاٹن ایمپائر" کے صفحہ ۱۹۹ پر لکھتا ہے:۔

"موضع انگالگی کے قریب مسلمانوں نے دریا کو عبور کیا۔ اور اس میدان میں مقیم
ہوئے جو موضع بیاپور یا بھوگاپور کے متصل ہے۔ اور اسی میدان میں جنگ ہوئی"۔

لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جنگ موضع رکساس جی اور ٹنگڑی کے درمیانی
میدان میں ہوئی۔ کنڑی اور مرہٹی تاریخوں میں اس جنگ کو رکساس ٹنگڑی کی جنگ کے نام
سے ہی لکھا گیا ہے (تالیکوٹہ یہاں سے ۳۵ میل شمال میں ہے۔ مورخین حیران ہیں کہ جب میدان
جنگ سے مقام تالیکوٹہ اس قدر دور ہے تو اس جنگ کو تالیکوٹہ کے نام سے کیوں منسوب کیا گیا
ممکن ہے کہ مسلمان فوج کے عرصہ تک یہاں مقیم رہنے کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوگیا ہو۔ یا یہ
مواضعات تالیکوٹہ سے ملحق ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کو تالیکوٹہ کا نام دیدیا گیا ہو۔)

ہندوؤں کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بھی واپس پلٹے۔ لیکن اسلامی فوج
دریا کو عبور کر کے کھلے میدان میں خیمہ زن تھی۔ ہندو بھی مقابل میں صف آرا ہوگئے۔

مسلمانوں نے جنگ سے پیشتر اتمام حجت کیلئے رام راج سے کہلا بھیجا کہ صلح کر لی جائے

لیکن اس نے مسلمانوں کی اس درخواست کو ان کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے نہایت نخوت سے سفیروں کو واپس بھیجدیا۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۶۹ پر لکھتا ہے:۔

" رام راج ایک نہایت دوربین سیاست دان تھا۔ اس کو اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز تھی۔ وہ خود بھی کئی باران کا دوست اور دشمن بنا۔ اور وہ جانتا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اپنی تمام شمالی سرحدوں کو ہمیشہ مستحکم کرتا رہا۔ لیکن یہی شخص جو ہمیشہ اپنے دشمنوں کی کمزوریوں پر نظر رکھکر فائدہ اٹھاتا رہا اور ہمیشہ ان کو ایک دوسرے سے لڑاتا رہتا تھا۔ اور ایک دوسرے میں حسد اور رقابت بڑھایا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے اپنی قدیم پالیسی بھول گیا اور ایک ایسی جنگ میں مبتلا ہو گیا جس سے وہ واپس نہیں پھرا۔"

نماز صبح کے بعد مسلمان جنگ کے لئے تیار ہوئے اور اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دی میمنہ پر علی عادل شاہ۔ درمیان یا قلب میں حسین نظام شاہ۔ میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید شاہ کی فوجیں تھیں۔ ان کے مقابل ہندو فوج میں میمنہ تمراج کے ماتحت تھا۔ میسرہ پر وینکٹ دری اور قلب میں رام راج تھے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضوریوں اور افسروں نے رام راج سے کہا کہ " آپ پالکی چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔" لیکن اس نے جواب دیا کہ " یہ تو جنگ نہیں۔ بچوں کا کھیل ہے۔ مسلمان ہمارے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاکر بھاگ نکلیں گے۔"

اسلامی فوج حملے کے لئے آگے بڑھی۔ ان کے تیر اندازوں اور شمشیر زنوں کو حکم تھا کہ وہ خاص طور پر ہندوؤں کے ہاتھیوں پر توجہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے بہت سے ہاتھی زخمی ہو گئے۔ جس سے ان کی صفوں میں ایک انتشار پیدا ہو گیا۔ رام راج نے جب یہ

دیکھا کہ مسلمان ہندوؤں کی کثرت سے ڈرتے نہیں ہیں۔ تو وہ پالکی چھوڑ کر ایک جواہر نگار شامیانے کے نیچے مرصع تخت پر بیٹھا۔ اور اپنے آگے اور داہنے بائیں۔ سونا، چاندی اور دوسرے جواہرات کا ڈھیر رکھ لیا۔ اور اعلان کیا کہ جنگ میں جن لوگوں سے نمایاں بہادری کے کام ہوں گے انہیں بھاری انعام دیا جائیگا۔ ہندو فوج میں رام راج کی اس کارروائی سے ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اور اس نے نہایت استقلال و مستعدی سے آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کی فوج کا میسرہ اور میمنہ قلب سے جدا ہو گیا۔ جنگ کی اس حالت سے معلوم تو یہ ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو کامل شکست ہو گی۔ اور اس کے آثار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن جس طرح مشرقی جنگوں میں پانسہ یکایک پلٹ جاتا ہے۔ اس جنگ میں بھی اسی طرح ہوا۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتا ہے :۔

> "علی عادل شاہ کا میمنہ قلب سے علیحدہ ہو گیا۔ تو اس نے میدان جنگ سے ہٹ کر ہندو فوج کے پیچھے سے قلب پر حملہ کر دیا"

آگے چلکر یہی مورخ پھر لکھتا ہے :۔

> "یہ حسین نظام شاہ کا استقلال تھا جس نے اس دن ناکامیابی کو کامیابی سے بدل دیا۔ مسلمانوں کی وہ فوج جو قلب میں حسین نظام شاہ کے ماتحت تھی نہایت استقلال سے دشمن کے حملوں کو روک رہی تھی۔ علی عادل شاہ کی فوج جو میمنہ پر تھی۔ علیحدہ ہو چکی تھی۔ لیکن کشور خان بیجاپور کا جنرل کسی طرح حسین نظام شاہ کی فوجوں سے آکر مل گیا۔ حسین نظام شاہ نے اس وقت حکم دیا کہ وہ مشہور توپ جس کا نام "مالک میدان" ہے۔ حرکت میں لائی جائے۔ توپ میں تانبے کے

سکے بھر کر ہندو فوج پر مارے گئے۔ توپ کے اس ہولناک حملے سے ہندوؤں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ صرف رک گیا۔ بلکہ ہندو فوج میں انتشار پیدا ہو گیا۔ عین اس وقت مسلمان سواروں نے نہایت استقلال سے بڑھکر حملہ کیا۔ رام راج یہ دیکھکر جلدی سے تخت چھوڑکر پالکی میں بیٹھ گیا۔ لیکن مسلمان سوار۔ پالکی قریب پہونچ گئے تھے۔ انکے ایک ہاتھی نے پالکی پر حملہ کیا۔ جس سے خوف زدہ ہوکر پالکی بردار پالکی چھوڑکر فرار ہو گئے۔ ہاتھی سوار نے چاہا کہ مرصع پالکی کو اٹھالے۔ اور جب وہ پالکی اٹھانے کے لئے جھکا تو ایک وفادار برہمن جو رام راج کے قریب تھا چیخ اٹھا کہ پالکی میں "مہاراج رام راج" ہے۔ اور اگر ان کو بچا لیا جائے۔ تو اس مسلمان کو دولت وجیانگر کا ایک بڑا افسر بنا یا جائیگا۔ مسلمان مہاوت کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے قبضہ میں کس کی شخصیت آرہی ہے تو اس نے ہاتھی کو اشارہ کیا۔ ہاتھی نے رام راج کو سونڈ میں اٹھاکر مہاوت کو دیدیا۔ اور اس نے پلٹ کر اس کو احمدنگر کے سردار رومی خاں کے پاس لیجاکر پیش کر دیا۔ رومی خاں نے رام راج کو حسین نظام شاہ کے پیش کیا۔ حسین نظام شاہ نے فوراً اس کو قتل کرکے اس کے سر کو نیزہ پر چڑھا کر فوج کے آگے آگے گشت کرایا۔ ہندو فوج نے جب اپنے راجہ کا سر دیکھا تو اس پر ایک ہیبت طاری ہو گئی۔ فوج میں کھلبلی پیدا ہو گئی اور اس نے فرار ہونا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ اور اس سختی سے کیا کہ میدانِ جنگ میں ایک لاکھ ہندو مارے گئے۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۶۹ پر لکھتا ہے :-

"۲۵ر جنوری ۱۵۶۵ء کے دن دوپہر کو ہندوؤں نے جنگ شروع کی۔

ونکٹ دری نے بحیثیت کمانڈر اعلیٰ اپنی فوج سے علی عادل کی فوج پر حملہ کیا
ونکٹ دری کے ماتحت ۲ لاکھ پیادے ۔ ۲۵ ہزار سوار اور ۵۰۰ ہاتھی تھے
گولہ باری سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا۔ اور وہ بہ ظاہر پیچھے ہٹ
گئے۔ جلد ہی عام لڑائی شروع ہوگئی۔ ترملا نے جس کی کمان میں دایاں بازو
تھا۔ گولکنڈہ اور بیدر کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ وہ اور اس کا بیٹا رگھوناتھ
نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا۔ گولکنڈہ اور بیدر والے سخت نقصان اٹھاکر
پسپا ہوئے۔ لیکن جنگ میں رگھوناتھ مارا گیا۔ اور ترملا کی ایک آنکھ ضایع ہوگئی
رام راج کو جب یہ خبر پہونچی تو اس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے پالکی چھوڑ
کر گھوڑے پر سوار ہوکر "گروڈا گروڈا" کا جنگی نعرہ لگایا۔ اور اتحادی
فوج پر حملہ کیا۔ گولکنڈہ، بیجاپور، اور بیدر کی فوجیں اس حملہ کی تاب نہ
لاسکیں۔ اسکے بعد اس نے احمدنگر کی فوج پر جو قلب میں متعین تھی۔ دس ہزار
سواروں سے حملہ کیا۔ یہ حملہ اس بے جگری سے ہوا کہ احمدنگر کی فوج تقریباً آدھے
کوس تک پیچھے ہٹ گئی۔ رام راج کا باڈی گارڈ رام راج کے اس حملہ کو دیکھکر
گھوڑوں سے اتر کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ اور کئی مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس
عرصہ میں علی عادل نے جو پیچھے ہٹ گیا تھا۔ عقب سے حملہ کیا۔ اور نظام شاہ
نے اپنی فوجوں کے ساتھ ۔ لڑائی اس وقت میدان جنگ کے قلب میں ہورہی
تھی۔ اسی وقت رومی خاں کی توپوں نے اپنا کام شروع کیا۔ اس کا اثر ایسا
مہلک پڑا۔ کہ ہندوؤں کی فوج کا سیلاب جو آگے بڑھ رہا تھا سخت نقصان
اٹھاکر پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ عین اس موقع پر حسین نظام نے اپنی فوجوں کو

کو لیکر حملہ کیا۔ اور آپ خود فوج کے آگے اپنا شامیانہ نصب کیا۔ جس سے مقصد یہ تھا کہ سلطان فتح یا موت چاہتا ہے۔ رام راج یہ دیکھ کر اس وقت گھوڑے سے اتر کر تخت پر بیٹھا۔ اور اپنے سامنے تخت پر ہیرے جواہر اور سونے کے ڈھیر لگائے۔ اور اعلان کیا کہ جو شخص بہادری دکھائیگا۔ انعام پائیگا۔ یہ اعلان سن کر ہندو فوج پھر آگے بڑھی۔ رومی خاں نے اس وقت کی سب سے بڑی توپ "مالک میدان" میں تانبے کے سکے بھر کر چلائی۔ ایک ہی وقت میں پانچ ہزار ہندو گرے۔ ہندو فوج فرار ہونے لگی۔ ان میں ابتری پھیل گئی۔ جنرل کشور خاں (بیجاپور) نے بھی اسی وقت حملہ کیا۔ جس سے ہندو فوج کا قلب کامل طور پر منتشر ہوگیا۔ ایسے وقت میں رام راج کی فوج میں جو دو مسلمان جنرل تھے۔ وہ رام راج کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے آملے۔ اس سے ہندوؤں کے دل اور بھی چھوٹ گئے۔ ہندو جنرل اپنی فوج کو سنبھالنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ نہیں سنبھل سکی۔"

میسور گزیٹیر کی روایت میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نے شکست کی وجہ مسلمان جنرلوں کی غداری بتلائی ہے۔ اور اسی پر اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے۔

میسور گزیٹیر کے صفحہ ۲۰۷۱ پر لکھا ہے:۔

"رام راج کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر دو مسلمان جنرل رام راج کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے مل گئے۔ یہ غداری بقول ریورنڈ ہراس صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ جنگ کی قسمت یکایک کیوں پلٹ کر رہ گئی۔ ہراس نے یہ روایت میجر فریڈرک سے لی ہے۔ جس نے اس جنگ کے ایک سال بعد جب وہ

وجیانگر آیا ہوا تھا تو سنی تھی "

نہایت تعجب ہے کہ میسور گزیٹیر کے مصنف کو ایک سنی سنائی بات پر تو یقین آجائے۔ اور یقین نہ آئے تو اسلامی مورخوں کی روایات پر اور خصوصاً فرشتہ کی تاریخ پر۔ فرشتہ اس زمانہ میں بیجاپور میں موجود تھا۔ اس کو جو اطلاعات ملتی تھیں وہ بالکل صحیح ملتی تھیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ میدان جنگ میں بھی موجود ہو۔ اسکی دیانت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے آقا علی عادل کی رعایت بھی نہیں کرتا۔ اس جنگ کی فتح کا سہرا اس نے حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے اگرچہ یہ اس کیلئے آسان تھا کہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے حسین نظام شاہ کے نام کو نظرانداز کردے۔

سیرز فریڈرک کی اس سنی سنائی روایت کو نقل کرنے اور اس پر زور دینے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یعنے جنگ سے پونے چار سو سال بعد فتح کا سہرا بزور قلم مسلمانوں سے چھین لیا جائے۔ اگر سیرز فریڈرک کی اس سنی سنائی روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ

(۱) کرشنا دیورایا اور رام راج کے سلوک کو دیکھتے ہوئے کسی مسلمان کا وجیانگر کی ملازمت میں رہنا ممکن تھا یا نہیں۔

(۲) کیا رام راج کی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ اس نے اس قدر بڑے عہدے مسلمانوں کو دے رکھے ہوں۔

(۳) کیا مسلمان وجیانگر میں آباد تھے۔ کسی تاریخ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ کرشنا دیورا کے عہد میں مسلمانوں کو جلاوطن کرنے کے بعد پھر انہیں وجیانگر کے حدود میں آباد کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ان سوالات کا جواب جب تمام تاریخیں نفی میں دیتی ہیں، تو میسور گزیٹیر کا اس روایت پر زور دینا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ میسور گزیٹیر کے مصنف نے ان دو مسلمان جنرلوں میں سے ایک کا نام عین الملک بتلایا ہے۔ اب اگر یہی مصنف اپنی کتاب کے اگلے صفحات الٹ کر دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ خود لکھ آیا ہے کہ عین الملک جو گولکنڈہ کا ایک سردار تھا۔ اس کی وفات اس جنگ سے تیتّس سال پیشتر ہو چکی تھی۔ اور وہ کبھی وجیانگر کی ملازمت میں نہیں تھا۔

اب اس سنی سنائی اور فرضی روایت کو چھوڑ کر ہندوؤں کی شکست کے اصلی اسباب کو دیکھا جائے تو وہ دو ہیں۔

(۱) رومی خاں کی توپ کی گولہ باری۔ اور

(۲) رام راج کا قتل

مشرقی جنگوں میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے اور یہی اس جنگ میں بھی ہوا۔ رام راج کا سر نیزے پر دیکھتے ہی ہندو فوج میں ابتری پھیل گئی۔ اور ساتھ ہی رام راج کے بھائی وینکٹ دری اور ترملا کے فرار نے رہی سہی ہمت توڑ دی۔ وینکٹ دری اور ترملا اس جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ ترملا کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ اس لئے ان پر اس قدر خوف و ہراس چھا گیا تھا کہ انہیں سوائے فرار ہونے کے اور کچھ نہ سوجھی۔ اگر وہ چاہتے تو وجیانگر میں قلعہ بند ہو کر لڑ سکتے تھے۔ یا ان پہاڑیوں میں مدافعت کا سامان ہو سکتا تھا۔ جو وجیانگر کو گھیری ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہندوؤں پر اس قدر خوف و ہراس طاری ہو گیا کہ سوائے فرار ہونے کے انہوں نے اور کچھ سوچا ہی نہیں۔ میدان جنگ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک لاکھ ہندوؤں کی لاشیں اس میں

پڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ ہیبت ناک نظارہ تھا جس نے ترملا اور ونکٹ دری اور تمام ہندوؤں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

مقتولین جنگ کی تعداد

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"اس جنگ میں ہندو مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تھی۔"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۴۳۱ پر لکھتا ہے :۔

"ہندوؤں نے شکست کھا کر میدان چھوڑ دیا۔ فاتحین نے قتل عام کرتے ہوئے انکا تعاقب کیا۔ مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔"

لیکن میسور گزیٹیر کا مصنف برہان ماثر کی روایت پر زور دیتا ہوا لکھتا ہے :۔

"میدان جنگ میں ہندو مقتولین کی تعداد کل نو ہزار تھی۔"

تعجب ہے کہ میسور گزیٹیر کے مصنف نے برہان ماثر کی روایت کو تسلیم کر لیا ہے۔

اگر برہان ماثر کی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ترملا اور ونکٹ دری کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ لاکھوں کی فوج کو زیر کمان رکھتے ہوئے صرف نو ہزار ہندوؤں کے قتل ہوتے ہی وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ایک دوسری جگہ میسور گزیٹیر کے مصنف کو اقرار ہے :۔

"رومی خاں نے "مالک میدان" توپ کو چلایا تو پانچ ہزار ہندو مارے گئے۔"

(میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۷۱)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر کثیر فوج میں اور چار ہزار ہندو قتل ہونے سے بھگدڑ کیوں

پڑگئی۔ اگران روایات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے تاریخ اور جنگ کے نتیجہ میں کچھ فرق نہیں آتا۔ یہی ماننا پڑیگا کہ رام راج کا سر دیکھتے ہی ہندو فوج نے ہمت ہار دی تھی۔

اس طرح جنوبی ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی مہیب جنگ کا فیصلہ اور جنوب میں ہندوؤں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے ۲۵ر جنوری ۱۵۶۵ء کے دن خاتمہ ہوگیا۔

ترملا اور ونکٹ دری کی فراری

یہ کہا جا چکا ہے کہ رام راج کا سر دیکھتے ہی ہندو فوج میں بھگڈر پڑگئی۔ اور ترملا اور ونکٹ دری میدان جنگ سے فرار ہوگئے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۷۵ پر لکھتا ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ کی حالت دیکھتے ہوئے ترملا پائے تخت کو چلا گیا۔ ونکٹ دری بھی بچ گیا۔ ان کی اس فراری کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ونکٹ دری چندر گیری کے قلعہ کو چلا گیا۔ اور وہاں سے ترپتی کو۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے جدا ہونے سے پیشتر آئندہ کارروائی کے متعلق سمجھوتہ کر لیا تھا۔"

پھر یہی مصنف صفحہ ۲۰۷۶ پر لکھتا ہے:۔

"اس سمجھوتہ کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ ونکٹ دری اپنے تعاقب کرنے والوں سے بچتا ہوا چندر گیری اور وہاں سے ترپتی پہونچا۔ کہ بادشاہ کا استقبال کرے۔ ترملا پائے تخت پہونچکر خزانہ اور بادشاہ کو منتقل کرنے کا انتظام کیا۔"

ہندو تاریخ رام رحیمو کا مصنف لکھتا ہے :-

"مسلمانوں نے ونکٹ دری کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ انکے ہاتھ نہ آیا"

ریورنڈ ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"جنگ کا نقشہ بدلتے ہی ترملا اور ونکٹ دری فرار ہو گئے"

رئیس لکھتا ہے :-

"وجیانگر پہونچکر ترملا نے جو کچھ زر و جواہرا ور خزانہ لیجا سکا۔ لیکر جنوب کی طرف پلگنڈہ کو چلا گیا"

ان روایات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ترملا اور ونکٹ دری میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔
اب رہی میسور گزیٹیر کے مصنف کی یہ روایت کہ میدان جنگ کی یہ حالت دیکھکر انہوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا اور فرار ہوئے۔ اور بعد میں اس پر عمل بھی کئے۔ بالکل غلط ہے۔ واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ ترملا اور ونکٹ دری کا فرار کسی سمجھوتہ کے ماتحت نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے الگ الگ راہ فرار اختیار کی۔ ونکٹ دری جو فرار ہوا تو سیدھا چندرگیری پہونچا۔ ممکن ہے کہ بعد میں وہ تریتی کو بھی گیا ہو۔ لیکن ترملا فرار ہو کر سیدھا وجیانگر پہونچا اور یہاں سے جو کچھ مل سکا لے لیا۔ اور ساتھ ہی راجہ سدا سیورایا کو جو ۲۳ سال سے قید میں تھا۔ لیکر پلگنڈہ چلا گیا۔ اگر ترملا اور ونکٹ دری میں کوئی سمجھوتا ہوا ہوتا تو ترملا کو چندرگیری جانا تھا۔ اس کے عوض وہ پلگنڈہ جا پہونچتا ہے۔

میسور گزیٹیر کے اس روایت کی تردید فرشتہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ "ونکٹ دری نے چندرگیری پہونچکر سلاطین اسلام سے صلح کی درخواست کی تھی"

بہر طور ونکٹ دری اور ترملا میدان جنگ سے فرار ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ہندو

فوج بھی فرار ہونا شروع کی۔ مسلمانوں نے میدان جنگ میں تھوڑی دور تک ہندوؤں کا تعاقب کیا۔ اور بعد میں پلٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔

فرشتہ لکھتا ہے :۔

"بہادران اسلام نے کفار کے لشکر ہزیمت خوردہ کا پیچھا کیا۔ اور تیغ یمانی سے اس قدر مشرکوں کی سر افشانی کی کہ ان تیرہ بختوں کے خون سے زمین نے رنگ لعل رمانی قبول کیا اور بروایت مشہور عدد کشتوں کے تین لاکھ پہونچے تھے۔ اور بقول صحیح لاکھ کافر کے قریب اصل معرکہ اور تعاقب کے وقت تہ شمشیر ہو کر قتل ہوئے۔ چنانچہ مقام جنگ سے اناگندی تک جو دس کوس بیجانگر سے ہے جا بجا لاشیں پڑی تھیں۔ دامن صحرا کفار کے لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مال وافر اور خزانہ بے شمار از زر و جواہر، تیغیں و ڈھالیں اور کمانیں دمشقی اور نیزہ خطی اور اسپ و شتر اور خیمہ و خرگاہ اور کنیز و غلام اس قدر غنیمت عساکر نصرت مآثر کے ہاتھ آئے کہ بحر و کان کے مانند مستغنی اور بے نیاز ہوئے۔ اور سلاطین دین پناہ اسلام سے فرمان واجب الاذعان صادر ہوئے کہ فیل کے سوا جو شے جس کے ہاتھ آئے وہ اس کا مالک و مختار رہے۔"

ادھر تو مسلمان میدان جنگ میں مال غنیمت جمع کرنے اور فتح کے جشن منانے میں مصروف تھے اور ادھر وجیانگر میں جب مفرورین جنگ آنے لگے تو سراسیمگی پھیل گئی۔

برہان مآثر کا مصنف لکھتا ہے :۔

" رام راج کی تمام دولت فاتحین کے ہاتھ لگی۔ بے حساب کنیز و غلام کے علاوہ ہاتھی اور اونٹ، خیمہ و خرگاہ اور نقد و جواہر اس قدر ہاتھ لگے کہ تمام مسلمان مالا

مال ہو گئے ۔"

اس طرح دس دن تک مسلمان مال غنیمت حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ اور سلاطین دکن فتح کا جشن منا رہے تھے۔ اُدھر تر ملا کو موقع مل گیا کہ وجیانگر کو پہونچا جو کچھ زر و جواہر اور خزانے تھے نکال کر ساتھ لے جائے۔

جنگ کا نتیجہ اور وجیانگر کی تباہی کے حالات لکھنے سے پیشتر ضروری ہے کہ رام راج کے دوسرے حالات لکھکر اس باب کو ختم کر دیا جائے۔

رام راج کا عہد ہندو نقطۂ نظر سے ایک تابناک عہد تھا۔ اس نے اپنے خسر دیورایا کی پالیسی پر پوری طرح کاربند رہا۔

رام راج کا عہد جس طرح جنگی کارناموں سے بھرا ہوا ہے اسی طرح اس زمانہ میں اس نے فنون لطیفہ، علم موسیقی اور شاعری کو بھی ترقی دی۔ اس کے عہد میں بہت سے مشہور ہندو شاعر گذرے ہیں۔ کنڑی زبان کا ہندو شاعر پرندر داسا اسی زمانے میں وجیانگر میں تھا۔ رام راج نے ملک کے اندر رفاہ عام کے بہت سے کام کئے۔ اور بے شمار مندریں تعمیر کرائیں۔ جس کی وجہ سے آج بھی جنوبی ہند کے ہندو اس کے عہد کو رام راج کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اکثر ہندو مورخین لکھتے ہیں :-

" رام راج کی عمر اس کے قتل کے وقت ۸۰ سال کی تھی۔ رام راج ایک سخت طبیعت کا حکمراں تھا۔ جس بات پر اڑ جاتا تھا۔ اس کو پورا کئے بغیر چین نہ آتا۔ اس نے ملک کے جائز وارث سداسیو رایا کو قید میں رکھکر سلطنت غصب کر لی لیکن اسکی یہ کارروائی ملک کے بہترین مفاد کے لئے تھی۔ اس نے وجیانگر کی شہرت و

عظمت کو چار چاند لگا دئے۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔

"دنیا میں غاصبوں کو الزام دینے سے پیشتر اگر ان کے کارناموں کو دیکھا جائے تو انہوں نے اپنے ملک و قوم کو کس بام ترقی پر پہونچا یا تو یہ الزام کوئی وقعت نہیں رکھتا۔"

جنگ کے بعد وجیا نگر کی تباہی

ادہر میدان جنگ میں یہ قیامت آفریں معرکہ ہو رہا تھا۔ ادہر شہر وجیانگر آنے والی تباہی سے بے خبر اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ وجیانگر میں کسی ہندو کو بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ میدان جنگ میں ہندوؤں کو شکست ہو گی۔ لیکن جب مفرورین جنگ آنے لگے تو شہر میں ایک سراسیمگی پھیل گئی۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شہر کے بدمعاش اور قرب و جوار کے دیہاتیوں نے لوٹ شروع کر دی۔

رونڈ ہراس لکھتا ہے :۔

"ترملا نے جاتے ہوئے شہر میں حفاظت کے لئے کوئی فوج نہیں چھوڑی تھی۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۷۹ پر لکھتا ہے :۔

"یہ صحیح نہیں ہے کہ ترملا نے کوئی فوج شہر کی حفاظت کے لئے نہیں چھوڑی تھی۔ فوج تھی۔ لیکن اس پر خوف و ہراس اس قدر طاری تھا کہ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے دیہاتیوں نے جنہیں بنیڈر کہا جاتا ہے۔ حملہ شروع کر دیا۔ اور جو کچھ امرا کے مکانات میں مال و خزانہ مل سکا۔ لوٹ کر لے گئے۔ ان کی اس لوٹ سے عام دوکاندار اور

شہری بھی نہ بچ سکے۔"

پرتگالی مورخ کوٹو اور مورخ سیول لکھتے ہیں :-

"منیڈروں نے شہر پر چھ دفعہ حملہ کیا تھا۔"

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"بیراگیوں نے شہر کو لوٹنا شروع کیا۔"

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی اپنی تاریخ بیجانگر میں لکھتے ہیں :-

"یہ جنگ کاہے کو تھی۔ بلکہ ایک طوفان عظیم کی رَو تھی۔ کہ جو اس کے سامنے آگیا اس کو بہا گئی۔ سب امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ شہر کے باشندے جو لاکھوں ہی تھے۔ بے یارو مددگار رہ گئے۔ سوائے چند کے ان بیچاروں کو بھاگنے کا موقع بھی نہ ملا۔ کیونکہ باربرداری کے بیل، گاڑیاں سب کی سب فوج کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ جو اب تک واپس نہیں آئی تھیں۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے بَن نہ پڑی کہ خزانوں کو زمین میں گاڑ دیا اور بوڑھے اور عورتوں اور بچوں کے سوائے جوانوں نے ہتھیار سنبھال لیئے۔ اور اس آنے والی مصیبت کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ دوسرے دن بیجانگر کے اطراف کی جنگلی اقوام اور لٹیروں نے آکر شہر کو لوٹنا شروع کیا۔ بنجاروں (اقوام خانہ بدوش) لماڑوں، کوروؤں اور اسی قسم کے لٹیروں کے گروہ کے گروہ بدنصیب باشندگان شہر پر آن پڑے۔ اور مال واسباب، دکانوں اور بازاروں کو لوٹ گھسوٹ کر ساری دولت لے گئے۔"

پرتگالی مورخ کوٹو لکھتا ہے :-

"فتحیاب مسلمان زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیئے دس دن تک میدان جنگ میں ٹھیرے

رہے۔ اور چندسے آرام لیا۔ اس کے بعد بیجا نگر کا رخ کیا۔ اور اس دن سے لگا تار پانچ مہینے تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ لوگوں نے اپنا اپنا مال زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اور بچا کچھا باؤلیوں میں ڈال دیا تھا۔ لشکریوں نے مکان کھودنے اور جلانے شروع کیے۔ ایک روز نظام شاہ بطور سیر سوار ہو کر نکلا۔ دیکھا کہ ایک جگہ چند لشکریانِ علی عادل شاہ ایک طبق مروارید و جواہر سے بھرا ہوا لئے ہوئے تقسیم پر لڑ رہے ہیں۔ نظام شاہ کی فوج نے چاہا کہ ہم بھی حصہ لیں دونوں کی آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ دونوں طرف کے آدمی مارے گئے۔ اور زخمی ہوئے۔ یہ حالت دیکھکر نظام شاہ نے ارکان دولت سے کہا کہ آپس میں لڑنے بھڑنے سے کیا فائدہ بہتر یہ ہے کہ شہر کو جلا دو۔ تاکہ قضیہ فساد موقوف ہو۔ چنانچہ حکم شاہی کے موافق شہر کی تمام بڑی بڑی عمارتوں کو اور شہر کے اطراف میں بیس کوس تک قصبات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ الغرض دشمن بے رحمی سے برابر لوٹ مار کرتے رہے جو ملا۔ اسے قتل کیا۔ مندروں اور محلات کو مسمار کر دیا خصوصاً راجہ کے محلات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ان کی دست برد سے صرف چند بڑے سنگ بست مندر اور کہیں کہیں چار دیواریاں باقی رہ گئیں۔ جہاں ایک زمانے میں یہ چہل پہل تھی۔ اور سر بفلک عمارتیں کھڑی تھیں۔ اب وہاں صرف کھنڈر اور مٹی کے ٹیلے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے تمام بت توڑ ڈالے۔ اور نرسہوان کے بڑے بت کے بھی دونوں بازو اڑا دیئے۔ مختصر یہ کہ کوئی چیز ان کے ہاتھ سے بچ نہ سکی۔ ان لوگوں نے اس بڑے منڈپ کو جو ایک بلند چبوترے پر واقع تھا۔ جہاں سے بڑے بڑے تہوار وہیں تماشہ دیکھا جاتا تھا۔ توڑ کر زمین کے

برابر کر دیا۔ اور تمام نقش و نگار والے پتھروں کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ ان لوگوں نے آراستہ اور شاندار وٹھل سوامی کے دیول میں جو دریا کے کنارے واقع ہے بڑے بڑے انبار آگ کے لگا دیئے۔ اور بے نظیر اور قابل دید پتھر کی صناعی کو برباد کر دیا۔ الغرض آگ اور تلوار، ورانتی اور کلہاڑیوں سے ہر روز شہر کی تباہی اور بربادی کرتے رہے۔"

سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"شہر کے مندروں میں جس قدر بت تھے۔ مسلمانوں نے انہیں توڑ دیا۔ مسلمان انتقام لینے کے لئے آئے تھے۔ اور انہوں نے پوری طرح انتقام لیا۔"

ہراس لکھتا ہے:۔

"وجیانگر کی موجودہ حالت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام مسلمانوں کی لائی ہوئی تھی یا امتداد زمانہ نے بھی اپنا کام کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شہر میں رہنے کے لئے پھر جدید عمارات تعمیر کرنی شروع کیں۔ لیکن بعد میں ان کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ آج جو شکستہ دیواریں نظر آتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کی یادگار ہیں۔ ورنہ ہندو تعمیرات سے مسلمانوں نے کچھ بھی باقی نہیں رکھا۔"

اطالوی سیاح سیزر فریڈرک جو اس تباہی کے دو سال بعد وجیانگر میں آیا تھا۔ لکھتا ہے:۔

"میں نے دنیا کے اور شاہی محلات کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن وجیانگر کے شاہی محل کی ہمسری کوئی محل بھی نہیں کر سکتا۔ اس محل کے نو ۹ دروازے ہیں۔ کھنڈرات میں اب بھی وٹھوبا کا مندر، ہاتھیوں کا اصطبل اور حرم سرا کے غسل خانے پائے جاتے ہیں۔ یہ کھنڈرات ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہاں پھرتے پھرتے یہ تصور بھی

وجیانگر کے کھنڈرات۔ کنول محل

وجیانگر کے کھنڈرات (مندریں)
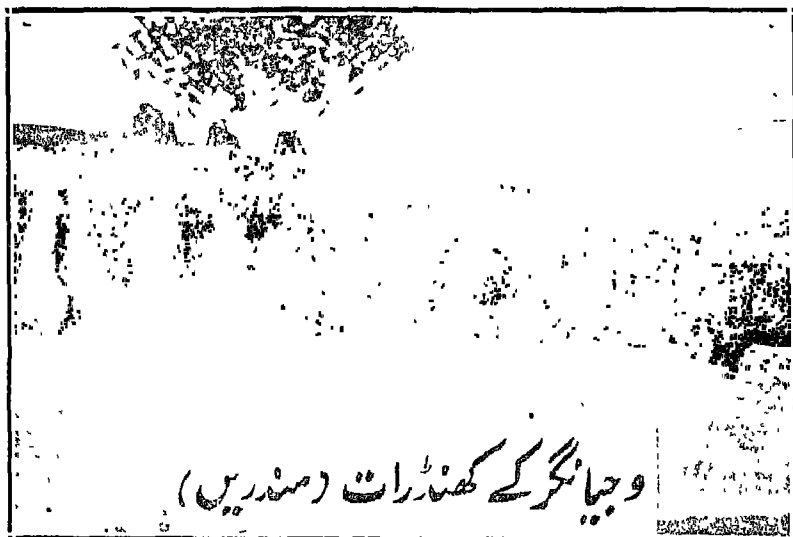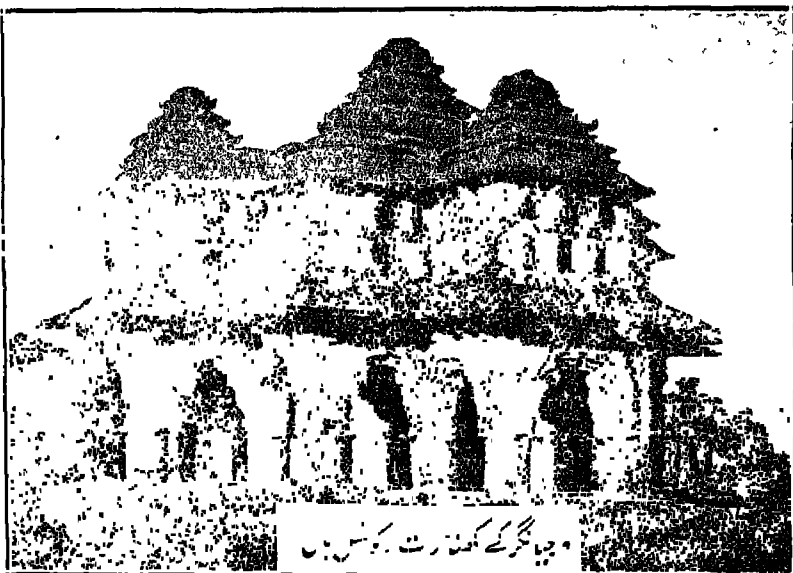
نہیں ہوسکتا کہ گذرے ہوئے زمانے میں اس کی شان وشوکت کیا ہوگی۔ کس طرح اس
زمانے میں جب فن تعمیر بالکل محدود تھا بڑی بڑی چٹانیں زمین سے صدہا قدم اونچی
اٹھا کر اپنی جگہ پر موزونیت سے رکھی گئی تھیں۔ اس شہر خموشاں کی اس وقت کیا
عظمت ہوگی۔ جبکہ عظیم المرتبت راجاؤں کا جلوس اس کی بھری ہوئی گلیوں سے
گذرتا ہوگا۔ اور چاؤش صدا دے رہے ہوں گے۔"

وجیانگر کی تباہی کے متعلق ایک اور نظریہ

یوں تو ہر تاریخ یہی بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے وجیانگر کو کامل طور پر تباہ کر دیا۔ اس کے
مندر اور عمارتیں : صرف ڈھا دی گئیں۔ بلکہ آگ بھی لگا دی گئی۔ لیکن یہ نہایت تعجب سے دیکھا
جائیگا کہ مورخ ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ" فاتح مسلمانوں کے جانے کے بعد ترملا پھر وجیانگر
میں آکر اسی قدیم شاہی محل میں مقیم ہوا" اس کی تصدیق سیزر فریڈرک کے سیاحت نامہ سے بھی
ہوسکتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ محل اسی حالت میں ہے جس طرح کہ پہلے تھا"
میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۸۵ پر لکھتا ہے :۔

" کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترملا نے پھر اس شہر کو آباد کرنا چاہا۔ لیکن ترملا کی
حرص اور ناقابلیت اس شہر کو آباد نہ کر سکی"

ان روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سوائے شاہی محل اور پمپا پتی کے مندر کے
باقی تمام شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ شاہی محل اس لئے محفوظ رہا کہ سلاطین اسلام اس میں ٹھہرے
ہوئے تھے۔

رورنڈ ہراس لکھتا ہے :۔

"مسلمان جب پورے شہر کو تباہ کر چکے تو انھوں نے پھر اس کو اپنی طرز پر آباد کرنا چاہا۔ اور عمارتیں پھر تیار ہونی شروع ہوئیں۔ لیکن بعد میں مسلمان انہیں ادھورا چھوڑ کر چلا گئے۔

بعد میں جب ترملا نے اس شہر کو آباد کرنا چاہا تو یہ اس کے بس کی بات نہ رہی۔ ممکن ہے کہ یہ دیکھکر ترملا ہی نے شہر کو پوری طور پر جس طرح آج نظر آرہا ہے۔ برباد کردیا ہو۔ اور رہی سہی کمی زمانے کے زبردست ہاتھوں نے پوری کردی۔

بہر طور وجیانگر تباہ ہوگیا اور اس کو تباہ ہوئے آج پونے چار سو (۳۷۵) سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ یہ عالیشان شہر اس طرح تباہ ہوا کہ پھر پنپ نہ سکا۔ دنیا میں ہزارہا شہر آباد ہوئے اور مٹ گئے۔ قانون قدرت ایک وقت مقررہ تک ہر قوم اور ہر آبادی کو مہلت دیتا ہے۔ یہی مہلت وجیانگر کو بھی ملی تھی۔ اور جب وقت آگیا تو وجیانگر بھی اس طرح برباد ہوا کہ آج تصور میں بھی اس کی شان و شوکت اور عظمت و صولت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی آباد گلیاں۔ اس کے بھرے ہوئے بازار، اس کی فلک بوس عمارتیں، اس کے عالیشان معابد سب خاک میں مل گئے۔ وہ گلیاں جہاں چلنے والوں کو کثرت آبادی سے راستہ ملنا دشوار ہو جاتا تھا۔ وہ بازار جہاں دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں۔ وہ عمارتیں جہاں خوشی و سرور کے نغمے ہمیشہ بلند رہا کرتے تھے۔ وہ معابد جہاں حسین و جمیل دیوداسیوں کے پرے کے پرے ناچ گا کر کوہ قاف کی پریوں کا نظارہ پیش کرتے تھے۔ سب مٹ گئے۔ ہندو قوم کا یہ عروس البلاد، ان کی تمدن و معاشرت کا یہ گہوارہ، ان کے مذہب کا یہ محافظ شہر تباہ ہو گیا۔ اور اس طرح تباہ ہو گیا کہ اس کے ویران کھنڈروں میں جاتے ہوئے بھی روح کانپتی ہے۔

وجیانگر کی اس عبرتناک حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے رورنڈ ہراس اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر

لکھتا ہے :۔

"اگر مسلمان سلاطین اس شہر کو تباہ نہ ہونے دیتے تو تاریخ میں وہ ایک روشن زمانہ چھوڑ جاتے ۔ اسی طرح جیسے کرشنا دیوا نے رائچور میں کیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے دل جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے"

ہراس نے ان سطور کو لکھتے وقت بیجا پور کو بالکل فراموش کر گیا ہے کہ کرشنا دیو رایا نے اس شہر سے کیا سلوک کیا تھا۔ اور بعد میں رام راج کے عہد میں احمد نگر پر ہندوؤں نے کس قسم کی تباہی لائی تھی۔ الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مندروں کو توڑ دیا۔ اور شہر کو آگ لگا دی ۔کیا بیجا پور میں کرشنا دیو رایا نے مسجدوں کو توڑ کر ہل نہیں چلا دیا تھا۔ کیا احمد نگر میں رام راج نے آگ نہیں لگائی تھی۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ انتقام لے۔ اس لئے اگر مسلمانوں نے وجیانگر کو اپنے جوش انتقام میں تباہ کر دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وجیانگر کی تباہی کا اثر

وجیانگر کی تباہی سے جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ میں جو انقلاب آیا۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے میسور گزیٹیر کا مصنف صفحہ ۲۰۸ پر لکھتا ہے :۔

(۱) اس تباہی نے ہندو طاقت کو جنوب میں ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔ گو سلطنت برائے نام اور ایک صدی تک دوسرے خاندان میں رہی ۔

(۲) آہستگی سے لیکن یقینی طور پر مسلمانوں کو جنوب پر حملہ آور ہونے کا راستہ کھل گیا ۔

(۳) ایک مضبوط سلطنت یعنے مرکز کے نہ ہونے سے جنوب میں ہر جگہ چھوٹی چھوٹی خود

مختار ریاستیں پیدا ہو گئیں۔

(۴) وجیانگر کے زوال کے ساتھ ہی پرتگالیوں پر بھی زوال آگیا۔ جن کی تجارت اس ملک میں ایک وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ علاوہ دوسری اشیا کے صرف گھوڑوں کی تجارت سے انہیں ۱½ لاکھ ڈوکٹ (ایک پرتگالی سکہ) سالانہ وصول ہوتے تھے۔ ہر سال جنوبی ہندوستان سے پانچ لاکھ طلائی پگوڈا پرتگال کو بھیجے جاتے تھے۔

پرتگالی مورخ کوٹو لکھتا ہے :-

"سلطنت وجیانگر کی تباہی سے گوا کی تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ ہماری تجارت کا دارو مدار اسی سلطنت پر تھا۔ سلطنت وجیانگر کی تباہی کیا ہوئی گویا ہماری بربادی تھی۔ کہ اس دن سے گوا کے باشندوں کی مرفہ حالی کا خاتمہ ہو گیا"

وجیانگر کی تباہی کو اگر سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں نے سوائے اپنی توہین کا انتقام لینے کے اور کچھ نہیں کیا۔ جنوب کا وسیع ملک راس کماری تک کھلا ہوا تھا۔ اگر اس وقت وہ بڑھ کر قبضہ کر لیتے تو بعد میں ان کے جانشینوں کو جو مشکلات اس ملک کے فتح کرنے میں پیش آئیں۔ وہ پیش نہ آتیں۔ وجیانگر سے ان کی واپسی سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے جنوب میں ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ اور ملک ایک ایسی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا جو صدیوں تک جاری رہی۔

خاندانِ اراویدو

ترملا

۱۵۶۵ء تا ۱۵۷۲ء

معاصرین :- علی عادل شاہ (بیجاپور) مرتضیٰ نظام شاہ (احمد نگر)

گزشتہ سطور میں بتلایا جا چکا ہے کہ ترملا میدان جنگ سے فرار ہو کر پلگنڈہ میں مقیم ہوا۔ مسلمان فاتحین وجیانگر میں چھ ماہ ٹھہرنے کے بعد واپس ہوئے۔ انہوں نے واپسی کے وقت اپنی فوج کو رائچور اور مدگل کو فتح کرنے کیلئے بھیجا۔ (مسلمان جب بیجاپور سے جنگ کے لئے نکلے تو انہوں نے ان قلعوں پر توجہ نہیں کی تھی۔ اگر وہ راستوں میں ان قلعوں پر توجہ کرتے تو شاید جنگ کا نتیجہ کچھ اور نکلتا۔ ممکن تھا کہ ان کی ساری طاقت ان مقامات پر صرف ہو جاتی۔ بخلاف اس کے انہوں نے سیدھے وجیانگر پر چڑھائی کر دی اور نتیجہ ان کے حسب مراد نکلا) رائچور اور مدگل فتح ہو گئے۔ بیجاپور نے ان کا الحاق کر لیا۔ اور اس طرح دوآب رائچور جس پر قبضہ کے لئے ڈھائی سو سال سے ہندو اور مسلمانوں میں ہولناک اور متواتر خونریزیاں ہو رہی تھیں مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور اس طرح وجیانگر کی سلطنت کی حدود جو دریائے کرشنا کے شمال سے بہت دور تک پھیل گئی تھیں۔ اب دریائے تنگ بھدرا تک محدود ہو گئیں۔ فاتح مسلمان واپسی کے وقت رائچور کے قریب ٹھہرے۔ اور ان میں پھر نا اتفاقی پھیل گئی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ جنوب کا ملک کس طرح آپس میں تقسیم کیا جائے۔ اور اس نا اتفاقی کی وجہ سے وہ عرصہ تک جنوب پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

ترملا کو مسلمانوں کی نااتفاقی کی خبر مل چکی تھی۔ ان کی واپسی کے بعد اس نے پلکنڈہ سے نکل کر اس اجڑے ہوئے شہر وجیانگر کو آباد کرنے کی ٹھانی کہ اسے پائے تخت بنا سکے۔ تالیکوٹہ کی جنگ ۲۵ جنوری ۱۵۶۴ء میں ہوئی۔ ترملا پھر وجیانگر کو اسی سال ماہ جولائی میں واپس ہوا ترملا نے وجیانگر میں آکر پھر فوج کی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ اور احمد نگر کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ سے اس نے دوستی کر لی تھی۔ اور دوسری طرف پرتگال والوں سے گھوڑے خریدے پرتگالی مورخ لکھتے ہیں:-

"ترملا نے گھوڑے خرید کر کے اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ جس کی وجہ سے پرتگالیوں کو سخت نقصان پہنچا"

میسور گزیٹیر کا مصنف صفحہ ۲۰۸۳ پر لکھتا ہے:-

"ملک کی خوش حالی اور فوج کی طاقت کا بہت بڑا راز پرتگال والوں سے تجارت میں مضمر تھا۔ ترملا نے گھوڑوں کی رقم نہ دیکر اپنے آپ کو بہت نقصان پہونچایا"

ترملا کی اس تیاری اور ان سازشوں کا حال جو اس نے پھر شروع کی تھی۔ جب بیجاپور میں معلوم ہوا۔ تو علی عادل شاہ نے پھر وجیانگر کا رخ کیا۔ لیکن اس وقت ترملا کی حمایت پر احمد نگر کی سلطانہ خونزہ ہمایون تھی۔ اس نے بیجاپور کے مقبوضات پر چڑھائی کر دی علی عادل واپس پلٹ گیا۔ لیکن اپنے جنرل کشور خان کو وجیانگر پر حملہ کرنے کیلئے بھیجدیا۔ یہ دیکھکر ترملا ہمیشہ کے لئے وجیانگر کو چھوڑ کر پلکنڈہ واپس آگیا۔ اس کے دوسرے سال یعنے ۱۵۶۵ء میں بیجاپور کے جنرل کشور خان نے ادہونی پر قبضہ کر لیا۔ ادہونی کا قلعہ تمام جنوبی ہند کی کنجی مانا جاتا تھا۔ بہمنی سلاطین عرصہ تک اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے

لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت جب وجیانگر تباہ ہوگیا تو یہاں کا ہندو گورنر خود مختار ہوگیا تھا۔ کشور خان نے ایک سخت محاصرہ کرتے ہوئے اس کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ادہونی کی فتح سے اضلاع بلاری و کرنول کا راستہ مسلمانوں کیلئے کھل گیا۔ لیکن مسلمانوں کی نا اتفاقی نے بیجاپور والوں کو اور آگے بڑھنے نہ دیا۔ خوش قسمتی سے اس کے بعد گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور میں پھر معاہدہ ہوگیا۔ اسوقت آپس میں طے کر لیا گیا کہ بیجاپور والے جنوبی ہند پر اور گولکنڈہ والے مشرقی اضلاع پر جو دریائے کرشنا سے شمال میں تھیں۔ فتح کر لیں۔ گولکنڈہ والوں نے راجمندری پر قبضہ کر لیا۔ اور شمال میں اڑیسہ کے کلنگا خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن بیجاپور اپنے اندرونی معاملات میں ۱۵۷۳ء تک الجھا رہا۔

ترملا کی وجیانگر سے دوبارہ واپسی نے جنوبی ہند پر نہایت برا اثر ڈالا۔ اور اب ہندوؤں کو معلوم ہوگیا کہ جنوبی ہند کو بچانے کی طاقت فنا ہوگئی ہے۔ اس لیئے ہر جگہ مختلف راجہ اور گورنر خود مختار ہونا شروع ہوئے۔ خصوصاً اضلاع بلاری اور کرنول میں جو وجیانگر سے قریب تھے۔ تمام حاکم ترملا سے باغی ہوگئے۔ اور مغربی علاقہ کوکن بھی سرکش ہوگیا۔ لیکن پلکنڈہ کے جنوب میں یہ اثر فوراً محسوس نہیں ہوا۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رام راج کے عہد میں بہت سے اس کے ہی رشتہ دار یہاں کے حاکم بن گئے تھے۔

اسی سال ترملا نے برائے نام شہنشاہ راجہ سدا سیورایا کو زہر دیکر مار دیا۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے:۔

”ترمل راج کے بیٹے ونکٹ رائل نے سدا سیورایا کو قتل کر دیا۔“

سدا سیورایا کے قتل سے وجیانگر کے تیسرے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ سدا سیورایا کے

کوئی اولاد نہیں تھی۔ سدا سیورایا کے بعد ترملا خود تخت نشین ہوا۔ اس کی اس تخت نشینی سے سلطنت میں اور بھی ابتری پھیل گئی۔ رام راج کے بیٹے اپنے آپ کو تخت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لئے ترملا اور رام راج کے لڑکوں میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں ایک نے علی عادل کے پاس جاکر اناگنڈی میں ٹھہرنے کی اجازت چاہی جو دیدی گئی۔

سنہ ۱۵۷۰ء میں بیجاپور کے مسلمانوں نے دکن کے معاملات سے فراغت پاکر پھر جنوب کی طرف توجہ کی۔ اور اس دفعہ انہوں نے ملک کے مغربی حصہ پر حملہ کیا۔ دھاڑواڑ، بنکور، ملک کوکن کے بعض علاقے فتح کر لئے گئے۔ اور جنوب میں چندرگیری پر جو موجودہ ضلع شیموگہ میں ہے۔ ان کا قبضہ ہو گیا۔

ترملا کا عہد سنہ ۱۵۷۲ء میں ختم ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سری رنگا رائل تخت نشین ہوا۔

سری رنگا رائل

سنہ ۱۵۷۲ء تا سنہ ۱۵۸۶ء

اس کی تخت نشینی کے تیسرے سال میں بیجاپور کے مسلمانوں نے (جو تمام مغربی ساحلی علاقہ کو ضلع جنوبی کنارا تک فتح کر چکے تھے) پنکنڈہ پر چڑھائی کر دی۔ یہ دوسرا قدم تھا جو وجیانگر کے بعد جنوب میں انہوں نے اٹھایا۔ محاصرہ کی سختی کو دیکھکر سری رنگا نے بنکور کے ہندو پالیگاروں کو رشوت بھیجی۔ جس کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے بیجاپور والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان محاصرہ اٹھاکر واپس ہو گئے۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ والوں نے وجیانگر کے مشرقی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ جنرل حیدر الملک نے ونوکنڈہ

(ضلع نلور) پر چڑھائی کی۔ جس طرح وجیانگر سے جنوب میں پلگنڈہ ایک اور مضبوط مقام تھا۔ ونوکنڈہ بھی مشرق میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ یہاں ایک سخت جنگ ہوئی۔ جس میں رام راج کے ایک بیٹے کو مسلمانوں نے گرفتار کرکے گولکنڈہ کو بھیجدیا۔ ونوکنڈہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے کھم (موجودہ ضلع کرنول) فتح کرلیا۔ اور اس علاقہ پر ایک برہمن راجہ راؤ کو حاکم بنایا گیا۔ سری رنگا کی وفات ۱۵۸۶ء میں ہوئی۔

ونکٹ پتی رائل

۱۵۸۶ء - ۱۶۱۴ء

سری رنگا کی وفات کے بعد اس کا بھائی رام رائل تخت نشین ہوا۔ لیکن اسی سال چند روز کے بعد اس کے انتقال پر ونکٹ پتی رائل تخت نشین ہوا۔

اس عرصہ میں گولکنڈہ کے مسلمان جزیرہ نما کے شمال مشرقی حصہ پر بتدریج قبضہ کر رہے تھے۔ تخت نشینی کے بعد ونکٹ پتی رائل نے چاہا کہ گولکنڈہ والوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا جائے۔ اس لئے اس نے ان مقبوضات پر حملہ کیا جو گولکنڈہ کے ماتحت آچکے تھے۔ گولکنڈہ والوں نے اس کے جواب میں دوسری طرف سے پلگنڈہ پر حملہ کر دیا۔ محاصرہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اور گولکنڈہ والے واپس ہوئے۔ انکی واپسی نے ونکٹ پتی رائل کو اور جرأت دلادی۔ اس نے اودگیری (ضلع نلور) کے راجہ کو خط لکھا۔ کہ مسلمانوں پر حملہ کیا جائے اس نے خود بھی بہت سی فوج اس کی تائید کے لئے بھیجدی۔ اس خبر کو سن کر راجہ راؤ جو گولکنڈہ کی جانب سے ونوکنڈہ پر حاکم تھا۔ مدافعت کے لئے نکلا۔ اور جنگ میں اودگیری والوں کو شکست ہوئی۔ مسلمانوں نے یہاں سے بڑھکر خاص اودگیری (ضلع نلور) پر قبضہ کرلیا۔

مشرقی علاقے میں جب یہ واقعات ہو رہے تھے۔ تو مغربی علاقے میں بیجاپور کی فتوحات روکنے کے لیے ونکٹ پتی رائل نے احمد نگر والوں سے اتحاد کر لیا کہ بیجاپور کے خلاف متحدہ قوت سے کارروائی کریں۔ علی عادل کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے پھر پلگنڈہ پر چڑھائی کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ونکٹ پتی رایل کو شہر پلگنڈہ چھوڑ کر چندرگیری میں پناہ لینی پڑی۔ پلگنڈہ پر ۱۵۹۲ء میں مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ (اگر نقشہ دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اب مسلمان بیجاپور سے لیکر نیچے میسور کی سرحد تک تمام ملک پر قابض ہو چکے تھے۔ اور مشرق میں دریائے کرشنا سے نیچے کرنول اور نلور کا علاقہ گولکنڈہ والوں کے قبضہ میں آ چکا تھا)

اس سال کے بعد دکن یعنے بیجاپور یا گولکنڈہ کے مسلمانوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ اس لئے کہ ان کی شمالی سرحدوں پر ان کے خلاف ایک اور زبردست طاقت صف آرا ہو گئی تھی۔ یہ طاقت مغلوں کی تھی۔ دہلی کے تخت پر اس وقت مغل شہنشاہ اکبر حکمراں تھا۔

مورخ ہراس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے :۔

"اکبر نے ونکٹ پتی رائل کے پاس اپنے سفیر کو بھیجکر دکن کے مسلمانوں کے خلاف مدد چاہی۔ لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت ہندوؤں نے خیال کیا کہ دکن کی سلطنتیں فتح ہونے کے بعد مغل جنوبی ہند پر قبضہ کر لیں گے۔"

یہی مورخ یہ بھی لکھتا ہے :۔

"ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے بھی ونکٹ پتی رائل سے مغلوں کے خلاف مدد چاہی۔ لیکن اب ہندوؤں نے یہی مصلحت سمجھا کہ کسی فریق کو بھی مدد نہ دی جائے۔"

مورخ ہراس کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس وقت ونکٹ پتی رائل کی توجہ خالص اندرونی معاملات پر تھی۔ پلگنڈہ سے پائے تخت کی تبدیلی نے سلطنت کے اثر و اقتدار پر اور بھی مہلک اثر ڈالا۔ میسور، تنجاور، مدورا اور جنجی کے راجہ باغی ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ میسور یعنی سرنگا پٹم سے وجیانگر کے وائسرائے کو بھی نکال دیا گیا۔ ونکٹ پتی رائل نے ان باغی سرداروں کی جانب توجہ کی اور اسی سلسلہ میں اس نے چندر گیری کو چھوڑ کر ویلور کو اپنا پائے تخت بنایا۔ کہ کم از کم جنوب کے درمیانی حصہ میں تو رہے۔ یہاں سے اس نے ایک دفعہ پرتگال والوں پر بھی (جو سنٹ تھامس مونٹ میں تھے) فوج کشی کی۔ لیکن خود اسی کے ایک سردار نے پرتگال والوں کو مدد دیکر اس کو شکست دیدی۔

ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"اس سے خوش ہو کر پرتگال کے بادشاہ فلپ سوم (Phillip III) نے باغی سردار رگھوناتھ کا شکریہ ادا کیا۔"

اس کے عہد کے آخری سالوں میں خود اس کے خاندان میں ولی عہدی کے معاملہ پر نفاق پیدا ہو گیا۔ موت سے تین دن پیشتر اس نے سری رنگا سوم کو اپنا جانشین منتخب کیا۔

مقامی ہندو تاریخوں میں لکھا ہے کہ ونکٹ پتی رائل کے زمانہ میں ہندو مذہب میں ویشنو عقاید کو بہت تقویت ملی۔ اور یہ عقاید تمام جنوبی ہند میں پھیل گئے۔ ترپتی کے مندر کو بھی اسی زمانہ میں اہمیت حاصل ہوئی۔ ونکٹ پتی رائل نے ترپتی میں منادر تعمیر کئے۔ اور اسکی تقلید میں اس وقت ہندو رئیسوں نے بھی بہت سی تعمیرات کیں۔

باوجودیکہ ملک کی سیاسی حالت بہت ابتر تھی۔ ونکٹ پتی رائل کے عہد میں علم ادب اور شاعری نے خوب ترقی کی۔ ونکٹ پتی رائل کے دربار میں ہر روز و شب ہندوؤں کے مختلف

عقائد کے عالم بحث و مباحثہ کرتے تھے۔

مورخ ہراس لکھتا ہے :-

"جسیوٹ فرقے کے عیسائی پادری بھی ان میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے کے شاعروں میں ایک ہندو شاعرہ رام بھدرامبا بہت مشہور ہوئی ہے۔"

گو ونکٹ پتی رائل کے بعد اس خاندان میں اور چار راجاؤں کے نام آتے ہیں۔ یعنے سری رنگا رائل (۱۶۱۴ء - ۱۶۱۵ء) راما دیو رائل (۱۶۱۵ء - ۱۶۳۰ء) ونکٹ پتی رائل (۱۶۳۰ء - ۱۶۴۲ء) اور سری رنگا رائل (۱۶۴۲ء - ۱۶۴۴ء) لیکن وجیانگر کی سلطنت کی بچی کچی شان و شوکت ونکٹ پتی رائل کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اور ان راجاؤں کی حالت ایک معمولی پالیگار سے کچھ بڑھ کر نہ رہی نہ صرف دوسرے پالیگار اور راجاؤں نے انکی رہی سہی قوت کو چھین لیا۔ بلکہ خاندان میں بھی نااتفاقی پیدا ہو گئی۔

ونکٹ پتی رائل کے بعد سری رنگا رائل تخت پر بیٹھا۔ مگر اندرونی سازشوں نے ایک ہی سال میں اس کو تخت سے دست برداری پر مجبور کر دیا۔

پس کرشنا سوامی اینگار اپنی تاریخ ہند کے صفحہ ۲۷۱ پر لکھتا ہے :-

"اور اسی سال اس کی وفات بھی ہو گئی۔ اسکے بعد راما دیوا رائل تخت نشین ہوا۔ لیکن خاندان کا ایک اور شخص جگ رایا تخت کا دعویدار رہا۔ اور اس کی حمایت پر تنجاور کا راجہ تھا۔ جنگ میں جگ رایا کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے امید ہو چکی تھی کہ راما دیوا رائل کا اقتدار بحال ہو جائیگا۔ لیکن اسی وقت مدورا کا نایک جو جنوب میں سب سے زبردست تھا۔ رام دیوا کے خلاف ہو گیا۔"

مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

"اگر مدور والے اس وقت مخالفت نہ کرتے تو تمام ملک میں پھر ہندو سلطنت

قایم ہو جاتی۔ لیکن یہ آخری امید بھی ختم ہو گئی"

پرتگال والے ابتک مشرقی علاقہ میں صرف تجارت پر قانع تھے لیکن اس سال سے انہوں نے بھی ملک کی حالت دیکھکر ان بندرگاہوں پر فوجی قبضہ کر لیا۔ جہاں وہ تجارت کرتے تھے۔

پرتگالی مورخ براڈاس لکھتا ہے :-

"اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سنٹ تھامس مونٹ (سینٹ دارم) کے پرتگالی

تاجروں نے جواب تک خراج اور محصول ادا کرتے تھے۔ اس علاقہ کو بادشاہ پرتگال

کی ملکیت قرار دے دیا۔ اور انہوں نے بڑھکر اطراف کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا"

ملک میں یہ خانہ جنگی اسی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ رام دیوا کا انتقال ہو گیا۔ اور وینکٹ پتی رائل دوم تخت نشین ہوا۔ اور اس کی حکومت ویلور اور اس کے مضافات تک محدود تھی لیکن وجیانگر کی دھاک ملک میں ابھی باقی تھی۔ اس لئے امراء اپنے اپنے فائدہ کے لئے شہنشاہ کے نام سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس کے عہد کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے (East-India Co) اپنی تجارت کے لئے مدراس کی بندرگاہ ۱۶۳۹ء میں پونا ملے کے ہندو راجہ وینکٹ دری نایک سے حاصل کی۔

اسی خانہ جنگی کی حالت میں ۱۶۴۲ء میں وینکٹ پتی رائل کا انتقال ہو گیا۔ اور سری رنگا رائل چہارم تخت نشین ہوا۔ لیکن اسی سال بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسلمانوں نے ویلور پر قبضہ کر لیا سری رنگا یہاں سے فرار ہو کر بدنور (میسور) کے نایک کے پاس پناہ گزین ہوا۔

ڈاکٹر کرشنا سوامی اینگار نے اپنی تاریخ ہند کے صفحہ ۲۷۱ پر لکھا ہے :-

"سری رنگا رائل نے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کو مدد کے لئے خط لکھا۔ اس خط میں

لکھا گیا تھا کہ اگر جنوب کا تمام ملک اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ مسلمان ہو جائیگا

لیکن شاہ جہاں نے توجہ نہیں کی "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں اب ان راجاؤں کو جو وجیانگر کے نام لیوا تھے۔ کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ سری رنگا رائل کے آخری دن پلگنڈہ میں بسر ہوئے جہاں سنہ ۱۶۶۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا کوتھنڈارا ما برائے نام راجہ ہوا۔ اور اس کی حیثیت ایک معمولی پالیگار سے زیادہ نہیں تھی۔ کوتھنڈاراما کے بعد پلگنڈہ کی حکومت سنہ ۱۷۰۴ء تک اسی خاندان کے ماتحت رہی اور یہ پالیگار پہلے بیجاپور کو اور بعد میں سلطنت مغلیہ کو خراج دیتے رہے۔ ملکی انقلاب نے ان کو یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ سنہ ۱۷۰۴ء میں وہ یہاں سے نکلکر اناگندی میں جاکر پناہ گزین ہوگئے۔

(نوٹ :۔ اناگندی میں رام راج کی اولاد حکمران تھی۔ جنگ تالیکوٹہ کے بعد رام راج کے ایک بیٹے تمراج نے علی عادل شاہ کے پاس پناہ لی تھی۔ علی عادل نے تمراج کو اناگندی کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ (تاریخ فرشتہ) اس زمانہ سے یہ خاندان ابھی تک اناگندی میں ہے)

حکومتِ وجیانگر کی بنیاد اسی شہر سے پڑی۔ وسعت پذیر ہوی۔
اور پھر سمٹ کر اسی خطہ پر آ گئی ۔

تاریخ میں اناگندی کا ذکر پھر سنہ ۱۷۷۶ء میں آتا ہے ۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

" ٹیپو سلطان نے سنہ ۱۷۷۶ء میں اناگندی پر قبضہ کرتے ہوئے اس شہر اور اس کے مضافات کو جلاکر تباہ کر دیا تھا "

کرنل ولکس کی اس روایت کو دوسرے انگریزی اور ہند و مورخین نے لیا ہے۔ میسور گزیٹیر کا مصنف بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴۲۰ پر اسی روایت کو نقل کرتا ہے۔

ٹیپو سلطان کو بدنام کرنے میں مغربی مورخین نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ تعجب ہے کہ اس زمانہ کے مورخ بھی آنکھ بند کرکے ان کی ہی تقلید کر رہے ہیں۔

ولکس نے اس واقعہ کا سال ۱۷۸۶ء دیا ہے۔ یہ زمانہ ٹیپو سلطان کا نہیں بلکہ حیدر علی کا تھا۔ اور اس وقت مرہٹوں اور حیدر علی میں جنگ ہو رہی تھی۔ اپنے باپ کی فوج کی کمان کرتے ہوئے ٹیپو سلطان نے اناگندی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن نہ اس کو جلایا اور نہ تباہ کیا۔ بلکہ اس کے خلاف اس قدیم خاندان کی عظمت و توقیر کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو نذر گذارنے اور دربار میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کو سفید چتر (جو شاہی نشان ہے) پکڑنے کی اجازت دیگئی۔ اور اپنی ریاست میں ٹکسال قایم کرنے کی اجازت دیتے ہوئے اندرونی خود مختاری بھی دیدی۔ کیا اس سے بہتر سلوک ممکن تھا؟ کہاں یہ سلوک اور کہاں ولکس کی روایت؟

مذکورۂ بالا تحریر کے ثبوت میں ذیل کی تحریرات دی جاتی ہیں جو ۱۷۸۶ء کے قریب کے زمانے ہی میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں ایک تحریر حیدرآباد کے اس انگریزی رزیڈنٹ کی ہے جو ۱۷۸۵ء میں حیدرآباد میں تھا۔ اس نے اپنی کتاب ہسٹوریکل انڈ پولٹیکل ویو آف دی ڈکن کے صفحہ ۱۴ پر لکھا ہے: (یہ کتاب ۱۷۹۴ء میں لندن میں شائع ہوی تھی) یہ کتاب اس نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد لکھی تھی۔ جسمیں انگریز مرہٹے اور حیدرآباد نے ٹیپو سلطان پر فتح پا کر سلطنتِ خداداد کے آدھے حصے پر قابض ہوگئے تھے۔ ان مقبوضات میں دوآبہ رائچور بھی تھا۔ جو حیدرآباد کے حوالے کر دیا گیا۔ سلطان نے دوآبہ رائچور کو دینا منظور تو کر لیا۔ لیکن اناگندی کو حوالے کرنیسے انکار کیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کتاب میں

میں لکھا ہے :-

" یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیپو ملک کی تقسیم کے وقت اناگنڈی کو حوالے کرنے سے کیوں انکار کرتا ہے۔ اس سے ٹیپو کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ چھوٹی سی ریاست جس کا رقبہ بیس مربع میل ہے اس عظیم الشان سلطنت کی یادگار ہے۔ جس نے کبھی تمام ملک پر حکمرانی کی تھی۔ اس وقت رام راج کی اولاد یہاں حکمران ہے۔ اس کے حکمران کو رائل کہا جاتا ہے۔ جو مہاراجہ کا ہم معنی خطاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں ایک رجسٹر رکھا ہوا ہے۔ جس میں جنوبی ہند کے تمام واقعات لکھے جاتے ہیں۔ شاید یہ اسی موہوم امید پر ہے کہ پھر یہ ملک کبھی ان کے قبضہ میں آجائیگا۔ اس ریاست کی آمدنی ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ اور اس کی ایک خاص ٹکسال بھی ہے۔ جس میں سکے ڈھالے جاتے ہیں۔ اس ٹکسال کی اجازت ٹیپو نے دے رکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس قدیم خاندان کی عظمت کو قایم رکھنے کیلئے انہیں اندرون ملک میں کامل خودمختاری دے رکھی ہے۔"

ایک اور انگریز افسر میجر رنل (Rennel) جو میسور کی تیسری جنگ میں شریک تھا اپنے تذکرہ (Memoires) میں لکھتا ہے :-

" اتحادیوں (انگریز، مرہٹے اور حیدرآباد) نے ٹیپو کا آدھا ملک لے لیا۔ نورا پچور کا دوآبہ حیدرآباد کے حصہ میں آیا۔ لیکن ٹیپو نے اناگنڈی کا علاقہ اتحادیوں کے حوالے کرنا منظور نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں قدیم راجگان وجیانگر کا خاندان آباد ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس خاندان کو کوئی گزند پہونچے۔ شاید اس کو خوف ہے کہ اس علاقہ کو اتحادیوں کے حوالے کر دینے سے اس قدیم خاندان کو کوئی نقصان پہونچے گا

اوران کی آزادی چھن جائے گی۔ اس جذبہ کیلئے ٹیپو ہماری تعریف کا مستحق ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر کتاب سیاحت نامہ کیپٹن لٹل میں درج ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۴ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ ان عینی شواہد کے ہوتے ہوئے ولکس کی روایت پر جو اس واقعہ کے قریب اسّی سال بعد لکھی گئی ہے۔ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کتاب پر چھوڑا جاتا ہے۔

اناگندی کا یہ علاقہ اس وقت ریاست حیدرآباد میں شامل ہے۔ اور ابھی تک یعنے ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ میں رام راج کی اولاد یہاں آباد اور حکمران ہے۔ اور حیدرآباد کی سرکاری اصطلاح میں اس کو اناگندی سمستان کہا جاتا ہے۔

زوالِ وجیانگر کے بعد

تالیکوٹہ کی جنگ ۱۵۶۵ء میں ہوئی۔ وجیانگر کی تاریخ کا سلسلہ قایم رکھنے کے لیے بعد کے واقعات بھی جو اس سلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ اخیر تک یعنے ۱۶۴۲ء تک لکھدیئے گئے ہیں۔ جبکہ اس سال اس سلطنت کی آخری شمع بھی گل ہوگئی۔ تاریخی لحاظ سے ۸۰ سال کا یہ زمانہ دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا۔ ۱۵۶۵ء سے ۱۵۹۲ء تک۔ ۲۷ سال

دوسرا۔ ۱۵۹۲ء سے ۱۶۳۷ء تک۔

"تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد ۲۷ سال کا پہلا دور دونوں قوموں کی باہمی جدال و قتال میں گذرا۔ ہندو چاہتے تھے کہ اپنا ملک دوبارہ حاصل کریں۔ یا کم از کم ملک کا جو حصہ ابھی ان کے قبضہ میں تھا اس کو مسلمانوں سے محفوظ رکھیں۔ مسلمان چاہتے تھے کہ اپنی فتوحات بڑھائیں۔

اور باقی ملک بھی اپنے قبضہ میں لائیں۔ ان مقاصد میں دونوں ناکامیاب رہے۔

(۱) تالیکوٹہ کی جنگ سے ہندوؤں کا شیرازہ بکھر گیا۔ ان میں آپس میں نااتفاقی پھیل گئی۔ وہ اس قابل نہ رہے کہ ملک کی مدافعت کر سکتے۔ ہر سردار یہی چاہتا تھا کہ آزاد ہو کر جس قدر ملک ملے۔ اپنے قبضہ میں کر لے۔ اس طرح ہندوؤں نے خود اس سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

(۲) مسلمان فتح سے سرشار تھے۔ ان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اس فتح سے فائدہ اٹھا کر اسی وقت پورے ملک پر قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن فتح کے بعد پھر ان میں نااتفاقی پھیل گئی۔ ان کی متحدہ قوت پریشان ہو گئی۔ اور ان کی سلطنتیں پھر ایک دوسرے کے خلاف ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنوب پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ ۲۷ سال کے عرصہ میں صرف اتنا ہوا کہ مشرق میں گولکنڈہ والے دریائے کرشنا کے جنوب میں کرنول اور نلور پر قبضہ کر سکے۔ اور بیجاپور والے موجودہ میسور کی شمالی سرحد تک پہونچے۔ اور ان مفتوحہ ممالک میں کہیں کہیں ان کی نوآبادیاں بھی قایم ہو گئیں۔

دوسرا دور ۱۵۹۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سال مسلمانوں کی فوجیں جنوبی ہندوستان کو چھوڑ کر دکن کو واپس چلی گئیں۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں شمالی سرحد پر ایک زبردست طاقت جو مغلوں کی تھی۔ صف آرا ہو چکی تھی۔

یہ ایک ایسا نادر موقع تھا۔ کہ اگر ہندو چاہتے تو پھر دریائے کرشنا تک کا پورا ملک ان کے قبضہ میں آ جاتا۔ ان کے سدراہ کوئی طاقت نہیں تھی۔ تمام ملک مسلمانوں سے خالی تھا۔ ڈھائی سو سال پیشتر سلطان محمد بن تغلق کے بعد جب دکن میں مسلمان ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف تھے۔ تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں نے وجیانگر کی سلطنت قایم کی تھی۔ لیکن اب ایک ایسا ہی موقع جب انہیں حاصل ہوا تو انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ اس کے عوض

ان کی آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی اور بھی بڑھ گئی ۔ اور خود انہوں نے وجیا نگر کی جھلملاتی شمع کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا ۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں پیدا ہوئیں ۔ جن کے حاکموں کو جنوبی ہند میں پالیگار کہا جاتا ہے ۔ ان پالیگاروں میں بعض تو اس قدر چھوٹے تھے کہ ان کے ماتحت صرف چند دیہات کے سوائے اور کچھ نہ تھا ۔ اور بعض طاقتور اور ایک وسیع رقبہ کے مالک تھے ۔ ان میں تنجاور ، مدورا اور میسور کی ریاستیں بہت زیادہ نمایاں ہوئیں ۔ ملک میں ہندوؤں کی یہ خانہ جنگی اسی طرح جاری تھی کہ ۱۹۳۷ء میں مسلمان جنوب پر پھر حملہ آور ہوئے تو تمام ملک صرف ایک سال کے عرصہ میں فاتحین کے قبضہ میں آ گیا ۔

جنوبی ہند میں مغلوں کی آمد

اس تمام عرصہ میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دکن کی مسلمان سلطنتیں نہ صرف مغلوں سے جنگ میں مصروف تھیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے بھی لڑتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اس کے ۳۶ سال بعد بیجا پور اور گولکنڈہ مغلوں کے باجگذار بن گئے۔ اس وقت دکن کا صوبہ دار شہزادہ عالمگیر اورنگ زیب تھا۔ اس نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ اور بیجا پور کی اسلامی فوجوں کو اس ملک کو فتح کرنے کا حکم دیا۔ بیجا پور کی فوج ۱۶۳۷ء میں بیجا پور سے نکلی۔ ایک طوفان تھا جو بیجا پور سے اٹھا۔ اور جنوبی ہند پر چھا گیا۔ اس فوج کی کمان بیجا پور کے مشہور جنرل رن دولہ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کا نائب مشہور مرہٹہ سردار شاہ جی تھا۔ رن دولہ خاں بیجا پور سے نکلا اور ایک سال کے اندر اندر بنکاپور، ہری ہر، بسواپٹن، تریکرہ، کاولدرگ سب اس کی زد میں آگئے۔ یہاں سے وہ سرنگاپٹم پر بڑھا۔ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ محاصرہ اٹھا کر رن دولہ خان نے میکوٹ پر چڑھائی کی۔ اس کو فتح کرنے کے بعد بیجا پور کی فوج بنگلور پر بڑھی۔ اس وقت یہاں ماگڑی کیمپے گوڈا کی حکومت تھی۔ جنگ میں کیمپے گوڈا کو شکست ہوئی ۱۶۳۹ء میں بنگلور پر قبضہ کر لیا گیا۔ بنگلور سے نکل کر ہسکوٹہ، کولار، ویلور اور جنجی کو قبضہ میں کر کے رن دولہ خاں پھر بنگلور واپس ہوا۔ اور یہاں سے بڑا بالا پور، سرا اور پٹمدرگ پر اسی سال قبضہ کر لیا گیا۔ اس کا صدر مقام بنگلور تجویز ہوا لیکن بعد میں سرا کا انتخاب کیا گیا۔ بنگلور اور جنجی شاہ جی کو خدمات کے صلے میں بطور جاگیر دیدیئے گئے۔ اس طرح ایک سال کے اندر اندر جنوبی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ

میں آگیا۔ اوران کی نوآبادیاں یہاں قایم ہوگیئں (بلاری، اننت پور، میسور اور پائیں گھاٹ میں ضلع جنوبی ارکاٹ تک جس قدر مسلمان آبادی پائی جاتی ہے۔ وہ سب کی سب بیجاپور سے آئے ہوئے مسلمانوں کی ہے۔ اورانہیں مسلمانوں میں ملے جلے اہل نوایط بھی جنوبی ہند میں آئے اس سے پہلے اہل نوائط مرہٹواڑی اورکوکن کے ساحل پرآباد تھے۔ اوران کے بہت سے خاندان بہمنی سلطنت اور دکن کی دوسری پانچ سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ فرشتہ کی تاریخ میں ان خاندانوں کے بہت سے نام ملتے ہیں۔ اہل نوایط جب جنوب میں آئے توان کی کثیر تعداد ضلع جنوبی ارکاٹ یعنے جنجی اور ویلور کے قرب وجوار میں آباد ہوئی۔ بنگلور کی جاگیر مرہٹہ شاہ جی کو دیدی گئی تھی۔ اس لئے مرہٹے بھی جنوب میں آکر آباد ہونے شروع ہوئے۔)

مورخ ولکس لکھتا ہے:۔

"مرہٹوں سے مراد وہ مرہٹے نہیں جو شہروں میں درزی کا پیشہ کرتے ہیں۔ یہ نامدیو مرہٹے ہیں۔ یہاں مرہٹوں سے مراد وہ جنگی قوم ہے جو راجپوت النسل سے ہیں اوراب بھی میسور وغیرہ کی فوج میں ملازم ہیں۔"

مغلوں کی پالیسی

جنوب پر یہ حملہ اورنگ زیب کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی اگلی جنگوں میں کس طرح ملک تباہ ہوگیا تھا۔ اس لئے اس وقت اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جس ملک پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے عوض وہاں کے حاکم کو دوسرا نسبتاً غیر آباد علاقہ دیدیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علاقے بھی جو غیر آباد تھے آباد ہوگئے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۲۸ پر لکھتا ہے:۔

"حملہ آوروں کی پالیسی یہ تھی کہ صدر مقام پر قبضہ کرنے کے بعد اس علاقہ کا مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر وہاں کے مقامی سردار کو اسی علاقہ میں ایسی جگہ دی جائے جو زیادہ زرخیز نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام بنجر اور غیر مزروعہ زمینیں بھی قابل زراعت بن گئیں۔ اور لوگ وہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ حملہ آوروں نے بسوا پٹن لیکر وہاں کے پالیگاروں کو تریکرہ دیدیا۔ بنگلور لیکر کیپے گوڑا کو ماگڑی دیا گیا۔ ہسکوٹ کے عوض آنیکل، کولار کے عوض پنگنور۔ اور سرا کے عوض رتن گیری دئے گئے اس طرح تمام ملک آباد ہوگیا۔ اور زمینیں قابل زراعت بن گئیں"

مرہٹے اور مسلمان

جنوب کی فتوحات اور سرا کی صوبہ داری کو قایم ہوئے ابھی چند ماہ نہ گذرے تھے کہ عالمگیر اورنگ زیب کو دکن سے نکالکر گجرات کی صوبہ داری پر بھیجدیا گیا۔

"عالمگیر کی اس پالیسی کو اس کے بھائی داراشکوہ نے پسند نہیں کیا۔ اس نے اپنے باپ شاہجہاں سے کہہ کر عالمگیر کو گجرات کی صوبہ داری پر بھیجدیا۔

(تاریخ ہند از کرشنا سوامی اینگار)

عالمگیر کے جاتے ہی جنوب میں فتوحات بھی رک گئیں۔ اور ایک ایسا انقلاب آیا جس نے آئندہ مسلمانوں کو سالہا سال جنگوں میں مصروف رکھا۔ دکن سے عالمگیر کی گجرات کو تبدیلی شہنشاہ شاہجہاں کی ایک ایسی سیاسی غلطی تھی۔ جس کا خمیازہ مغلیہ سلطنت کو بری طرح بھگتنا پڑا۔ یہی معمولی سی غلطی عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث بن گئی۔ داراشکوہ

شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ لیکن امور سلطنت و سیاست میں بالکل کورا تھا۔ بخلاف اس کے عالمگیر نہایت دُوربین اور ماہر سیاست تھا۔ اس نے جنوب میں آئندہ پیدا ہونے والے خطرہ کو اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ اور یہ بھی جان چکا تھا کہ یہ اسلامی سلطنتیں مرہٹوں کے عروج کا باعث ہو رہی ہیں۔ اس لئے وہ انہیں مٹا دینا چاہتا تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اس کو ایسا نہ کرنے دیا۔

دکن کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے ملک مہاراشترا کو جو دکن کے مغربی جانب ہے۔ علاؤالدین کے زمانے میں ہی فتح کر لیا تھا۔ اور بعد میں بہمنی سلطنت کا اس پر تسلط ہوگیا۔ اس سلطنت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، بیدر اور گولکنڈہ کی سلطنتوں نے اس کے مختلف حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سالہا سال سے مسلمانوں اور مرہٹوں کی یکجائی نے لازمی طور پر مسلمانوں کے تمدن و معاشرت پر اثر ڈالا۔ دکنی مسلمان آہستہ آہستہ اس اثر کو قبول کر رہے تھے۔

ان سلطنتوں میں مرہٹے جاگیردار۔ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر تھے۔ لیکن پھر بھی دونوں قوموں میں غیریت باقی تھی۔ لیکن اس وقت جب دکن پر مغلوں کے حملے شروع ہوئے تو دکن کی ان سلطنتوں نے ایک نئی پالیسی اختیار کی۔ اور مغلوں کو غیر ملکی کہنے لگے۔ ان کے شاعروں نے اس وقت جو نظمیں لکھیں۔ اس میں مغلوں کو غیر ملکی اور مرہٹوں کو اپنا حلیف اور ملکی لکھا گیا ہے۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ دکن ان کا وطن بن گیا تھا۔ اور یہ کوئی غلطی نہیں تھی کہ مغلوں کو انہوں نے اگر غیر ملکی کہا۔ لیکن انہوں نے جو غلطی کی وہ یہی تھی کہ انہوں نے اس پالیسی سے یہ سمجھ لیا کہ مرہٹے اور جنوب کے ہندو وطنیت کے لحاظ سے ان کا ساتھ دیں گے تاریخ شاہد ہے کہ ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ انکی اس پالیسی سے جس نے فائدہ

اٹھایا وہ مرہٹوں کی ہندو قوم تھی۔ یعنے عالمگیر کو جس بات کا خطرہ تھا۔ آخر وہی ہو کر رہا۔

اس پالیسی کو عمل میں لانے کے لئے ضروری تھا کہ مرہٹوں سے اور زیادہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ انہوں نے اپنی باقاعدہ فوج میں مرہٹوں کو داخل کیا۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"ان کی باقاعدہ فوج کا بیشتر حصہ مرہٹوں پر مشتمل تھا۔"

ان تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تمدن و معاشرت میں مرہٹی اثر جو آہستہ آہستہ نفوذ کر رہا تھا۔ اور زیادہ نمایاں ہوگیا۔ نہ صرف ان کی شادی بیاہ وغیرہ کی رسموں میں مرہٹی رسم و رواج نے دخل پالیا۔ بلکہ محرم جو صرف غم حسینؑ کی مجلسوں تک محدود تھا۔ پورا مرہٹی رنگ میں رنگا گیا۔

(نوٹ :- اس رسم و رواج کا اثر ابھی تک دکن اور جنوبی ہند کے مسلمانوں میں باقی ہے۔ اس کے متعلق اس کتاب کے اخیر میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے)

دکن سے عالمگیر اپنے باپ شاہجہاں کے حکم سے جب واپس چلا گیا۔ تو بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے خراج بھیجنا بند کر دیا۔ اور باغی بن بیٹھے۔ لیکن ان کی آپس کی سیاسی رقابت اسی طرح جاری تھی۔ اور اپنے اپنے فائدہ کے لئے انہوں نے مرہٹوں کی تائید و بہی شروع کی۔ دکن میں حالات بد سے بدتر ہونے شروع ہوئے۔ مرہٹوں نے جو اب کافی زور پکڑ چکے تھے مغلوں کے علاقوں پر بھی چھاپے مارنا شروع کر دئے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ والے خفیہ طور پر ان کی مدد پر تھے۔ اور اس مدد سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مغلوں کو دکن سے نکال دیں۔ جب یہ حالات قابو سے باہر ہو گئے تو شاہجہاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے عالمگیر کو دوبارہ ۱۶۵۳ء میں دکن میں بھیجا۔ اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ عالمگیر نے اس وقت بھی چاہا کہ بیجاپور

اور گولکنڈہ کو جو مرہٹوں کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن شاہ جہاں نے پھر وہی غلطی کی اس نے عالمگیر کو حکم دیا کہ ان اسلامی سلطنتوں سے تعرض نہ کیا جائے۔ بلکہ مرہٹوں پر توجہ کرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹی طاقت مغلوب نہ ہو سکی۔ ابھی یہ لڑائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہجہاں بیمار پڑا۔ اور بھائیوں میں تخت کے لیئے جنگ چھڑ گئی۔ عالمگیر ۱۶۵۶ء میں دکن چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا۔

مرہٹے

جنوبی ہند اور سیواجی

گذشتہ باب میں مرہٹوں کا تذکرہ آچکا ہے جو اس تاریخ میں ایک نیا عنصر ہے۔ اور کہیں یہ لکھا گیا ہے کہ ۱۶۳۷ء میں عالمگیر کے حکم سے جب بیجاپوری جنرل رن دولہ خاں نے جنوب پر حملہ کیا۔ تو مرہٹہ سردار شاہ جی اس کا نایب تھا اور اس کی خدمات کے صلے میں اسکو بنگلور اور جنجی کے علاقے بطور جاگیر دیئے گئے تھے۔

شاہ جی نے دکن اور جنوب کے حالات کا غور سے مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی ہندو سلطنت قایم کرنے کی تجویز کرنی شروع کی۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور کے صفحہ ۶۴ پر لکھتا ہے:-

"شاہ جی ملک سے بہت زیادہ لگان حاصل کرتا تھا۔ اس کا ایک حصہ تو بیجاپور بھیجدیا جاتا تھا۔ اور دوسرا حصہ آئندہ بغاوت کے لیئے محفوظ رکھتا تھا۔ جنوب میں آنے سے پہلے ہی اس کی ایک جاگیر پونہ میں تھی۔ یہاں اس کا بڑا لڑکا سیواجی

تربیت پا رہا تھا۔ اس جاگیر کا انتظام دادا جی پنتھ کے ہاتھ میں تھا۔ جو نہایت
رازداری سے کام کرتا ہوا سیواجی کو فوجی تربیت دے رہا تھا سیواجی خود بھی
نہایت ذہین تھا۔ اس نے اپنی عمر کے سترہ سال میں ایک جتھا جمع کر کے لوٹ مار
شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ دکن کی اسلامی
سلطنتوں کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ بیجا پور کے چند امرائے بھانپ لیا کہ سیواجی
جو کچھ کر رہا ہے وہ باپ کے اشارے سے کر رہا ہے۔ شاہ جی کو دربار میں طلب کیا گیا۔
لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ سیواجی کی ماں کو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ اور
سیواجی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بیجاپور والوں نے اسے قید کر دیا۔"

شاہ جی کا اپنے بیٹے سیواجی سے تعلق تھا یا نہیں اس کے متعلق یہی مورخ اپنی تاریخ میں
لکھتا ہے:۔

" شاہ جی کا ایک خط اس کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کا تعلق اپنے بیٹے سے ضرور تھا۔
اس خط میں اس نے سیواجی کو لکھا تھا کہ " اگر تو میرا بیٹا ہے تو مڈل کے جاگیردار
باجی راؤ گھوڑ پڑے کو ضرور سزا دینا" باجی راؤ گھوڑ پڑے ایک دوسرا مرہٹہ
جاگیردار تھا۔ بیجاپور والوں نے شاہ کو اسی کے حوالے کیا تھا۔ شاہ جی کو قید میں
اس نے سخت تکلیفیں پہونچائی تھیں۔ بیجاپور نے شاہ جی کے قتل کا حکم بھی دیدیا
تھا۔ لیکن رن دولہ خان نے سفارش کر کے اس کی جان بچالی!"

اس کے بعد شاہ جی نے دربار میں پھر رسوخ حاصل کر لیا۔ اور اس نے اپنی شمالی جاگیر
جو پونا میں تھی سیواجی کو دیدی اور جنوب کی جاگیریں جو بنگلور اور جینجی میں تھیں۔ بیکوجی کو دیدی
گئیں۔ بیکوجی نے بعد میں باپ کے حکم سے تنجاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح شمال میں پونا اور

جنوب میں تھا اور اس نئی ہندو سلطنت کے مستقر قرار پائے جسکا تخیل شاہ جی کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

سیواجی کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ وہ دن بدن طاقت پکڑ رہا تھا۔ اور اسی طاقت کے مٹانے کے لیئے شاہ جہاں نے عالمگیر کو بھیجا تھا۔ اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ۱۶۵۶ء میں عالمگیر دکن چھوڑ کر دہلی چلا گیا تھا۔

ادہر تو عالمگیر شمالی ہندوستان میں بھائیوں سے لڑ رہا تھا اور اُدھر سیواجی نے او۔ زیادہ طاقت حاصل کرتے ہوئے مغلیہ سلطنت کے علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کردیے۔ عالمگیر ۱۶۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اور اس نے اپنے جنرل شائستہ خان اور راجہ جسونت سنگھ کو دکن بھیجا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ راجہ جسونت سنگھ غداری کرتے ہوئے سیواجی کو خفیہ طور پر مدد دیتا رہا۔ جس کی وجہ سے شائستہ خان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ شائستہ خان کے بعد شاہزادہ اعظم دکن کا صوبہ دار بن کر آیا۔ اب جسونت سنگھ نے یہی مناسب سمجھا کہ سیواجی کو کسی طرح راضی کر کے مغلیہ سلطنت کا ایک سردار بنا دے۔ آخر سیواجی کو ۱۶۶۶ء میں دہلی بھیجدیا گیا۔ جہاں اس کو پانچہزاری کا منصب عطا ہوا۔ لیکن سیواجی نے اس کو اپنی توہین سمجھی۔ سیواجی کو قید کردیا گیا۔ لیکن وہ قید سے فرار ہو کر پھر ۱۶۶۶ء میں مہاراشترا پہونچگیا۔ اور از سرنو مغلوں کا مقابلہ شروع کیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ سے بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے بھی محفوظ نہیں رہے۔ یہ اس قدر طاقتور ہوگیا کہ راجہ کا خطاب اختیار کرتے ہوئے ۱۶۷۴ء میں ستارہ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی پر مبارکباد دینے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنا ایک نائب شہر سورت سے روانہ کیا تھا۔ اس کا نام سر ہنری آکسنڈن تھا۔

تخت نشینی کے بعد اس نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ اس وقت بیجاپور اور گولکنڈہ میں
نااتفاقی تھی۔ سیواجی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے گولکنڈہ کے بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ
کو اپنی خدمات پیش کیں۔ اور اس میں اس کو کامیابی بھی ہوگئی۔ تاناشاہ کو یقین دلایا گیا۔ کہ
بیجاپور کے ماتحت جنوب میں جس قدر ملک ہے اس پر قبضہ کرکے گولکنڈہ کے حوالے کردیا
جائیگا۔ بیجاپور سے تو دشمنی تھی۔ اس لئے تاناشاہ نے اس کو قبول کرلیا۔ سیواجی کو یہ کامیابی
گولکنڈہ کے ہندو وزیر کی طرف سے ہوی۔ تاناشاہ کا وزیر اعظم مادنا پنڈت تھا۔ جس
نے سیواجی سے سازش کر رکھی تھی۔ اس سازش کا مقصد کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں
لکھتا ہے :-

"مادنا پنڈت اور سیواجی کے درمیان جو خفیہ عہدنامہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا
کہ بظاہر سیواجی گولکنڈہ کی مدد سے جنوبی ہند کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلے۔ اور در
باطن تمام مسلمانوں کو جنوبی ہند اور دکن سے نکالدے۔ اور آخر میں گولکنڈہ پر
بھی قبضہ کرلے"

بہرطور سیواجی اب گولکنڈہ کی ملازمت میں داخل ہوگیا۔ زمانہ کی یہ کس قدر ستم ظریفی
تھی، کہ مسلمانوں کو ملک سے خارج کرنے کے لئے مسلمانوں ہی سے مدد لی گئی۔ گولکنڈہ کی فوج کا
سپہ سالار ہوکر اس نے ۱۰۸۷ھ میں جنوب پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ مرہٹی فوج کی بھی بہت بڑی
تعداد تھی۔ اس وقت بیجاپور اپنی اندرونی سازشوں میں گرفتار تھا۔ اس نے جنوب میں اپنے
مقبوضات پر توجہ نہ کی۔ جس کی وجہ سے مقامی حکام بھی بالکل کمزور ہوچکے تھے۔ سیواجی کرنول
اور کڑپہ کے علاقوں سے نکلکر جنوب میں جنجی تک فتوحات کرتا ہوا پہونچ گیا۔ جنجی کے قلعہ دار
سدی عنبر نے نہایت سختی سے مدافعت کی۔ لیکن سیواجی نے جو عیاری میں یکتا تھا۔ دہوکہ سے

اس کو قتل کر دیا۔

یہاں تک تو بظاہر سیواجی گولکنڈہ کی ملازمت میں ہونے کا یقین دلاتا رہا۔ جنجی کا مضبوط قلعہ ہاتھ آتے ہی اس نے گولکنڈہ سے سرکشی اختیار کر لی۔ اور ہر جگہ گولکنڈہ کے مسلمان افسروں کو نکالکر مرہٹہ افسروں کو مقرر کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدراس کے رکارڈس میں لکھا ہے:۔

"چھٹی جون تک تو سیواجی اپنے آپ کو گولکنڈہ کا ملازم ظاہر کرتا رہا۔ تیسری جولائی کو معلوم ہوا کہ وہ گولکنڈہ کے افسروں کو نکال کر ہر جگہ اپنے مرہٹہ افسر مقرر کر رہا ہے۔" (چنگل پٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیر)

ان واقعات کی خبر جب تاناشاہ کو پہونچی تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن وہ کوئی عملی کارروائی نہ کرسکا۔ صرف اتنا ہوا کہ فوجی اخراجات کے لئے جو روپیہ بھیجا جاتا تھا۔ وہ بند کر دیا گیا۔ مرہٹے تو لوٹ اور غارتگری میں مشہور ہی تھے۔ انہوں نے ملک کو اس قدر لوٹا کہ مدراس کے مذکورۂ بالا رکارڈس میں بتاریخ ۳ اکتوبر لکھا گیا ہے:۔

"اگر یہ کہا جائے تو بالکل موزوں ہوگا کہ ملک کی ہڈیاں تک چوس لی گئی تھیں سیواجی اپنے فن میں نہایت درجہ ماہر تھا۔ اسکے ہاتھ سے زمین میں گڑے ہوئے خزائن بھی محفوظ نہیں رہے۔ اس کا خفیہ محکمہ نہایت چست اور اعلےٰ درجہ کا تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جس نے توہم پرست لوگوں کے دلوں میں اسکی عظمت کو بڑھا دیا۔"

جنجی کے بعد ویلور پر قبضہ کرتے ہوئے سیواجی تنجاور پر بڑھا۔ جہاں اس کا سوتیلا چھوٹا بھائی بیکوجی حکمران تھا۔ بیکوجی نے سیواجی کی مخالفت کی۔ ابھی یہ لڑائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ سیواجی اپنے ایک سردار کو جنوب میں چھوڑ کر پونہ کو واپس ہوا۔ اس کی واپسی کا راستہ اس

وقت ویلور سے ہسکوٹہ، بنگلور، بالاپور، سرا سے ہوتا ہوا ساونور پرسے مرہٹواڑی کو تھا۔ اس نے ان تمام مقامات پر قبضہ کر کے یہاں سے بیجاپور کے حاکموں کو نکال کر اپنے حاکموں کو مقرر کیا۔ اس طرح ایک نئی ہندو حکومت قایم ہوگئی۔ جس کا ایک سرا تنجاور میں تو دوسرا پونا میں تھا۔ اور ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ وہ جس فاتح اور نجات دلانے والے کے منتظر تھے وہ آگیا ہے۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"اس زمانے میں جب رن دولہ خاں کی فوجیں جنوبی ہند پر قبضہ کر رہی تھیں تو کسی ہندو نے یہ پیشین گوئی کی تھی "ایک زمانہ آئیگا کہ زمین پر آسمانی بلائیں نازل ہونگیں۔ کالی جی زمین پر اتر آئیں گی۔ اور اس وقت ان کے غضب سے کوئی نہیں بچے گا۔ بچہ ہو یا بوڑھا، شریف ہو یا رذیل، سرمایہ دار ہو یا مزدور سب تباہ ہو جائیں گے۔ انسانیت کا نام تک باقی نہیں رہیگا۔ ترک لوگ شریفوں کو بھی بکروں کے مانند قتل کر دیں گے۔ جب اس حالت پر ایک عرصہ گذر جائیگا تو ایک فاتح اور نجات دینے والا آئیگا جو ہندوؤں کو اس ظلم وستم سے نجات دیگا"
سیواجی کو ہندوؤں نے وہی نجات دہندہ سمجھ لیا"

سیواجی کے اس حملہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرا کی مسلمان صوبہ داری ختم ہوگئی۔ اور تمام جنوبی ہند پھر ایکبار مرہٹی ہندوؤں کے قبضہ میں آگیا۔

جنوبی ہند اور مغل

سیواجی پونا ۱۶۷۸ء کے اخیر میں واپس ہوا۔ اس وقت مغل فوج بیجاپور پر حملے کر رہی تھی۔ بیجاپور والوں نے گولکنڈہ اور سیواجی سے مدد چاہی۔ یہ جنگ اسی طرح جاری تھی۔ کہ سیواجی کی وفات ۱۶۸۰ء میں ہوگئی۔ اور اس کا بیٹا سنبھاجی اس کا جانشین ہوا۔ دکن کے معاملات کو سلجھتے نہ دیکھکر خود عالمگیر اورنگ زیب ۱۶۸۲ء میں دکن میں آیا۔ اور بیجاپور کا محاصرہ کرلیا۔ بیجاپور ۱۶۸۶ء میں فتح کرلیا گیا۔ اور اس کے دوسرے سال یعنے ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ بھی مغلوں نے فتح کرلیا۔ دکن کی یہ دونوں اسلامی سلطنتیں ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئیں تمام انگریزی مورخوں نے بہ اختلاف الفاظ لکھا ہے کہ :۔

"اگر یہ سلطنتیں باقی رہتیں تو مرہٹی طاقت ترقی نہ کرسکتی۔ ان سلطنتوں کو تباہ کرکے عالمگیر نے مرہٹی طاقت کو ترقی کرنے کا موقع دیا۔"

جنوبی ہند کے بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ :۔

"عالمگیر نے ان اسلامی سلطنتوں کو مٹاکر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ دکن کی یہ سلطنتیں اگر باقی رہتیں تو جنوب میں اسلام کو بہت ترقی ہوتی۔"

لیکن اگر واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالمگیر نے جو کچھ کیا وہ عین مصلحت اور سیاست وقت کے مطابق تھا۔ ہاں اس بات کے ماننے سے انکار نہیں کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں بہت دیر میں فتح ہوئیں۔ یہ سلطنتیں اگر اسی وقت فتح ہو جاتیں۔ جب وہ دکن کا صوبہ دار ہوکر آیا تھا تو اس کے دو نتیجے نکلتے :۔

(۱) مرہٹوں کی ابھرتی ہوی طاقت اسی وقت ختم ہو جاتی۔

(۲) تمام جنوبی ہند مغلوں کے قبضہ میں اسی وقت آجاتا۔

لیکن زمانہ اس کے خلاف تھا۔ پہلے تو اس کے باپ شاہجہاں نے اسکی مخالفت کی۔ بعد میں تخت نشینی کیلئے خانہ جنگی، اور پھر راجہ جسونت سنگھ کی غداری نے مرہٹوں کو اس قدر طاقتور بنا دیا تھا کہ ان سلطنتوں کے ختم کرنے کے بعد بھی وہ مرہٹوں کے خلاف پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس کی ناکامیابی کا بڑا سبب یہی دو سلطنتیں تھیں۔

بیجاپور اور گولکنڈہ فتح ہونے کے بعد عالمگیر نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ ممکن تھا کہ عالمگیر کچھ عرصہ تک اس طرف توجہ نہ کرتا۔ یہ تو عالمگیر کو معلوم تھا کہ جنوب میں سرا کی صوبہ داری کا سیواجی نے خاتمہ کر دیا تھا۔ اور تمام ملک پر مرہٹے حکمران تھے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ تنجاور میں سیواجی کا بھائی یکوجی حکمران تھا۔ شاہ جی نے بنگلور کی جاگیر اسی کو دی تھی۔ لیکن سیواجی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سیواجی کی وفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یکوجی نے چاہا کہ بنگلور کی جاگیر میسور کے راجہ کے ہاتھ فروخت کر دی جائے۔ معاملہ طے ہو گیا۔ صرف قبضہ دلوانا باقی تھا اس لئے یکوجی نے تنجاور سے فوج بھیجی۔ کہ بنگلور کو سیواجی کے اہل کاروں کے ہاتھ سے نکال کر میسور کے راجہ کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ دوسری طرف میسور کے راجہ کی فوج سرنگاپٹم سے قبضہ لینے کے لئے نکلی۔ تیسری طرف مرہٹواڑی میں سیواجی کے جانشینوں کو جب معلوم ہوا کہ یکوجی اس جاگیر کو فروخت کر رہا ہے تو انہوں نے جنجی کے مرہٹہ سردار کو لکھا کہ بنگلور کی حفاظت کی جائے۔ جنجی سے مرہٹہ فوج بنگلور طرف بڑھ رہی تھی۔

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب اس وقت گولکنڈہ فتح کر کے اس کے قرب وجوار میں تھا بنگلور کی اہمیت سے وہ واقف تھا کہ کس طرح اس شہر پر قبضہ رکھنے سے تمام بالاگھاٹ اور پائیں

گھاٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس نے اپنے جنرل قاسم خاں کو حکم دیا کہ دن رات کوچ کرکے بنگلور پر قبضہ کر لیا جائے۔

قاسم خاں برقی سرعت سے بڑھا۔ اور ۱۶۸۷ء میں ایک معمولی جنگ کے بعد اس کا قبضہ بنگلور پر ہوگیا۔ جب مخالف فوجوں کو جو بنگلور کی طرف آرہی تھیں۔ معلوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئیں۔ بنگلور کی فتح کے بعد قاسم خاں نے سرا پر قبضہ کر لیا۔ میسور میں اس وقت راجہ چک دیو حکمران تھا۔ یہ مغلوں کا باجگذار بن گیا۔ قاسم خاں نے صدر مقام کے لئے سرا ہی کو منتخب کرتے ہوئے بنگلور کو راجہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کے بعد قاسم خاں نے ان تمام مقامات کو جو بالاگھاٹ میں مرہٹوں اور پالیگاروں کے قبضہ میں تھے۔ فتح کر لیا۔ سرا کی صوبہ داری از سر نو قایم ہوی۔ قاسم خاں پہلا صوبہ دار تھا۔ اور اس کو فوجدار دیوان کا خطاب دیا گیا۔ سرا کے ماتحت مندرجۂ ذیل ریاستیں باجگذار تھیں۔

بدنور، بسواپٹن، چتلدرگ، ہاکل واڑی، بالاپور، یلہنکا (ماگڑی) ساگتور، میسور اماتور، بلندور اور کلالی۔

ان ریاستوں میں صرف ایک میسور ہی ایسی ریاست تھی جو بہ نسبت دوسری ریاستوں کے طاقتور تھی۔

بیجاپور سے نیچے میسور تک تمام ملک جب ایک سال کے اندر مغلوں کے ماتحت آگیا۔ اور سرا کی صوبہ داری بھی قایم ہوگئی تو عالمگیر نے پائیں گھاٹ پر توجہ کی۔ اور جنرل ذوالفقار خاں کو ۱۶۹۰ء میں پائیں گھاٹ پر بھیجا۔ پائیں گھاٹ میں اس وقت تنجاور میں سیواجی کا بھائی یکوجی، مدورا کا نایک اور جنجی کا مرہٹہ سردار باقی دوسرے راجاؤں اور پالیگاروں سے زیادہ زبردست تھے۔ دوسال کے اندر اندر ذوالفقار خاں نے جنوب کے تمام ملک کو فتح

کر لیا۔ مدورا اور تنجاور والے خراجگذار بن گئے۔ ذوالفقار خاں کے ماتحت مغلوں کی فوج نے جنوب میں جو فتوحات حاصل کیں اور جس قدر جنگیں لڑیں اس کے متعلق کرنل ولکس لکھتا ہے :-

"چھ ماہ کے اندر اندر مغلوں کی فوج نے تین ہزار کوس مسافت طے کی۔ اور ۱۹ خونریز جنگیں لڑیں"

جنوبی ہند میں صرف ایک جنجی کا ہی مضبوط قلعہ تھا۔ جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ذوالفقار خاں نے ۱۶۹۳ء میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ ذوالفقار خاں کو کئی بار محاصرہ اٹھا کر ان مرہٹوں کے تعاقب میں جانا پڑا۔ جو جنجی کے مرہٹوں کی تائید میں مرہٹواڑی سے آرہے تھے۔ پانچ سال کے محاصرہ کے بعد ۱۶۹۸ء میں جنجی کا قلعہ فتح ہوگیا۔ اس طرح جنوب کا تمام ملک راس کماری تک مغلیہ سلطنت کے زیر اثر آگیا۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کا انتہائی عروج تھا۔

جنوبی ہند اور اہلِ نوایط

کل جنوبی ہند کے فتح ہو جانے پر شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے انتظام کیلئے دکن اور جنوبی ہند کو چھ حصوں پر تقسیم کیا۔

(۱) خاندیس (۲) اورنگ آباد (۳) بیدر

(۴) برار (۵) حیدر آباد (۶) بیجا پور

ان میں آخرالذکر دو صوبے یعنے حیدر آباد اور بیجا پور جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان دونوں صوبوں میں بھی ہر ایک کے دو حصے کئے گئے۔ صوبۂ حیدر آباد کے دو حصوں میں

ایک حصہ حیدرآباد، کرناٹک، بالاگھاٹ۔ اور دوسرا حصہ پائیں گھاٹ کے نام سے معروف ہوا۔

حیدرآباد بالاگھاٹ کے ماتحت مندرجہ ذیل اضلاع یا سرکار تھے :۔

سدہوٹ، گنجی کوٹہ، گوتی، گرم کنڈہ اور کھم۔

پائین گھاٹ کے ماتحت وہ تمام ملک تھا جو ساحل سمندر سے لگا ہوا جنوب میں تناولی تک چلاگیا ہے۔ یعنے موجودہ اضلاع گنٹور، نلور، چنگل پیٹ، مدراس، جنوبی ارکاٹ وغیرہ۔ اس کے انتظام کے لئے ایک نائب صوبہ دار مقرر ہوا۔ جس کا صدر مقام جنجی میں تھا۔ جنجی کی آب و ہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے بعد میں ارکاٹ کا انتخاب کیا گیا۔ بیجاپور کے دو حصوں میں ایک بیجاپور کرناٹک بالاگھاٹ تھا۔ اور دوسرا بیجاپور کرناٹک پائین گھاٹ۔

بیجاپور کرناٹک بالاگھاٹ کے ماتحت مندرجہ ذیل اضلاع یا سرکار تھے۔

شمال میں دریائے تنگ بھدرا سے شروع ہوکر اضلاع بلاری، اننت پور، موجودہ ریاست میسور اور تمام مغربی ساحلی علاقہ جس میں اضلاع شمالی و جنوبی کنارا، ملیبار، کوچین وغیرہ ہیں۔

پائین گھاٹ کے ماتحت بارامحل یعنے سیلم، کوئمتور، شمالی ارکاٹ اور ویلور، جنوب میں مدورا تک۔

اس علاقہ کے انتظام کے لئے سرا کو صدر مقام بنایا گیا۔ اور یہاں ایک نائب صوبہ دار رہتا تھا اس تقسیم میں کڑپہ، کرنول، ادہونی اور نندیال باقی رہ گئے ان میں اول الذکر دو کو حیدرآباد کرناٹک کے ماتحت اور آخرالذکر دو کو بیجاپور کرناٹک کے ماتحت کیا گیا۔

شروع میں تو انتظام کیلئے صرف ذوالفقار خاں ایک ہی صوبہ دار تھا۔ جس کو فوجدار دیوان کا خطاب حاصل تھا۔ ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کی وفات پر ذوالفقار خاں دہلی چلا گیا۔ اور

اس کے عوض داؤد خاں صوبہ دار مقرر ہوا۔ جس نے جنوب میں اپنی نیابت کے لئے محمد سعید یعنے سعادت اللہ خاں کو جو اہل نوائط سے تھا۔ نو جدار دیوان مقرر کیا۔ چار سال کے بعد انتظامی نقطۂ نظر سے سرا کی صوبہ داری پر ۱۷۱۱ء میں امین خاں کا تقرر ہوا۔

سعادت اللہ خاں کے ماتحت اس وقت تک سرا اور ارکاٹ دونوں علاقے تھے۔ سرا کی صوبہ داری پر امین خاں کا تقرر اس کو پسند نہ آیا۔ وہ اس علاقے کو اپنے ہی قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"سرا کے ماتحت میسور کا زرخیز علاقہ تھا۔ اس لئے سعادت اللہ خاں اس علاقہ کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا"

سرا اور ارکاٹ میں رقابت شروع ہو گئی۔ اس کی واضح مثال اس سے ملتی ہے کہ میسور سے خراج حاصل کرنے کیلئے سرا کی فوجیں ایک طرف سے بڑھیں تو دوسری طرف سے ارکاٹ کی فوج بھی سرنگا پٹم پر چڑھائی کی۔ ممکن تھا کہ مسلمانوں کی دونوں فوجیں ایک دوسرے سے جنگ آزما ہوتیں۔ لیکن عین وقت پر دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اور خراج بیکر انہوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ اس وقت سعادت اللہ خاں کی کمک پر نوابان کڑپہ، کرنول اور سانور کے علاوہ گتی کا مقامی مرہٹہ حاکم سدوجی گھوڑ پڑے بھی تھا۔

(نوٹ :۔ کڑپہ، کرنول اور سانور کے حاکم پٹھان تھے۔ دراصل یہ نواب وہاں کے مقامی حاکم تھے۔ جنہیں صوبہ دار دکن نے مقرر کیا تھا۔ کڑپہ کا پہلا حاکم عبدالنبی خاں تھا۔ جس نے مقامی طور پر بہت ناموری پیدا کی ہے۔ اس نے ملک کی ابتر حالت سے فائدہ اٹھا کر اپنے علاقہ کو بہت وسیع کر لیا تھا۔ جنوب میں اس کی عملداری سیلم تک پہونچ گئی تھی۔ مغرب طرف پورا اننت پور اس کے قبضہ میں آچکا تھا۔ یہ وہ

زمانہ ہے کہ پٹھانوں کے قافلے کے قافلے شمالی ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک سے آکر جنوب میں آباد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ کڑپہ اور کرنول کے اضلاع میں اب بھی پٹھانوں کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ کدری ضلع اننت پور کے قریب تر پورا ایک گاؤں خالص ان پٹھانوں سے آباد ہے اور وہ ابھی تک اپنی قدیم روایات پر چلتے ہیں اور تمام کے تمام تمباکو کے تاجر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہر سرا میں بھی بارہ ہزار پٹھان تھے۔ اور پورا محلہ پٹھان واڑی کہلاتا تھا۔ نواب حیدر علی کے زمانہ میں کڑپہ اور کرنول کی نوابیاں ختم ہو گئیں)

ہرنگاپٹم پر یہ حملہ ۱۷۱۳ء میں ہوا تھا۔ تاریخ ہند کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کی کیا حالت تھی شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو وفات پائے ہوسے صرف چھ سال کا عرصہ گذرا تھا۔ کہ دہلی میں تخت کے لئے خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوسے ہر حاکم اور ہر گورنر اپنی اپنی جگہ آزاد ہونا شروع ہو گیا۔

جس طرح شمالی ہند کے حاکموں نے آزاد ہو کر اقتدار حاصل کرنا شروع کر دیا تھا اسی طرح سرا اور ارکاٹ کے حاکموں نے بھی کیا۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے۔ لیکن سرا کی آزادی اور صوبۂ سرا کا علیحدہ ہو جانا ارکاٹ والوں کو پسند نہیں تھا۔ اس لئے دونوں صوبہ داروں میں کش مکش ہونے لگی۔ جس کی مثال اوپر دی گئی ہے۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے صوبۂ دار دکن آصف جاہ اول نے سرا کی فوجداری و دیوانی بھی ارکاٹ کے نواب سعادت اللہ خاں کو تفویض کر دی۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرا والوں نے اس فرمان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ جس کی وجہ سے سرا اور ارکاٹ میں اختلاف بڑھتا رہا۔ لیکن امین خاں کے بعد اس کے جانشین کمزور ہو گئے۔

اس کمزوری سے سعادت اللہ خاں نے فائدہ اٹھایا۔ اور سرا کی صوبہ داری بھی حاصل

رنی چاہی۔ نظام الملک آصف جاہ بھی موقع کی تلاش میں تھا۔

ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"جب آصف جاہ نظام الملک نے جنوب میں اپنی آزاد حکومت قایم کرنی چاہی تو کامیابی کے لئے یہ ضروری تھا کہ خاندان تیمور سے تعلق رکھنے والوں کا یا ایسے امرا کا جو خود آزاد ہونا چاہتے تھے۔ خاتمہ کردیا جائے۔"

بہرطور نظام الملک کی اجازت سے نواب سعادت اللہ خاں نے سرا کی صوبہ داری طاہر خان کے لئے حاصل کرلی۔ ارکاٹ کی فوج سرا پر بڑھی۔ اس وقت سرا میں ابین خاں کا جانشین عبدالرسول خاں تھا۔ جنگ میں سرا والوں کو شکست ہوئی۔ عبدالرسول خاں مارا گیا۔ طاہر خاں سرا کا صوبہ دار ہوا۔ سعادت اللہ خاں کی مراد برآئی۔ وہ اب کل جنوبی ہند کا فوج دار دیوان تھا۔

۱۷۳۲ء میں سعادت اللہ خاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال پر دوست علی خان اس کا جانشین ہوا۔ دوست علی خاں کی مسند نشینی سعادت اللہ خاں کے حسب وصیت تو تھی لیکن نظام الملک آصف جاہ کی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ اس لئے نظام الملک کو دخل اندازی کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ لیکن شمالی ہندوستان کے واقعات اور مرہٹوں سے جنگوں کی وجہ سے نظام الملک کو کوئی موقعہ ایک عرصہ تک ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے ارکاٹ میں دوست علی خان کی حکومت مستحکم ہوگئی۔

اسی سال یعنے ۱۷۳۲ء میں ترچناپلی کا راجہ مرگیا۔ اسکی بڑی رانی جانشین ہوئی۔ لیکن ریاست کے وزیراعظم نے ایک اور دعویدار تخت کے لئے کوشش شروع کی۔ رانی نے تنگ آکر دوست علی سے مدد مانگی۔ دوست علی نے ایک بڑی فوج اپنے داماد حسین دوست عرف چندا صاحب

اور اپنے فرزند صفدر علی کے ماتحت ترچنا پلی کو بھیجدی۔

ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

" چندا صاحب نے ترچنا پلی کے قلعہ میں داخل ہونے سے پیشتر رانی کے آگے قسم کھائی
کہ وہ ترچنا پلی کو فتح کرنے کے بعد رانی کو تخت پر بٹھا کر واپس ہو جائیگا۔

(بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رانی گو مسلمانوں سے مدد چاہتی تھی۔ لیکن وہ بدگمان بھی تھی کہ کہیں مسلمان خود ترچنا پلی پر قبضہ نہ کر لیں۔)

رانی نے اس قسم کا اعتبار کر لیا۔ اور چندا صاحب نے قلعہ میں داخل ہو کر رانی کو قید کر لیا۔ اور قلعہ پر اسلامی علم لہرانے لگا۔

ولکس لکھتا ہے:۔

" چندا صاحب نے قرآن مجید پر قسم نہیں کھائی۔ بلکہ ایک اینٹ کو کپڑے میں لپیٹ کر
رانی کو دہوکا دیا تھا۔"

رانی کی مخالف پارٹی نے بھی اس وقت اطاعت اختیار کر لی۔

ترچنا پلی کی فتح کے بعد صفدر علی ارکاٹ کو واپس ہو گیا۔ صرف چندا صاحب وہاں رہا۔ اور اس وقت تمام ملک وریائے کاویری سے نیچے چندا صاحب کے تصرف میں تھا۔

اس وقت ارکاٹ کی وزارت میر اسد کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو چندا صاحب سے دشمنی تھی۔ اس کو یہ پسند نہیں تھا کہ چندا صاحب اقتدار حاصل کرلے۔

امور سلطنت سے نواب دوست علی کی غفلت اور صفدر علی کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر میر اسد خود اپنا اقتدار بڑھانا چاہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ صفدر علی چندا صاحب کو ترچنا پلی میں تنہا چھوڑ کر واپس آگیا ہے تو اس کو خوف ہوا۔ اس نے صفدر علی سے کہا کہ جب تک

چندا صاحب زندہ ہے۔ امارت صفدر علی کو نہیں مل سکتی۔ صفدر علی اس دہوکے میں آگیا۔ اب دونوں نے مل کر سازش کی۔ انہوں نے پہلے نواب دوست علی خاں کو کہا کہ چندا صاحب کو ترچنا پلی سے واپس بلا لیا جائے۔ جب نواب نے انکی بات نہیں مانی تو بعد میں انہوں نے مرہٹوں سے خفیہ خط و کتابت شروع کی۔ بظاہر اس لئے کہ مرہٹے ترچنا پلی پر حملہ کریں۔ لیکن بہ باطن مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں سے مل کر چندا صاحب کا خاتمہ کر دیں۔

دوسری طرف نواب کو دہوکا دینے کیلئے یہ کارروائی کی گئی کہ مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لئے فوج تیار کی گئی۔ اور اس فوج کو صفدر علی کی زیر کمان رکھا گیا۔ میر اسد کو معلوم تھا کہ بوڑھا نواب میدان جنگ میں نہیں جائیگا۔ جب مرہٹے قریب آجائیں تو صفدر علی فوج کی ناکافی ہونے کا بہانہ کر کے ویلور میں قلعہ بند ہو جائے۔ اس طرح مرہٹے آگے بڑھ جائیں۔ اس خفیہ عہدنامہ کی رو سے مرہٹی فوج پائین گھاٹ میں آگئی) خلاف توقع بوڑھا نواب خود میدان جنگ میں آنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے کہا کہ یہ کفر و اسلام کا مقابلہ ہے۔ اس نے اپنے فرزند صفدر علی کو جو اسوقت ارکاٹ سے باہر تھا۔ لکھا کہ آکر اس کے ساتھ مل جائے۔ ترچنا پلی میں چندا صاحب کو لکھا گیا کہ وہ بھی آکر ملے۔ چندا صاحب ہر ممکن سرعت سے آکر نواب سے مل گیا۔ صفدر علی نے دیکھا کہ باپ نے خلاف توقع خود میدانِ جنگ میں آنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ لیت و لعل کرنے لگا۔

مرہٹی فوج میدانِ جنگ میں عہدنامہ کی رو سے آئی تھی۔ لیکن ان کا ارادہ کچھ اور تھا ارکاٹ کی اسلامی فوج اور مرہٹوں کا مقابلہ دامل چری کے پاس ہوا۔ میدان جنگ میں بوڑھا نواب دوست علی مارا گیا۔ مرہٹوں نے میر اسد کو قید کر لیا۔ چندا صاحب شکست کھا کر ترچنا پلی چلا گیا۔ صفدر علی یہ دیکھ کر ویلور میں قلعہ بند ہو گیا۔ اور مرہٹوں سے خط و کتابت

شروع کی۔

مرہٹوں نے بھانپ لیا کہ وہ صفدر علی سے من مانی رقم وصول کر سکتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ اگر مطلوبہ رقم نہ دیگا تو وہ چندا صاحب سے مل جائیں گے۔ صفدر علی نے مرہٹوں کی شرائط منظور کرلیں۔ جس کی رو سے یہ طے پایا کہ آئندہ وہ اضلاع جو چندہ صاحب کے قبضہ میں ہے۔ مرہٹوں کو مستقل طور پر دیدئے جائیں گے۔ مرہٹے اس وقت روپیہ لیکر ویلور کے مضافات سے ہٹ گئے لیکن انہوں نے بجائے مرہٹواڑی کو واپس ہونے کے ترچناپلی پر حملہ کردیا۔ چندا صاحب نے تین ماہ تک مدافعت کی۔ لیکن جب سامان رسد کی کمی اور قحط سالی شروع ہوگئی تو اس نے اپنے آپ کو مرہٹوں کے حوالے کردیا۔ اس کو اور اس کے لڑکے رضا صاحب کو مرہٹوں نے ستارا کے مقام پر بھیجدیا۔ اور گوتی کے حاکم مراری راؤ کو اس تمام علاقہ کا حاکم مقرر کردیا۔ جو چندا صاحب کے قبضہ میں تھا۔

اس کے چند دن بعد صفدر علی کا انتقال ہوگیا۔ صفدر علی کو خود اس کی بہن نے زہر دیکر ہلاک کرڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ صفدر علی نے ماہ رجب کی عید (کندوری) منانے اپنی بہن کے یہاں ویلور گیا تھا۔ بہن نے پوریوں میں زہر ملاکر کھلا دیا۔ جس کی وجہ سے صفدر علی کا انتقال ہوگیا صفدر علی کی بہن اپنے شوہر مرتضیٰ خان کیلئے مسند امارت حاصل کرنا چاہتی تھی۔

صفدر علی کے انتقال پر ارکاٹ میں اہل نوایط نے اس کے چھوٹے لڑکے محمد سعید کو امارت کے لئے منتخب کیا۔ ادھر ویلور والوں نے مرتضیٰ خاں کو چنا۔ ویلور اور ارکاٹ میں رقابت بڑھنے لگی۔ اس موقع پر نظام الملک آصف جاہ نے حیدرآباد سے ارکاٹ آکر محمد سعید کی امارت کو منظور کرلیا۔ اور آئندہ جھوٹے دعویداران نوابی کا سدباب کرنے کیلئے حکم دیا کہ ہر اس شخص کو جو نواب کہلائے سر دربار لاکر پیٹا جائے۔

ولکس لکھتا ہے :۔

"ملک کی حالت اس وقت اس قدر خراب تھی کہ ہر وہ شخص جس کے قبضہ میں ایک مٹی کا بنا ہوا چھوٹے سے چھوٹا قلعہ بھی تھا۔ نواب کہلاتا تھا"

آصف جاہ نے جنوب میں مرہٹوں سے خونریز لڑائیاں لڑیں اور تمام ملک سے مرہٹوں کو بے دخل کیا۔ صرف مراری راؤ کو بطور باجگذار حاکم گوتی میں رہنے دیا گیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کو سلطنت مغلیہ کے معاملے میں مورخ گو ہزار الزام دیں لیکن جنوبی ہندوستان کو جس شخص نے اس وقت مرہٹوں سے بچایا وہ آصف جاہ کی شخصیت تھی۔ نظام الملک واپس جاتے ہوئے خواجہ عبداللہ کو ارکاٹ کا عارضی نواب مقرر کرتا گیا کہ محمد سعید کے بالغ ہونے تک حکومت کرے۔ لیکن خواجہ عبداللہ حیدرآباد جاکر واپس نہ آیا۔ وہاں اس کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ جہاں کے عوض انوارالدین کو عارضی نواب مقرر کیا گیا۔ اس نے محمد سعید کو ۱۷۴۳ء میں زہر دیکر ختم کر دیا۔

ولکس لکھتا ہے :۔

"خود اہل نوائط انوارالدین کو ملزم نہیں گردانتے۔ بلکہ وہ اس کا الزام محمد حسین خاں طاہر اور غلام حسین خاں پر لگاتے ہیں۔ جو اہل نوائط سے ہی ہیں"

لیکن عام طور پر جو روایت مشہور رہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ محمد سعید کے قتل کے معاملہ میں اس کے ماموں مرتضیٰ خان اور انوارالدین کا ہاتھ تھا۔ اول الذکر خیال کرتا تھا کہ محمد سعید کے مرجانے پر امارت اس کو مل جائیگی۔ اور آخرالذکر خود اپنے لئے امارت چاہتا تھا۔ آخر انوارالدین کامیاب ہوگیا۔ نظام الملک نے اس کی امارت کی تصدیق بھی کر دی۔ اس طرح اہل نوائط کی حکومت کا ۲۳ سال بعد ۱۷۴۳ء میں خاتمہ ہوگیا۔ انوارالدین نے نواب ہوتے ہی انگریزوں

کی جانب اپنا میلان طبع ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

جنوبی ہند اور خاندان انوری

۱۷۴۳ء۔ انوارالدین کی مسند نشینی کا یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانسیسی اور انگریزی قومیں دونوں ساحل کورومنڈل پر مدراس اور پانڈیچری میں عرصہ سے تجارت کر رہی تھیں۔ اور ان دونوں میں تجارتی رقابت کی وجہ سے جنگیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اب تک ملکی معاملات میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر اب انوارالدین کی وجہ سے وہ میدان سیاست میں بھی اتر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ انوارالدین کے والد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز میں سفر کیا تھا۔ اس وقت انگریزوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ اس کے بعد جب انوارالدین ارکاٹ کا نواب بنا تو انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں نے دعوت دی۔ انوارالدین نے انگریزوں کی دعوت قبول کی۔ محمد علی والا جاہ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے :۔

"والدمن نظر بر ہماں رابطہ دیرینہ اول دعوت انگریزاں قبول فرمودند۔ نزد انگریزاں رفتند و اخلاص ایں قوم مضمر داشتند"

اس کے صلہ میں انوارالدین نے میلاپور کی جاگیر انگریزوں کو دی۔ اس سے پہلے وہ صرف مدراس میں قلعہ تک محدود اور وہیں تجارت کرتے تھے۔ اس کے بعد جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی تو انوارالدین نے انگریزوں کو مدد دی۔ اس کی یہ کارروائی فرانس والوں کو ناگوار گذری۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی حکام ان کے اور انگریزوں کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس جنگ میں جس میں انوارالدین نے انگریزوں کو فوج سے مدد دی تھی۔ انوارالدین

کی فوج کو فرانس والوں نے شکست دی۔ لیکن پھر بھی ان کے گورنر ڈوپلے نے یہی چاہا کہ انوارالدین اب بھی ان کے اور انگریزوں کے معاملات میں دخل نہ دے۔ چنانچہ اس نے انوارالدین کو خط لکھا اور اس میں اس شکست کا حوالہ بھی دیا جو انوارالدین کی فوجوں کو فرانس والوں کے ہاتھ سے ملی تھی۔ ڈوپلے نے لکھا تھا :-

"بر ظاہر است کہ فی مابین انگریز و فرانسیس مدام جنگ و جدل می باشد۔ و باز موافقت ہم بہ میان می آید۔ آں مشفق را لازم است کہ نفع و نقصان ہر دو فرقہ مساوی دارند و باعانت یکطرفہ نہ پردازند۔ بلکہ محاربہ ہر دو طرف تماشا کنند برادر بزرگ گرامی از مقابلۂ من مضرت یافتہ خفیف گردید۔ بیک حملۂ مردانہ قلعہ چینا پٹن بدست آوردم۔ می ترسم کہ از تفنیہ و ہنگامۂ طرفین مبادا مضرتے بآں مشفق برسد۔ لہٰذا لازم و ضرور است کہ خیال آمدن ایں طرف نہ کنند وگرنہ برق توپ اندازی من بے اختیار است و شعلۂ باروت خانہ و بنادیق من از نالۂ منطفی نمی شود۔ زیادہ چہ برطرازد" (تحفۃ الاخبار)

لیکن انوارالدین پر انگریزوں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اس نے ڈوپلے کی بات نہ مانی۔ بلکہ اس کو جواب میں لکھا :-

"خط مراسلہ کہ مطلبش بے معنی و گزاف لایعنی بود رسید۔ از خیالات لاف زنی ایشاں تحیر گردانید۔ جناب مالک الملک حقیقی سکۂ حکومت ایں ملک بدست من دادہ و تیغ بے دریغ مارا بنا بر قتل و تلف متمردان و گردن کشان قوت و برش بخشیدہ۔ دریں صورت لازم و ضرور شدہ کہ بہ حمایت متوسلاں و فرماں برداران خود بکوشم و تا مقدور جہت اعانت مطیعان و دوستاں خود بجوشم۔ نمی توانم دید

کہ کسے برطرف وفاداران من نظر کند۔ و پسندنمی توانم کرد۔ کہ احدے بر مخلصان من بدشمنی سبقت نماید۔ توقع از قہار مطلق دارم کہ درعوض مخالفتے کہ با دوستان من بوقوع آمد نام فرقہ فرانسیس دریں ملک باقی نہ ماند۔ ودست درازی کہ بہ قلعہ چینا پٹن کردہ اند۔ در بدلہ آن بنیاد و بندر پھوچری (پانڈیچری) از زمیں بر دارم۔ تحریر و تسطر من بے خلاف است۔ وتقریر من تیغ بے غلاف۔ زیادہ چشم غفلت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باد"۔ (تحفۃ الاخبار)

اب فرانسیسیوں کے لئے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔

انہوں نے اس خط کی پرواہ تک نہ کی۔ گو بعد میں انہیں انگریزوں اور انوارالدین کی متحدہ فوجوں سے شکست بھی ملی۔ لیکن ان کے دل میں انوارالدین کی جانب سے کدورت بیٹھ گئی۔ اس لئے انہوں نے اب اہل نوائط کے اس خاندان کی حمایت شروع کردی۔ جس کے وارث محمد سعید کو انوارالدین نے زہر دیکر ختم کر دیا تھا۔ اب اس خاندان میں چندا صاحب اور اس کا بیٹا علی رضا تھے۔

گذشتہ باب میں یہ کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ مرہٹوں نے چندا صاحب اور اس کے فرزند علی رضا کو ستارا میں قید کر رکھا تھا۔ ان کے قید ہونے کے بعد ان کے اہل خاندان نے پانڈیچری میں پناہ لی تھی۔ اب ڈوپلے نے انوارالدین کو نیچا دکھانے کیلئے چندا صاحب کی رہائی کی کوشش شروع کی۔ اور وہ کامیاب ہوگیا۔ مرہٹوں نے چندا صاحب کو ڈوپلے کی سفارش پر رہا کر دیا۔ چندا صاحب رہا ہوکر پانڈیچری آگیا اور یہاں اس نے فرانس والوں کی حمایت میں ارکاٹ کی نوابی کا دعویٰ کیا۔

جنوبی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ۱۷۴۸ء ایک نہایت اہم سال ہے۔ اس سال

چنداصاحب نے ارکاٹ کی نوابی کا دعویٰ کیا۔ اُدھر حیدرآباد میں نظام الملک آصف جاہ کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں تخت کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ انوارالدین اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کیلئے ناصر جنگ کے ساتھ مل گیا۔ یہ دیکھ کر چنداصاحب مظفر جنگ کی حمایت میں آگیا مظفر جنگ نے ارکاٹ پر چڑھائی کر دی۔ اس وقت فرانس والے مظفر جنگ اور چنداصاحب کے ساتھ تھے ۱۷۴۹ء میں انوارالدین مظفر جنگ کے حملے کو روکنے کیلئے آمبور کے قریب دو پہاڑیوں کے درمیان خیمہ زن ہوا۔ مظفر جنگ اور چنداصاحب اگر چاہتے تو دوسرا راستہ اختیار کرکے ارکاٹ پر قبضہ کرلیتے۔ لیکن چنداصاحب کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ وہ انوارالدین کی فوجوں پر حملہ آور ہوا۔ میدان جنگ میں انوارالدین مارا گیا۔ اس کا بڑا بیٹا محفوظ خاں اسیر ہوگیا۔ اور چھوٹا والاجاہ محمد علی ترچنا پلی کو فرار ہوا۔ اگر مظفر جنگ اور چنداصاحب اسی وقت بڑھکر ترچنا پلی پر قبضہ کرلیتے تو محمد علی کا خاتمہ تھا۔ لیکن وہ ارکاٹ میں فتح کا جشن منانے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی نے ترچنا پلی پہونچکر نواب ناصر جنگ کو تمام کیفیت سے اطلاع دی اور انگریزوں سے بھی مدد چاہی۔ نواب ناصر جنگ جنوب میں آگیا۔ وہ ایک محب وطن حکمران تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ انگریزوں کے ارادے کیا ہیں۔ اس نے محمد علی کو امتناعی حکم دیدیا کہ انگریزوں سے کوئی مدد نہ لی جائے۔ بلکہ اس نے کڑپہ کے پٹھان نواب کو حکم دیا کہ مدراس پر قبضہ کرکے انگریزوں کو شہر بدر کر دے لیکن محمد علی نے راجہ رام داس کی معرفت ان کی سفارش کی۔ جس سے انگریز اس وقت بچ گئے۔ ناصر جنگ کے ساتھ اس وقت نوابان کڑپہ، کرنول، ساونور اور گوتی کا مرہٹہ حکمران مراری راؤ اور میسور کے راجہ کی فوج بھی تھی۔ مظفر جنگ نے یہ دیکھکر ہتھیار ڈالدیئے۔ چنداصاحب پانڈیچری کو چلا گیا۔ اور بظاہر تمام معاملات ختم ہوگئے۔ لیکن ہندوستان کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ معاملات کو یکسو کرکے

نواب ناصر جنگ جب ارکاٹ سے حیدرآباد واپس ہوا تو راستہ میں کڑپہ کے پٹھان نواب ہمت بہادر خاں نے موقع پاکر اس کو شہید کر دیا۔ جس کی وجہ سے پھر مظفر جنگ آزاد ہو گیا۔

ناصر جنگ کی شہادت

صبح کا وقت تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا کہ ناصر جنگ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کے معائنہ اور احکام جنگ دینے کے لیئے نکلا۔ جب ہاتھی کڑپہ کے نواب کے ہاتھی کے مقابل پہنچا تو ناصر جنگ جو کڑپہ کے نواب سے سلام کا متوقع تھا۔ اپنا ہاتھ اٹھایا۔ چونکہ ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا ناصر جنگ نے سمجھا کہ کڑپہ کے نواب نے اس کو دیکھا نہیں۔ اس لیئے یہ اپنے ہودے میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسی وقت دوسری طرف سے دو گولی متواتر مارے گئے۔ جس کی وجہ سے ناصر جنگ فوراً شہید ہو گیا۔

(نوٹ:۔ یہ ایک گتھی ہے جو ابھی تک سلجھی نہیں۔ انگریزی مورخ فرانس والوں کو الزام دیتے ہیں۔ کہ انکی سازش سے ناصر جنگ شہید ہو گیا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کڑپہ کے نواب ہمت بہادر خاں کا تعلق انگریزوں سے زیادہ تھا۔ اس لئے کہ ناصر جنگ نے اسی کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جو عمل میں نہیں آیا۔ بلکہ اس کے عوض اس نے ناصر جنگ کو ہی شہید کر دیا۔)

اب پھر چندا صاحب کی بن آئی۔ جس نے پانڈیچری سے نکلکر ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ محمد علی نے یہ دیکھکر مدراس کے ایسٹ انڈیا کمپنی (انگریزوں) سے مدد مانگی۔ جہاں سے میجر لارنس کو بھیجا گیا۔ محمد علی نے اس وقت تنجاور اور میسور کے راجہ سے بھی مدد مانگی اور اس کے عوض ڈنڈگل کا ضلع دینا قبول کر لیا تھا۔ میسور کی فوج بھی ترچناپلی پہنچ گئی۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ یہ دیکھ کر مدراس کے گورنر نے یہ تجویز سوچی کہ اگر ارکاٹ پر حملہ کیا جائے تو

چندا صاحب ترچناپلی کا محاصرہ اٹھالیگا۔ اس لئے ۱۷۵۱ء میں ارکاٹ پر چڑھائی ہوی۔ کلایو نے جو انگریزی جنرل تھا ارکاٹ کو فتح کرلیا۔ جس کے بعد ہی ارکاٹ کا چندا صاحب نے محاصرہ کرلیا

محاصرۂ ارکاٹ

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں ارکاٹ کے محاصرہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اور کلایو کی جوانمردی کو اتنا بڑھا چڑھا کر لکھا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فوق الفطرۃ ہستی تھی جس نے ارکاٹ کی مدافعت کی۔

لکھا جاتا ہے کہ کلایو کے ساتھ صرف دو سو گورے اور تین سو دیسی سپاہی تھے۔ جنہوں نے جان پر کھیل کر ارکاٹ کی مدافعت کی لیکن اس کے بعد ہی جب چندا صاحب کی فوجوں نے ارکاٹ کا محاصرہ کرلیا۔ اور کلایو اور اس کی فوج محصور ہو گئی۔ تو اس محاصرہ میں جو ۵۱ دن تک رہا۔ سامان رسد کی قلت سے مجبور ہو کر دیسی سپاہیوں نے صرف چاول کی پیچ پینے پر اکتفا کی۔ اور ابلے ہوے چاول انگریزوں کو کھانے کے لئے دئے۔ یعنے کلایو اس قدر ہر دلعزیز تھا کہ دیسیوں نے اس کیلئے اس قدر سختیاں اٹھائیں اور آخر میں کلایو نے محاصرین کو بھگا دیا

لیکن ارکاٹ کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ ارکاٹ کے محاصرہ کے متعلق آج تک تاریخوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ صرف مکالے کے دماغ کی ایجاد ہے۔ ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔

سر فلپس گبس لکھتا ہے :-

"مراری راؤ (ایک مرہٹہ سردار تھا جو (والاجاہ محمد علی کے خلاف چندا صاحب کی مدد پر آیا تھا مراری راؤ کی فوج بھی ارکاٹ کے محاصرہ میں چندا صاحب کی فوج کے ساتھ شامل تھی۔

محاصرہ کرتے ہوئے گیارہ ہفتے گذر گئے۔ محصورین یعنے انگریزوں کی حالت بالکل سقیم ہوچکی تھی۔ کلایو سامان رسد نہ ملنے سے مایوس ہوچکا تھا۔ فوج بھوک سے پریشان تھی یہ دیکھ کر کلایو نے مراری راؤ کو پول بھیجا کہ کچھ سامان رسد بھیجدیا جائے۔ (یعنے سازش کرکے مراری راؤ کو اپنے ساتھ ملا لیا گیا۔) مراری راؤ نے سامان رسد بھیجتے ہوئے شب میں چندا صاحب کی فوج سے بھی علیحدہ ہوگیا۔ یہ دیکھ کر چندا صاحب کی فوج نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور انگریزوں اور کلایو کی جان بچ گئی"

یہ وہ بنیادی پتھر تھا جو انگریزی سلطنت کا ہندوستان میں پہلی بار رکھا گیا۔ چندا صاحب کو ترچناپلی کے محاصرہ میں کامیابی نہیں ہوی۔ خود اس کی فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تو اس نے تنجاور اور میسوری فوج میں پناہ لی۔ لیکن یہاں اس کا سر کاٹ کر سرنگاپٹم بھیجدیا گیا۔ جہاں اس سر کو عرصہ تک قلعہ کے میسوری دروازہ پر آویزاں رکھا گیا۔ اس طرح اہل نوایط کا آخری چشم و چراغ ختم ہوگیا۔ اور والا جاہ محمد علی ارکاٹ کا نواب مقرر ہوا۔ اور یہ تقرر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سرپرستی میں ۱۷۵۱ء میں ہوا۔

گو اس کے بعد بھی فرانس والوں نے چندا صاحب کے بیٹے رضا صاحب کے لیے بہت کوشش کی۔ لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی (ہوا یہ کہ فرانسیسی گورنمنٹ نے اپنے اولوالعزم گورنر ڈوپلے کو فرانس واپس بلا لیا۔ اس کے بعد جو گورنر آئے وہ اس دل و دماغ کے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلسل دس سال کی کش مکش کے بعد ۱۷۶۱ء میں فرانسیسی اقتدار کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔)

یہ لکھا جا چکا ہے کہ والا جاہ محمد علی کرناٹک کا نواب بن گیا تھا۔ اس نے انگریزوں کو اس تائید کے صلے میں ۱۵ تعلقے انعام دئے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جب ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کی

ہستی بنگالہ میں سراج الدولہ کے رحم و کرم پر منحصر ہوگئی تو اس نے اپنی فوجوں سے انگریزوں کی مدد
کی۔ اس نے اپنی فوج جہازوں میں سوار کر کے کلکتہ کو بھیجی۔ جس کی مدد سے انگریز مرشدآباد
پر قابض ہوئے۔ اور ملک بنگالہ ان کے ہاتھ آ گیا۔

قصر والا جاہی کا مصنف لکھتا ہے :۔

"تمگی فوج بندگان عالی متعینہ قلاع و مقامات کرناٹک سوائے فوج مایحتاج قلعہ ہنستر نگر۔ ہمراہ مسٹر کلیوس سواری جہازات برائے مہم کلکتہ روانہ شدہ بود۔"

تحفۃ الاخبار کا مصنف لکھتا ہے :۔

"بلکہ برعکس آں حسب تجویز ہر دو مشیر جہتہ استیصال کوٹھی انگریز از بنگالہ بہ نواب سراج الدولہ ناظم وقت بنگالہ نگارش نمود۔ سراج الدولہ قال اندیشی نکردہ بہ حیلہ قضیہ یک نفر گجراتی کہ بہ کوٹھی انگریز پناہ گرفتہ بود۔ کوٹھی انگریز از بنگالہ خارج گردانید۔ چوں درآں اوقات اہل انگریز اقتدار فوج زیادہ نداشتند جارج بکیٹ گورنر چینا پٹن بنابر کمک افواج مطلوبہ از نواب والا جاہ مستدعی گردید نواب مستطاب بامداد و اعانت افواج پرداختہ۔ پس جارج بکیٹ مع جمعیت علاقہ خود مصحوب مسٹر کلیوس المخاطب بہ لارڈ کلیف از سواری جہازات بہ سمت بنگالہ روانہ گردانید۔ نواب والا جاہ تا انجام آں مہم و قیام کوٹھی انگریز در بنگالہ ہرگونہ مدد بعمل آورد۔ و مدام در فکر انصرام آں کار می بود۔ بلکہ ازیں تفکر و تشویش آرام و آسایش خود ترک کردہ بود۔ چنانچہ بہ سبب ایں مہم ضروری توابعان و متعلقات را از ہنستر نگر طلب داشتہ در فرنگی کونڈہ سکونت ورزید۔"

محمد علی گو کرناٹک کا نواب بن گیا۔ لیکن فرانسیسی اقتدار اب بھی حیدر آباد میں زوروں پر تھا۔ اب انگریز اور محمد علی دونوں نے حیدر آباد میں سازش کا جال بچھایا۔ مظفر جنگ کے بعد صلابت جنگ نظام ہوا۔ سازشوں نے صلابت جنگ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد بسالت جنگ اور میر نظام علی خاں دو دعویدار تخت کے لئے نکل آئے۔ جن کی حمایت پر فرانس اور انگریز تھے۔ نظام علی خان کو کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی گویا انگریزوں کی کامیابی تھی۔ محمد علی نے حیدر آباد کی اس ابتر حالت سے خود بھی فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اس کے انگریز دوست اس کی مدد کریں گے۔ اس کا ارادہ تھا کہ حیدر آباد پر خود قابض ہو جائے۔

ماڈرن میسور کا مصنف اپنی کتاب میں میسور کی پہلی جنگ کے اسباب بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

"محمد علی نے نہ صرف حیدر آباد کے خلاف سازش کی تھی۔ بلکہ اس کی بڑھتی ہوئی ہوس حیدر آباد کو بھی اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی"

لیکن محمد علی اگر سازشی اور عیار تھا تو اس کے دوست اس سے بڑھ کر سازشی اور عیار تھے۔ انہوں نے محمد علی کو تسلی دیدی کہ مناسب موقع کے انتظار میں رہے۔ لیکن اسی وقت میسور میں ایک نئی طاقت ظہور میں آئی (جس کا آغاز بتلا رہا تھا کہ تمام جنوبی ہندوستان پر چھا جانے والی ہے) اور یہ طاقت حیدر علی کی تھی۔ جس نے محمد علی، انگریز اور نظام تینوں کی توجہ کو اپنی جانب جذب کر لیا۔

(۱) محمد علی اپنے آپ کو تمام جنوبی ہند کا حکمران سمجھتا تھا۔ اس کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ صوبہ سرا بلکہ جنوبی ہندوستان ایک دوسری طاقت کے ہاتھ میں چلا جائے۔

(۲) انگریزوں کو خوف ہو چلا تھا کہ ان کے منصوبے خاک میں ملنے والے ہیں۔

(۳) حیدر آباد۔ محمد علی اور انگریزوں کے جال میں پھنس کر حیدر علی کے خلاف ہو گیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر حیدر علی کا آغاز نہ ہوتا تو حیدرآباد اسی وقت مٹ جاتا۔

لیکن اب محمد علی اور انگریزوں کی توجہ میسور کی جانب ہوجانے سے حیدرآباد نظام علی خان کے لئے محفوظ ہوگیا۔ اور ان تینوں نے مل کر اس نئی طاقت کے خلاف جو کچھ کیا۔ وہ ایک علیحدہ تفصیل کا محتاج ہے۔ اور یہ تفصیل "تاریخ سلطنت خداداد میسور" میں دیگئی ہے اور مختصر طور پر "تاریخ میسور" کے عنوان سے ضمیموں میں دی گئی ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ محمد علی اور انگریز حیدرآباد سے غافل تھے۔ ادھر تو حیدرآباد کو ملا کر حیدر علی کے خلاف سازش کرتے رہے تو دوسری طرف نظام علی خاں کی مجبوریوں سے فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظام علی خاں بھی محمد علی کی سازشوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس کا ثبوت اس عہدنامہ سے ملتا ہے۔ جو جنرل کالاڈ نے ۱۷۶۶ء میں محمد علی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس عہدنامہ کی رو سے جنوب کا تمام ملک پانچ لاکھ روپیہ کے عوض محمد علی اور اس کی اولاد کی حکومت میں نسلاً بعد نسل دیدیا گیا۔ اور اس کے عوض محمد علی کی جانب سے کمپنی نے حیدرآباد کو یقین دلایا کہ آئندہ وہ حیدرآباد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریگا۔

یہ اوپر کہیں لکھا گیا ہے کہ اگر محمد علی سازشی اور عیار تھا تو اس کے دوست اس سے زیادہ چالاک تھے۔ اب انہوں نے چاہا کہ خود محمد علی سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے پہلے محمد علی سے اور بعد میں حیدرآباد سے یہ تسلیم کرالیا کہ کمپنی محمد علی کی ایجنٹ ہے۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا معاہدہ بھی ہوا۔ جس میں ملک کرناٹک، سرا وغیرہ کی دیوانی انگریزوں کو تفویض کردی گئی۔ اور ان تمام سندات و اعزازات کو جو بحالت جنگ نے حیدر علی کو شہنشاہ ہند سے دلائے تھے۔ منسوخ قرار دیدیا گیا۔ اور محمد علی کو سرا کا بھی صوبہ دار مان لیا گیا (سندس انڈٹریٹیز)

(یہاں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ اس وقت حیدرآباد میں انگریزوں کا جو سب سے زیادہ دوست تھا۔ وہ رکن الدولہ وزیر تھا۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد ان سازشوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اور کرناٹک سے دست برداری بھی دیدی)

محمد علی کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ وہ اپنے آپ کو اب تمام جنوبی ہند کا حکمران سمجھنے لگا۔ (یہ وہ خواب تھا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا) ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اس کو یہی یقین دلاتی رہی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے۔ اسی کے لئے کر رہی ہے۔ اور محمد علی کو ان پر یقین بھی تھا۔ اور اس کے لئے اس کے پاس وجوہات بھی تھیں۔ اس لئے کہ جارج سوم (George III) شاہ انگلستان بذاتِ خاص اس سے بحیثیت ایک ذاتی دوست کے خط و کتابت کرتا تھا۔ ایک خط میں جارج سوم نے محمد علی کو لکھا :-

"آپ کی اور آپ کے بچوں کی تصویریں ہم کو ہمیشہ اس محبت کی یاد دلائینگی۔ جو آپ کو ہماری قوم سے ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہی محبت آپ کی اولاد بھی ہم سے کریگی۔ اور ہماری بھی ہر وقت یہی کوشش ہوگی کہ آپ کی اور آپ کی اولاد کی نسلاً بعد نسل اسی طرح حفاظت کرتے رہیں"

۱۷۶۹ء میں مدراس کے فورٹ سنٹ جارج میں جو میٹنگ ہوئی۔ اس کی روداد لکھتے ہوئے پریسیڈنٹ نے لکھا :-

"ہماری تمام تر توجہ اور امداد نواب کے حق میں ہونی چاہئے۔ جو ہمارا قدیم اور پُر خلوص دوست ہے"

اس ظاہری محبت آمیز سلوک کا جواب محمد علی نے جس طرح دیا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔

"رائز آف کرسچین پوران انڈیا" کا مصنف لکھتا ہے :-

" جب لارڈ مکارٹنی مدراس کا گورنر ہو کر آیا تو محمد علی نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ اور جس وقت لارڈ مکارٹنی دربار میں پہونچا تو اس کو پوری سلامی دی گئی اور نواب نے ۳۰ ہزار پونڈ بطور تحفہ اس کو دیئے ۔"

اس پُر خلوص دوستی کو تین سال نہ گذرے تھے کہ میسور کی تیسری جنگ میں ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۲ء میں شکست ہوی ۔ اور انگریز مظفر و منصور ہوئے ۔ گویا اب جنوبی ہند میں ان کی طاقت مسلم تھی ۔ اور وہ سب سے بڑھ گئی تھی ۔ اب انہیں محمد علی کی دوستی کی ضرورت نہیں رہی ۔ ٹیپو سلطان سے جو ملک حاصل ہوا تھا ۔ اس پر انہوں نے براہ راست اپنی حکومت قایم کرلی ۔ محمد علی نے اس موقع پر احتجاج بھی کیا ۔ لیکن ایک معاہدہ کے ذریعہ اس کو سمجھا دیا گیا کہ ملک کے بہترین نظم و نسق کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے ۔

انہیں حالات میں ۱۷۹۵ء میں محمد علی نے ترچنا پلی میں وفات پائی ۔ محمد علی کا آغاز جن حالات میں ہوا تھا اور خاتمہ بھی جن حالات میں ہوا ۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسکی حیثیت کبھی شاہ شطرنج سے بڑھکر نہیں رہی ۔ لیکن اس نے اس طویل مدت میں یعنے ۱۷۴۹ء سے ۱۷۹۵ء تک جو کچھ کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام ملک دوسروں کا غلام بن گیا ۔

ارکاٹ کا حشر

محمد علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عمدۃ الامراء مسند نشین ہوا ۔ اس وقت تک ملک میں ارکاٹ کے عامل بھی تھے ۔ اور انگریزوں کے بھی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اب اس دو عملی کا بھی خاتمہ کر دینا چاہا ۔

لارڈ ولزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل ہوکر آیا تھا۔ ۲۴ اپریل ۱۷۹۹ء میں عمدۃ الامرا کو خط لکھا :۔

" یہ آپ کو معلوم ہے کہ ٹیپو سلطان سے جنگ چھڑنے والی ہے۔ اگر یہ جنگ چھڑ جائے تو اس جنگ کو بہترین طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ تمام ملک کرناٹک کو کمپنی اپنے قبضہ میں کرلے "

ولزلی کو معلوم تھا کہ عمدۃ الامراء آسانی سے اس پر راضی نہ ہوگا۔ اس لئے اس نے خط میں عمدۃ الامراء کو اس قرضہ پر توجہ دلائی۔ جو ارکاٹ کی جانب سے واجب الادا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو کمپنی نے کرناٹک کی مدافعت کیلئے اپنی فوج رکھنے کے لئے خرچ کی تھی۔ قرضہ اس لئے واجب الادا تھا کہ محمد علی کی فوج نہ جنگ کے قابل تھی اور نہ انتظام کے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ میسور کی پہلی، دوسری بلکہ تیسری جنگ بھی محمد علی کے ملک کی حفاظت کے لئے ہی کی گئی تھی۔ اس قرضہ کا مطالبہ کرتے ہوئے لارڈ ولزلی نے ملک کی حالت پر بھی توجہ دلاتے ہوئے عمدۃ الامراء کو اسی خط میں لکھا :۔

" دو عملی کی وجہ سے ملک میں بے حد بدنظمی موجود ہے۔ اسکی وجہ سے آپ کو بھی محاصل برابر وصول نہیں ہوتے۔ اور ہمیشہ پریشانی رہتی ہے۔ اگر کمپنی ملک کا پورا انتظام لے لے تو آپ کو بغیر کسی تکلیف کے محاصل کی خالص آمدنی میں سے پانچواں حصہ دیدیا جائیگا "

اس کے جواب میں عمدۃ الامرا نے لکھا کہ ۱۷۹۲ء کے معاہدہ میں اس نے کوئی علاقہ کمپنی کے لئے مخصوص نہیں کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کو اس ملک اور مال غنیمت میں بھی حصہ ملنا چاہئے۔ جو ٹیپو سلطان سے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ وہ ہر سال نو لاکھ طلائی ہن انگریزی فوجوں پر خرچ کر رہا ہے۔

اور انہی فوجوں نے ٹیپو سلطان سے جنگ کی تھیں۔ اس خط کا جواب ولزلی کی جانب سے کچھ نہیں ملا۔ وہ اس وقت میسور کی چوتھی جنگ میں مصروف تھا۔ جنگ ختم ہوگئی۔ سلطنت خداداد کا خاتمہ ہوگیا اب اس کے بعد لارڈ ولزلی نے کرناٹک پر توجہ کی۔ ادھر سے مدراس کے گورنر ہنری ڈنڈاس نے بھی دوبارہ ۵ راگست ۱۷۹۹ء میں گورنر جنرل کو کرناٹک کی دوعملی کا خاتمہ کرنے کیلئے لکھا ولزلی پہلے ہی سوادتیار کر رکھا تھا۔ اب اس نے عمدۃ الامراء پر الزام لگاتے ہوئے لکھا:-

"وہ اور اس کے باپ محمد علی نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد ٹیپو سلطان سے خط و کتابت اور انگریزوں کے خلاف سازش کی تھی۔ یہ تمام خط وکتابت اب ٹیپو سلطان کے کاغذات میں ملی ہے"۔

عمدۃ الامراء نے اس سے انکار کیا۔ اور اسی خط میں اس نے لارڈ ولزلی کو ٹیپو سلطان پر کامل فتح پانے کی مبارک باد دی۔

عمدۃ الامراء کے انکار پر لارڈ ولزلی نے کچھ کارروائی کرنی مناسب نہیں سمجھی اسلئے کہ اسکی تمام تر توجہ اسوقت مرہٹوں کی جانب تھی لیکن وہ ارکاٹ سے غافل بھی نہیں تھا۔ یا کم از کم انگریز اس سے غافل نہیں تھے وہ لارڈ ولزلی کو برابر توجہ دلاتے رہے۔ اور وہ بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے مدراس کے گورنر ہنری ڈنڈاس کے ایک خط کے جواب میں لکھا:-

"رائز آف دی کرسچین پوران انڈیا" کا مصنف لکھتا ہے:-

"جب تک عمدۃ الامراء اور شاہ انگلستان کی براہ راست خط وکتابت رہے گی۔ ہم اس کے ملک پر قبضہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہیں کہ عمدۃ الامراء کی وفات پر مسند نشینی کے لئے جھگڑے پیدا ہوں"۔

ہنری ڈنڈاس کو یہ خط لکھنے کے بعد اس نے انگلستان کے وزیر اعظم کو لکھا کہ:-

" ہندوستان میں کمپنی کے مفاد کے خیال سے شاہ انگلستان کو عمدۃ الامرا سے خط وکتابت کرنے سے روک دیا جائے۔"

یہ خط وکتابت بند ہوگئی۔ اور اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو صرف عمدۃ الامراء کی موت کا انتظار تھا۔ اور خوش قسمتی سے یہ موقع بہت جلد آگیا۔

۱۸۰۱ء میں عمدۃ الامراء بیمار رہا۔ مورخ باسو لکھتا ہے :-

" ۵؍جولائی ۱۸۰۱ء میں کرنل میاک نیل نے فوج بیگم باغ (مدراس) کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ جس میں عمدۃ الامرا بیمار پڑا تھا۔ عذر کیا گیا کہ نواب کی جانشینی کے لئے محل میں ممکن ہے کہ ہنگامہ ہو جائے۔ صرف اس کو روکنے کیلئے یہ فوج آئی ہوئی ہے۔ میجر گرانٹ جب محل میں گیا تو بوڑھا نواب اپنے بستر سے اٹھا۔ اور میجر گرانٹ سے التجا کی۔ کہ اس آخیر وقت میں اس کو اس طرح اس کی رعایا کے سامنے ذلیل نہ کیا جائے کہ فوج آکر اس کے محل پر قبضہ کرلے۔ میجر گرانٹ نے کرنل میاک نیل سے جب یہ بات جا کر کہی تو اس نے انسانیت کو کام میں لاکر فوج کو اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ لیکن محاصرہ بدستور جاری رہا۔ آٹھ دن کے بعد عمدۃ الامراء کا انتقال ہوگیا۔ نواب کے انتقال ہوتے ہی اس کے جانشین کو اس کے کمرہ سے کھینچ کر لایا گیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ اس کے دادا نواب والاجاہ محمد علی اور باپ نواب عمدۃ الامراء اور ٹیپو سلطان کے درمیان جو خط وکتابت اور سازش ہوئی ہے۔ اس کا جواب دیا جائے۔"

(نوٹ :- بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ والاجاہ محمد علی نے سازش کی تھی تو یہ کس قدر ستم ظریفی تھی کہ اس کا جواب اس کے پوتے سے طلب کیا جائے)

بے قصور شہزادہ آخر اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن کمپنی نے دادا کے مفروضہ جرم پر پوتے کو محروم کرکے ۲۸ جولائی ۱۸۰۱ء میں اعظم الدولہ کو منتخب کیا جس نے کمپنی کی تمام شرائط کو منظور کر لیا۔ اعظم جاہ کو نواب کرناٹک کا خطاب دیا گیا۔ اور نوابی کی تمام ظاہرا شان قایم رکھی گئی۔ دو عملی کا خاتمہ کرکے انگریزوں نے ملک پر مکمل قبضہ کر لیا۔ سلطنت خداداد کے تمام مقبوضات یعنے میسور وغیرہ کمپنی کے قبضہ میں آچکے تھے۔ اب جنوبی ہند میں صرف چار اضلاع بلاری، کڑپہ، کرنول اور اننت پور باقی تھے۔ جو حیدرآباد کو دیدے گئے تھے۔ لیکن کمپنی نے اسی سال ایک معاہدہ کے ذریعہ ان اضلاع کو بھی لے لیا۔ اسطرح تمام جنوبی ہند مسلمانوں کے قبضہ سے نکلکر ۱۸۰۱ء میں انگریزوں کے ماتحت آگیا۔ اور اسی سال تنجاور کی مرہٹی ریاست کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ جو پہلے نواب ارکاٹ کی اور بعد میں براہ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کی باجگذار رہی ہوی تھی۔

سلطنت خداداد اور ارکاٹ کے خاتمہ کے بعد ملک میں جو ریاستیں باقی رہ گئیں۔ وہ یہ ہیں :— میسور، ٹراونکور، کوچین، پدوکوٹہ، سندور اور بنگن پلی۔ ان ریاستوں کی مختصر تاریخ ضمیمہ میں دی گئی ہے۔ ان ریاستوں کے علاوہ ملک میں کئی ایک زمینداریاں بھی ہیں۔

نوابان ارکاٹ کی ظاہری شان وشوکت لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ تک رہی۔ اور یہ بھی صرف اس لئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوری توجہ شمالی ہند کی تسخیر پر تھی۔ اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں انہوں نے نوابان ارکاٹ کی ظاہری شان وشوکت کو بھی ختم کر دینا چاہا۔ لارڈ ہارس نے جو اس وقت مدراس کا گورنر تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کو لکھا :۔

"نوابان ارکاٹ کو ملک کے اصلی وارث مانتے ہوئے ان کی ظاہری شان وشوکت

کو اسی طرح قایم رکھا گیا تو احتمال ہے کہ آئندہ اس ملک میں سازش اور بغاوت ہو۔"

اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لارڈ ڈلہوزی نے ارکاٹ کی برائے نام نوابی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ نواب غلام غوث خاں ارکاٹ کا آخری نواب تھا۔ اس کی وفات پر اسکے جانشین کو نواب کے خطاب سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اور تمام ظاہری شان و شوکت کو ختم کر کے اس کے جانشین کو پرنس آف ارکاٹ (Prince of Arcot) کا خطاب دیتے ہوئے پنشن دیدی گئی۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے مورخ باسو لکھتا ہے :-

"کمپنی نے عظیم جاہ کو بھی نواب کے خطاب سے محروم کر دیا۔ اگرچہ قانونی طور پر وہ نواب کے باجگذار تھے اور انہیں نوابوں کی دی ہوئی سندات سے وہ ملک پر حکومت کر رہے تھے۔

خاتمۃ الکتاب

اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح ملک کی دو بڑی قوموں میں سیاسی برتری کیلئے پانچسو سال تک خونین ہنگامے برپا رہے اور جب ملک مسلمانوں کے ہاتھ آگیا تو کس طرح ان کی آپس کی نااتفاقی رشک و حسد اور خود غرضی سے انکی ہی بنائی حکومتیں غیروں کے ہاتھ میں چلی گئیں اور وہ حاکم سے محکوم بنکر رہگئے۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ دونوں قومیں کبتک اسطرح ایک دوسرے سے علیحدہ رہینگی؟ مسلمان اس ملک کو اپنا بنا چکے ہیں۔ ہزار سالہ رہائش نے انہیں یہ حق دیدیا ہے کہ اس ملک کو وہ اپنا ہی سمجھیں۔ اسکے باوجود بھی اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک مسلمانوں کا نہیں ہوسکتا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ملک ہندوؤں کا بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی تو کسی زمانے میں باہر ہی سے آئے ہوئے تھے۔ جس طرح مسلمانوں نے ملک ہندوؤں سے حاصل کیا۔ اسیطرح ہندوؤں نے قدیم جنگلی اقوام سے حاصل کیا تھا اس لئے یہ مسئلہ ہی خارج از بحث ہے کہ ملک ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ خصوصاً ایک ایسے وقت جب ملک پر ایک دوسری ہی قوم حکمران ہے۔

مصنف کتاب اس سے بھی آگاہ ہے کہ دن بدن ملک میں یہ جذبہ ترقی کر رہا ہے کہ غیروں کی محکومی سے نجات حاصل کیجائے۔ لیکن جبتک ان دونوں قوموں میں حقیقی اتحاد نہ ہو یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوسکتا۔ تقریروں اور رزولیوشنوں سے اتحاد قایم ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اسکیلئے ضروری ہے کہ زاویۂ نگاہ کو بدلا جائے۔ قلب میں وسعت پیدا ہو۔ اور ایک دوسرے کے جائز حقوق کا احترام کیا جائے۔

دیباچہ میں میں نے لکھ آیا ہے :-

"آج ہندوؤں کے ایک طبقہ میں پھر وہی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ جو آج سے
چھ سو سال پیشتر موجود تھا۔ آج پھر وہی آواز ملک میں گونج رہی ہے کہ ہندوستان
ہندوؤں کیلئے ہے۔ اور مسلمانوں کو کوئی حق نہیں کہ اس ملک کو اپنا سمجھیں"

اسلئے ابتدا جب ہندوؤں سے ہوئی ہے تو ضروری ہے کہ اتحاد کرنے کیلئے وہ خود پیش قدمی کریں۔ مجھے امید ہے کہ جب حقیقی اتحاد کیلئے ہاتھ بڑھایا جائیگا تو مسلمان ضرور خوشی سے خیر مقدم کرینگے۔

اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ملک میں ایک حقیقی اتحاد پیدا ہونے اور غیروں کی محکومی سے آزاد ہونے کیلئے ضروری ہے کہ خود مسلمان ایک نقطۂ نظر پر متحد ہو جائیں ورنہ جبتک ان میں اتحاد پیدا نہیں ہوگا مقصد براری مشکل ہے۔ میں نے یہ اس لئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اب نہ صرف مذہبی اختلافات ہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی مسلمان علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

تاریخ ہمارے آگے ہے۔ وہ بتلا رہی ہے کہ کس طرح دکن کی اسلامی سلطنتیں مذہبی اختلافات کی آگ میں بھسم ہو کر رہگئیں۔ کس طرح سیاسی اختلافات اور خود غرضیوں نے ارکاٹ، سرا اور سلطنتِ خداداد کو تباہ کر کے رکھدیا۔

دیباچہ میں میں نے یہ بھی لکھ آیا ہے کہ :-

"میرا کام صرف واقعات پیش کرنا تھا"

میں نے پورا کر دیا ہے۔ تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے متن میں جن واقعات کو بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضمیموں میں اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کتاب کو شائع کرنے سے میں نے ایک علمی و قومی خدمت انجام دی ہے۔ مقبولیت اسی کارساز حقیقی کے ہاتھ ہے۔ جس نے مجھے اسکے پورا کرنے کی توفیق بخشی۔

بنگلور مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء

ضمیمہ (۱)

تاریخِ میسور

موجودہ زمانے میں میسور سے مراد وہ تمام علاقہ لیا جاتا ہے۔ جو ریاستِ میسور کہلاتا ہے۔ اور جس کا رقبہ ۲۹۳۲۶ مربع میل اور آبادی پینسٹھ (۶۵) لاکھ ہے۔ جس میں مسلمان چار لاکھ، عیسائی ایک لاکھ اور باقی ساٹھ (۶۰) لاکھ ہندو ہیں۔ جن میں چار لاکھ کے قریب برہمن ہیں۔ بجٹ قریباً چار کروڑ ہے۔ اس ریاست کی تشکیل سلطنت خداداد کی تباہی کے بعد عمل میں آئی۔ لارڈ ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں سقوط سرنگاپٹم اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد مناسب سمجھا کہ سلطان کے بچوں کو سلطنت سے محروم کرکے ایک ہندو ریاست قایم کرے۔ جو انگریزی مفاد کی ممد و معاون رہے۔ ورنہ موجودہ خاندانِ میسور کے زیر حکومت جو ملک قدیم زمانے میں تھا۔ اس کی وسعت چند میل سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کا رقبہ موجودہ شہر میسور، کروگ ہلی اور ہڈناڈ کی جاگیروں تک محدود تھا۔

بہر طور میسور کی موجودہ ریاست جن علاقوں پر مشتمل ہے۔ اُن علاقوں کی قدیم تاریخ جنوبی ہند کی تاریخ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ وہ تمام خاندان سوائے دو چار کے جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں آچکا ہے۔ اس ملک کے مختلف حصوں میں حکمران رہ چکے ہیں۔ لیکن جس طرح جنوبی ہند کی قدیم تاریخ قعر گمنامی میں پڑی ہوی ہے۔ میسور کی تاریخ کی بھی یہی

حالت ہے۔ مذہبی روایات نے اس سرزمین کو راماین اور مہابھارت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رامچندرجی شمال سے آکر اس ملک ہی میں سرینگری کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ کتاب مہاوسا سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ اسوکا نے تبلیغ مذہب کے لئے اس ملک میں بھی مبلغین کو روانہ کیا تھا۔ (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا)

میسور میں اس زمانہ کا جو کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "تیسری صدی میں اس ملک کا شمال مشرقی حصہ مہاراجہ اسوکا کی سلطنت کا ایک حصہ رہا تھا"۔ (تاریخ رئیس)

لیکن بعض مورخین کہتے ہیں کہ اسوکا نے صرف تبلیغ مذہب کے لئے یہاں مبلغین کو روانہ کیا تھا۔ اس کے بعد آندھرا اور ستیاون خاندان یہاں حکمران رہے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں چولا اور ہوئے سالا خاندانوں کی حکومت اس ملک میں رہی۔ بعد میں ہوئے سالا خاندان ملک پر پوری طور پر قابض ہوگیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت زبردست راجہ بانی تھی۔ جس کا تمام جنوبی ہند پر نہایت مستحکم اثر قایم تھا۔ اس خاندان میں بٹی دیوا جس کا عہد ۱۱۰۴ء سے ۱۱۴۱ء تک ہے۔ نہایت زبردست راجہ گذرا ہے۔ اسی خاندان میں راجہ بلا سوم بھی ہوا ہے۔ جس پر ملک کافور نے ۱۳۱۰ء میں حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت اس راجدھانی کا پایۂ تخت دوار سمندرم میں تھا۔ جس کو اب ہلے بید کہا جاتا ہے۔ راجہ بلالا سوم کو اس جنگ میں شکست ہوی۔ ملک کافور نے اس کو قید کرکے دہلی بھیجدیا۔ جہاں شہنشاہ علاؤالدین نے باجگذاری کا عہد لیکر اس کو رہا کردیا۔ شہنشاہ علاؤالدین کے بعد جب پھر راجہ نے سرکشی کی تو مبارک شاہ خلجی نے اس پر دوبارہ فوج کشی کی۔ تیسرا حملہ اس ملک پر محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہوا۔ جب راجہ نے اس کے بھتیجے گشتاسپ کو پناہ دی تھی۔ شہنشاہ محمد بن تغلق کا حملہ اپنے اثر کی درجہ سے ایک یادگار حملہ ہے۔ شہنشاہ ترکی النسل تھا اور راسی

لحاظ سے آج بھی مسلمانوں کو نہ صرف میسور بلکہ کل جنوبی ہند میں "ترک" کہا جاتا ہے۔ یہ شہنشاہ محمد بن تغلق کا ہی آخری زمانہ تھا کہ اس کے گورنر دکن۔ مدورا، ملیبار وغیرہ میں باغی ہوگئے۔ اور ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ وجیانگر کی بنیاد ڈالی۔ سلطنت وجیانگر کے ابتدائی زمانہ میں ہوسے سالا سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا اور سلطنت وجیانگر نے جنوبی ہند اور ملک میسور پر بتدریج قبضہ کرلیا۔ اور اس کی جانب سے حکمرانی کے لئے ہر جگہ وائسرائے اور گورنر مقرر ہوئے۔ میسور میں بھی ایک وائسرائے مقرر ہوا۔ جس کا مستقر سرنگاپٹم تھا۔ ملک کے تمام چھوٹے چھوٹے راجہ جنہیں پالیگار کہا جاتا ہے اس وائسرائے کو خراج دیتے تھے ان راجاؤں یا پالیگاروں کی حکومت کا رقبہ چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔

ولکس اپنی تاریخ میسور کے صفحہ ۲۲ پر لکھتا ہے :-

"جب میسور کا راجہ نجن گڈھ کے تیرتھ کو جانا چاہا تو اس کو راستے میں دو دوسرے راجاؤں سے اجازت لینی پڑی"

میسور اور ننجن گڈھ کا درمیانی فاصلہ ۱۶ میل کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان پالیگاروں کی حکومت کہاں تک وسیع تھی۔ تمام ملک ان پالیگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ انہیں میں ہڈناڈ کی بھی ایک مختصر ریاست تھی۔ (جو موجودہ شہر میسور کے بالکل قریب ہے)

وڈیر خاندان

وجیانگر کی سلطنت کو قایم ہوئے نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ گذرتا ہے کہ ۱۳۹۹ء میں اس گاؤں میں جس کو ہڈناڈ کہا جاتا ہے۔ دوارکا (گجرات) سے دو بھائی قسمت آزمائی کے

لئے آکر مقیم ہوئے - ان دو بھائیوں کے نام وجیا اور کرشنا تھے - یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ہڈناڈو کا پالیگار چامراج دیوانہ ہو کر کہیں چلا گیا ہے - اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمسایہ ریاست کروگ ہلی کا پالیگار چامراج کی بیٹی دیواجی منی سے جبریہ شادی کرنا چاہتا تھا - کروگ ہلی کا خاندان ذات کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کا تھا - اس لئے ہڈناڈو کی رانی اس شادی سے ناراض تھی - لیکن وہ بے بس تھی - رانی کی اس بے بسی کو دیکھ کر ان دونوں بھائیوں نے اس کی امداد کرنی چاہی - دونوں بھائی اپنے ساتھیوں کو لیکر محل میں چھپ گئے - اور جب شادی کی رسومات ادا کرنے کے لئے نوشاہ اور اس کے رفقا آئے - تو انہیں قتل کر دیا گیا - اس غیر متوقع کامیابی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے - اور انہوں نے کورگ ہلی پر حملہ کر دیا - اور اس گاؤں کو اپنے قبضہ میں لاکر ہڈناڈو کو واپس ہوئے - جہاں بڑے بھائی وجیا سے اس لڑکی یعنے دیواجی منی کی شادی ہوگئی - اور وجیا ہڈناڈ اور کروگ ہلی کا حاکم بن گیا - اور یہی وجیا موجودہ خاندان میسور کا مورث اعلیٰ ہے -

مورخین نے پتہ لگایا ہے کہ وجیا کا دور حکومت ۱۳۹۹ء سے ۱۴۲۳ء تک تھا - وجیا کے بعد اس خاندان میں مندرجۂ ذیل پالیگار گذرے ہیں -

ہری بٹاڈا چامراج	۱۴۲۳ء سے ۱۴۵۸ء تک
تمّاراج اوڈیر اول	۱۴۵۸ " ۱۴۷۸ء "
ہرے چامراج اوڈیر دوم	۱۴۷۸ " ۱۵۱۳ "
بٹاڈا چامراج اوڈیر سوم	۱۵۱۳ " ۱۵۵۲ "
تمراج اوڈیر دوم	۱۵۵۲ " ۱۵۷۱ "

(اوڈیر:- مورخ رئیس لکھتا ہے کہ یہ ایک کنڑی لفظ ہے - جس کی معنی صاحب یا آقا کے ہیں - ولکس لکھتا

ہے کہ اس زمانے میں جب یہ لقب مروج ہوا۔ اوڈیراس حاکم کو کہتے تھے۔ جس کے ماتحت ۳۲ گاؤں ہوتے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں یہی خطاب چولا خاندان کے راجہ اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں وجیانگر کے راجاؤں نے بھی اختیار کر لیا تھا۔)

اس تمراج اوڈیر کا زمانہ ہی تھا۔ کہ سلطنت وجیانگر میں انقلاب آیا۔ ۱۵۶۴ء میں دکن کی اسلامی سلطنتوں نے متحد ہو کر تالیکوٹہ میں ہندوؤں کو شکست دی۔ اس کے بعد سے ہی اس سلطنت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ اور وجیانگر کے حکمران اپنی راج دھانیوں کو منتقل کرتے رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی یہ بھی کوشش رہی کہ پھر ہندوؤں کو ایک مرکز پر جمع کریں۔ اس کوشش میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ تالیکوٹہ کی جنگ نے سلطنت کی دھاک جو دور دور تک بیٹھ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ کم کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے وائسرائے یا گورنر جہاں جہاں تھے۔ ان کا اقتدار فنا ہوتا چلا گیا۔ ہندوؤں کی اس عظیم الشان سلطنت کی تباہی کے راز کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد اجزائے سلطنت کی پریشانی میں ان ماتحت راجاؤں اور پالیگاروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جو پہلے اس سلطنت کے زیر نگین اور اب آزاد ہونا چاہتے تھے۔ ان راجاؤں یا پالیگاروں میں سب سے نمایاں حیثیت مدورا کے نایک اور میسور کے راجا کو حاصل ہے۔ تالیکوٹہ کی جنگ ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ میسور کا راجہ تمراج وڈیر ۱۵۷۱ء تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی زندگی تک وجیانگر کے وائسرائے کو جو سرنگاپٹم میں مقیم تھا۔ خراج ادا کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس کے جانشین بول چامراج وڈیر نے خراج دینا بند کر دیا۔ یہ پہلی بغاوت تھی۔ جو حاکم اعلیٰ سے میسور والوں نے کی۔ گو اس وقت خراج ادا نہ کرنے کے لئے یہ بہانہ اٹھایا گیا کہ حفاظتی دیوار کے نہ ہونے سے جنگلی جانوروں نے فصلات تباہ کر دی ہیں۔

لیکن جب حفاظتی دیوار تیار ہوگئی۔ تو وائسرائے کے نمائندوں کو میسور سے نکال دیا گیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے وائسرائے نے راجہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن اس نے کوشش کی کہ بول چامراج کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی بول چامراج نے اخیر وقت تک خراج ادا نہیں کیا۔ اس کی وفات ۱۵۷۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد بیٹا ڈوا چامراج اس کا جانشین ہوا۔ دو برس کے بعد امراء نے اس کو معزول کرکے اس کے چھوٹے بھائی راج وڈیر کو حاکم بنایا۔ راج وڈیر کے زمانے میں حالت یہ رہی کہ کسی سال میں خراج ادا کیا جاتا اور کسی میں نہیں۔

جب راج وڈیر کو پورا یقین ہوگیا۔ کہ وائسرائے برائے نام ہی رہ گیا ہے تو اس نے سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے گئے۔ جنہیں سازشوں کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی کتب میں ان سازشوں کا مبہم الفاظ میں ذکر آیا ہے۔

رئیس اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶۴ پر لکھتا ہے :-

"سرنگاپٹم سے وائسرائے کو رخصت کرنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے گئے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ذرائع کیا تھے۔"

ولکس اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے :-

"اس زمانے کے حالات مختلف مسودوں میں ملتے ہیں۔ لیکن بیانات اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے کوئی نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس قدر تو ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے گئے جو ہمعصر مورخوں کی سمجھ سے باہر تھے۔"

عام طور پر جو روایت مشہور ہے وہ یہ ہے کہ " وائسرائے بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور

اس کو مرض سرطان ہوگیا تھا۔ جب اسے زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے حکومت راج وڈیر کے تفویض کر دی اور خود تالکاٹ کو چلا گیا۔ لیکن یہ ہدایت کر گیا کہ اس کی وفات کے بعد حکومت آمانور کے پالیگار کے حوالے کر دی جائے۔"

ولکس کو اس روایت پر یقین نہیں آتا۔ وہ اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے :۔

" وائسرائے اور راج وڈیر کے سالہا سال کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تین سال پیشتر ہی وائسرائے نے راج وڈیر کی جان لینی چاہی۔ یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے کہ وائسرائے نے اس شخص کو حکومت تفویض کر دی ہو۔"

بہر طور وجیانگر کا وائسرائے ۱۶۱۰ء میں سرنگاپٹم سے رخصت ہوگیا اور راج وڈیر نے سرنگاپٹم پر قبضہ کرتے ہوئے اس کو اپنی راجدھانی کا پایۂ تخت بنایا۔ اس کے بعد اس نے اطراف کے پالیگاروں کو مطیع کر کے ریاست کو ترقی دی۔ خاندان میسور میں راج وڈیر ہی پہلا حکمران تھا جس نے اپنے قدیم جنگم عقائد کو چھوڑ کر وشنو عقائد اختیار کئے۔

راج وڈیر کی وفات ۱۶۱۷ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا پوتا چامراج وڈیر مسند نشین ہوا۔ اس نے ۱۶۳۰ء میں چن پٹن پر جو سرنگاپٹم سے تقریباً ۳۰ میل شمال میں واقع ہے۔ قبضہ کر لیا اس زمانہ میں ان پالیگاروں میں جنگ کس طرح ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ ولکس کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے :۔

" میسوری فوج ہگدیون کوٹہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلی۔ اس وقت یہاں چن راج وڈیر حاکم تھا۔ میسوری فوج کی آمد کی خبر سن کر چن راج وڈیر کے وزیر نے حملہ آوروں سے آ کر کہا:" میرا آقا شکار کے لئے باہر گیا ہے۔ اور فوج بھی اس کے ساتھ ہے۔ محل

رانی حاملہ ہے۔ اور اس حملہ کی خبر سن کر نہایت خوف زدہ ہے۔ صرف پچاس سپاہی
محل کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ اور آج کل بارشوں کی وجہ سے قلعہ کی فصیل میں
بھی دو بڑے بڑے شگاف پڑ گئے ہیں۔ ایسے وقت میں جب راجہ اور فوج یہاں نہیں
ہے تو آپ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس وقت حملہ کریں۔"

چامراج وڈیر کا عہد بیس سال تک رہا ۱۶۳۷ء میں اس کے انتقال پر اس کا چچا اماڈی
چامراج وڈیر مسند نشین ہوا۔ ابھی اسکی مسند نشینی کو ڈیڑھ سال بھی نہ گذرا تھا کہ اس کے وزیر
نے اس کو زہر دیکر ختم کر دیا۔ اور کنٹ ریوا نرسراج وڈیر کو مسند نشین کیا گیا۔ وزیر اس کو بھی
اپنا مطیع نہ پاکر اسے بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن نرسراج نے ہی خود وزیر کا خاتمہ کر دیا۔

بیجا پور کا حملہ میسور پر

۱۶۳۸ء

ابھی نرسراج وڈیر کو مسند نشین ہوئے ایک سال بھی نہ گذرا تھا۔ کہ جنرل رن دولہ خان
کے ماتحت بیجا پور کی اسلامی فوجیں میسور پر چھا گئیں۔ یہ ایک طوفانی حملہ تھا جو عالمگیر اورنگ
زیب کے حکم سے ہوا تھا۔ عالمگیر اس وقت دکن کا وائسرائے تھا۔ بیجا پور نے اس کی اطاعت
قبول کر لی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ بیجا پوری فوج جواب تک مغلوں کے خلاف جنگ آزما تھی
جنوب پر حملہ کرے۔ اس حملہ کے سلسلے میں رن دولہ خان نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ نے
اطاعت قبول کر لی۔ اور اس طرح میسور بیجا پور کا باجگذار بن گیا۔ بیجا پور کے وائسرائے کا
صدر مقام سرا تھا۔ جو بنگلور سے ۷۰ میل شمال میں ہے۔ رن دولہ خان کے ساتھ اس وقت
ایک مرہٹہ افسر بھی تھا۔ جس کا نام شاہ جی تھا۔ اس کی خدمات کے صلہ میں بنگلور اس کو بطور

جاگیر دیا گیا۔ بیجا پور والوں کو صرف خراج سے تعلق تھا۔ انہوں نے پالیگاروں اور راجاؤں کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اس لئے نرسراج وڈیر نے دوسرے پالیگاروں سے جنگ کرکے بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ اسی سلسلے میں اس نے ماگڑی کیمپے گوڈا کو جس کو موجودہ بنگلور کا بانی کہا جاتا ہے۔ یلہنکا کے معرکہ میں شکست دی۔ اور جنوب میں ستی منگل تک ملک کو اپنے قبضہ میں لے آیا۔ ان فتوحات سے جو مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس سے اس نے سرنگا پٹم کے قلعہ کو مستحکم بنایا۔ دربار میں شاہانہ رنگ پیدا ہو چلا۔ اسی راجہ نے پہلے پہل ٹکسال قایم کی۔ اور جو طلائی سکے رائج ہوئے وہ کنٹی رایا ہُن کہلاتے تھے۔ اس راجہ کا انتقال ۱۶۵۹ء میں ہوا۔

نرسراج کے بعد دعویدار حکومت دو شخص تھے۔ ان میں ڈوڈ دیوراج منتخب ہوا۔ اور دوسرے چکدیوراج کو ہنگالہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ ڈوڈ یوراج کی حکومت میں وجیانگر کا برائے نام نمایندہ سری رنگا رایا جواب تک تالکاٹ میں مقیم تھا۔ فرار ہو کر بدنور کے راجہ کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہ آخری ضرب تھی جو میسور نے وجیانگر کے دم توڑتے ہوئے اقتدار پر لگائی۔ اور اس کے بعد سے وجیانگر کا نام میسور کی تاریخ سے محو ہو جاتا ہے۔ اس مفرور والیسرائے کی حمایت لیکر بدنور والوں نے میسور پر حملہ کیا۔ لیکن انہیں شکست ہوی۔ اس کے بعد ہی مدورا کے نایک نے بھی میسور کے علاقے پر حملہ کیا۔ لیکن اس کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ ڈوڈ یوراج کا انتقال مقام چک نائن ہلی میں ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ اور چک دیوراج وڈیر جو نظر بند تھا مسند نشیں ہوا۔ اس راجہ کے عہد میں ریاستِ میسور کو بہت ترقی ہوی۔ تاریخ جنوبی ہند میں یہ وہ زمانہ ہے کہ سیواجی کو پورا عروج حاصل ہو چکا تھا۔ اور اس کے اور بیجا پور کے درمیان خونریز معرکے ہو رہے تھے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر چکدیوراۓ نے اپنی فتوحات کو وسعت دینی

شروع کی۔ لیکن وہ اس قدر محتاط تھا کہ اس علاقہ پر جس پر بیجا پور یا مرہٹوں کا اقتدار قایم ہو چکا تھا۔ بالکل دخل نہیں دیا۔ یا بالفاظ دیگر مرہٹے اور بیجا پور والے اپنی باہمی لڑائیوں میں اس قدر مصروف تھے، کہ وہ ادہر توجہ نہ کر سکے سنہ ۱۶۸۰ء میں سیواجی کا انتقال ہوا۔ اس کے سات سال بعد عالمگیر اورنگ زیب نے جو اس وقت شہنشاہ تھا۔ بیجا پور پر قبضہ کر لیا۔

بیسویں
سلطنت مغلیہ کی باجگذار ریاست

یہ لکھا جا چکا ہے کہ بیجا پور کی جانب سے مرہٹہ شاہ جی کو بنگلور کی جاگیر دی گئی تھی شاہ جی نے اپنے انتقال کے وقت اس جاگیر کو اپنے دوسرے بیٹے یکوجی کو جو تنجاور کا حاکم تھا دیدیا تھا۔ لیکن سیواجی اور اس کے جانشینوں نے جو پونا اور جینجی میں تھے۔ یکوجی کے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا۔ اور ان کی نظر برابر بنگلور پر لگی رہی سنہ ۱۶۸۷ء میں یکوجی نے بنگلور کو اپنی راجدہانی تنجاور سے بہت دور سمجھ کر اس کو میسور کے راجہ کے ہاتھ ۳ لاکھ روپیوں میں فروخت کر دینا چاہا اور ایک مختصر سی فوج بھی بھیجدی کہ بنگلور کو باقاعدہ راجہ کے حوالے کر دیا جائے۔

بنگلور کے اس خرید و فروخت کی خبر کسی طرح شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو بھی پہونچ گئی۔ عالمگیر اس وقت دکن میں تھا۔ اس نے اپنے جنرل قاسم خاں کو حکم دیا کہ فوراً بنگلور پر قبضہ کر لیا جائے۔ قاسم خاں نے شبانہ روز کوچ کر کے بنگلور پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ایک جانب سے یکوجی کی فوج بنگلور کی طرف بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف سے میسور نے

راجہ کی فوج قبضہ کرنے کے لئے آرہی تھی۔ ان فوجوں کو جب معلوم ہوا کہ مغلوں نے بنگلور پر قبضہ کرلیا ہے تو دونوں پیچھے ہٹ گئیں۔ بنگلور پر قبضہ ہو جانے کے بعد صوبۂ بالاگھاٹ پر قاسم خان کو فوجدار دیوان مقرر کرتے ہوئے عالمگیر نے حکم دیا کہ تمام پالیگاروں پر فوج کشی کی جائے۔ قاسم خان نے یکے بعد دیگرے تمام پالیگاروں کو مطیع کرلیا۔ اور اسی سلسلہ میں میسور کا راجہ بھی سلطنت مغلیہ کا باجگذار بن گیا۔ قاسم خان نے بنگلور کو تین لاکھ روپیوں میں راجہ کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس کے بعد میسور کے راجہ چک دیورایا نے اظہار اطاعت کے طور پر شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے دربار میں تحائف بھیجے۔

(نوٹ :- راجہ کے اس اظہار اطاعت کے متعلق ایک سنگین کتبہ بڑے بالاپور میں نصب ہے)

اس راجہ چک دیورا کا انتقال ۱۷۰۴ء میں ہوا۔

چک دیورایا کے انتقال پر وزیروں نے اپنا اقتدار جما لیا۔ وہ جس کو چاہتے تھے راجہ بناتے تھے۔ چک دیورایا کے بعد وزیروں نے راجہ کنٹی ریوا کو مسند پر بٹھایا اس کے بعد اور تین راجہ ہوئے۔

کنٹی ریوا وڈیر	۱۷۰۴ء سے ۱۷۱۳ء تک
ڈوڈ کرشنا راج وڈیر اول	۱۷۱۳ " ۱۷۳۱ "
چامراج وڈیر ہفتم	۱۷۳۱ " ۱۷۳۴ "
کرشنا راج وڈیر ثانی	۱۷۳۴ " ۱۷۶۶ "

یہ کرشنا راج وڈیر ثانی کا زمانہ ہی تھا کہ ایک مسلمان سپاہی کی قسمت کا ستارہ پس منظر طلوع ہو رہا تھا۔ اس مسلمان سپاہی کا نام حیدر علی تھا۔ جس نے میسور کے نام کو جو اس وقت تک صرف مقامی طور پر مشہور تھا۔ چاردانگ عالم میں شہرت دی۔

حیدر علی کا جس وقت آغاز ہو رہا تھا۔ میسور کی حالت نہایت سقیم تھی۔ مرہٹوں کے پے در پے حملے، اس کے بعد ارکاٹ والوں کی چڑھائی، نواب ناصر جنگ کا حملہ اور پھر مرہٹوں کی فوج کشی نے ملک کا بالکل دیوالیہ نکال دیا تھا۔ اور دوسری طرف راجا اور وزیروں میں اختلاف یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ ایک وزیر نے محل پر گولہ باری بھی کی۔ اور راجہ کو اطاعت اختیار کرلینی پڑی۔

اس کے بعد میسوری فوج کو نواب ناصر جنگ کی طلبی پر ارکاٹ کو جانا پڑا۔ اس کے بعد ارکاٹ کے نواب والا جاہ محمد علی نے وزیر نندراج کی تائید چاہی۔ اور میسوری فوج ترچناپلی کو گئی۔ حیدر علی ان دونوں مہموں میں شریک تھے۔ اس سے پہلے حیدر علی میسوی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھے۔ دیون ہلی کے معرکہ میں انہوں نے جو نمایاں کام کئے۔ اس سے خوش ہو کر راجہ نے انہیں ایک دستہ کا افسر مقرر کردیا۔ اس عہدہ کو میسور اور جنوبی ہند میں نایک کہا جاتا ہے۔ ترچناپلی میں حیدر علی نے جو کارہائے نمایاں کئے۔ ان سے خوش ہو کر وزیر ننجراج نے انہیں ڈنڈگل کا گورنر مقرر کیا۔ حیدر علی ڈنڈگل میں تھے کہ مرہٹوں نے پھر میسور پر حملہ کردیا۔ اس سے پہلے کی جنگ میں تاوان ادا نہ ہونے کی وجہ سے میسور کا تمام علاقہ مرہٹوں کے پاس رہن تھا۔ اس وقت مرہٹوں نے اس پر مستقل قبضہ کرنا شروع کیا اور مزید تاوان بھی طلب کیا۔ خزانہ خالی تھا۔ تاوان ادا نہ ہوسکا۔ مرہٹوں نے سرنگاپٹم کے محاصرہ کی تیاری شروع کی۔ اسوقت وزیر نندراج نے جو ستی منگل میں مقیم تھا۔ کچھ رقم دیکر بھیجی۔ لیکن مرہٹے اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہ دیکھ کر حیدر علی کو ڈنڈیگل سے طلب کیا گیا۔ جنہوں نے آکر میسور کو مرہٹوں کے پنجے سے رہائی دلائی۔ اور یہی نہیں بلکہ رانیوں کی درخواست پر راجہ اور وزیروں کے تعلقات کو سلجھاتے ہوئے وزیروں کو علیٰحدہ

کردیا۔ اس سے خوش ہوکر راجہ نے حیدرعلی کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ فوج کو ایک عرصہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ حیدرعلی نے اس کا بھی انتظام کیا۔ جس سے فوج انکی گرویدہ ہوگئی۔ حیدرعلی کی اس بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی کو دیکھ کر راجہ اور رانیوں کے دل میں خوف پیدا ہوگیا کہ کہیں حیدرعلی ریاست پر قبضہ نہ کرلے۔ اس لیئے راجہ نے حیدرعلی کے ملازم کھنڈے راؤ سے (جو حیدرعلی کی اجازت سے راجہ کا وزیر بن گیا تھا) سازش کی کہ حیدرعلی کا خاتمہ کردیا جائے۔ دوسری طرف مرہٹوں کو لکھا گیا کہ اگر مرہٹے بحیثیت ہندو ہونے کے تائید نہ کریں تو یہ قدیم ہندو ریاست مسلمانوں کے قبضہ میں چلی جائیگی۔ مرہٹوں نے مدد دینے کا وعدہ کرلیا۔ اور ان کی ایک فوج میسور میں آگئی۔ لیکن حیدرعلی کو بھی اس سازش کا پتہ چل گیا۔ اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے تن تنہا سرنگا پٹم سے فرار ہوکر بنگلور میں آکر پناہ گزین ہوئے یہاں پہونچکر انہوں نے راجہ اور کھنڈے راؤ سے بدلہ لینا چاہا۔ اس لئے کہ انکی خدمات اور جاں نثاری کا صلہ یہ نہیں تھا کہ خود انکی جان لینے کی کوشش کیجائے حیدرعلی نے فوج بھرتی کی۔ دوسری طرف مرہٹے اور راجہ کی فوج کھنڈے راؤ کی سپہ سالاری میں بنگلور کی جانب بڑھیں۔ ایک خونریز معرکہ میں راجہ کی فوج اور مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اور حیدرعلی نے ۱۷۶۱ء میں سرنگا پٹم پر قبضہ کرلیا۔ اب اس وقت میسور کی راجدھانی اس بہادر سپاہی کے رحم وکرم پر تھی۔ جس نے اپنی فیاضی سے راجہ کو تین لاکھ کی قدیم جاگیر کا علاقہ دیکر باقی ملک پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اسی سال نواب بسالت جنگ (حیدرآباد) نے فوجی تائید کے صلہ میں حیدرعلی کو شہنشاہِ مغلیہ کی جانب سے سرا کی صوبہ داری بھی دلوادی۔ اس لئے میسور کی راجدھانی قانونی طور پر بھی حیدرعلی کے ماتحت آگئی۔

حیدر علی

۱۷۶۱ء سے ۱۷۸۲ء

سرا کی صوبہ داری حاصل ہونے کے بعد حیدر علی نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنا شروع کیا۔ اور یکے بعد دیگرے تمام پالیگاروں کو مطیع کر لیا گیا۔ ان میں سب سے بڑی فتح حیدر علی کو ۱۷۶۳ء میں بدنور میں ہوئی۔ یہاں انہیں بارہ کروڑ روپیہ کا خزانہ ملا۔ بدنور کے بعد حیدر علی نے ملیبار پر فوج کشی کی۔ پونانی کی جنگ میں نائروں کو سخت شکست ہوئی۔ اور تمام ملیبار پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔

۱۷۶۴ء میں حیدر علی نے چتلدرگ اور شاہنور پر چڑھائی کی۔ چتلدرگ فتح نہ ہو سکا لیکن شاہنور کے نواب نے اطاعت قبول کر لی۔ ان واقعات کے دوسرے سال یعنی ۱۷۶۵ء میں مرہٹوں نے حیدر علی پر فوج کشی کی۔ یہ فوج کشی میسور کی رانیوں کی درخواست پر ہوئی تھی۔ مرہٹوں سے مسلسل دو سال تک جنگ رہی۔ کبھی حیدر علی کو فتح ہوتی تھی تو کبھی مرہٹوں کو۔ مرہٹے بھی ان مسلسل لڑائیوں سے عاجز آ چکے تھے۔ آخر نواب حیدر علی نے سات لاکھ روپیہ نقد اور پچاس لاکھ کے وعدہ پر صلح کر لی اور مرہٹے واپس چلا گئے۔ اس کے بعد ہی یعنی ۱۷۶۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے حیدر علی کی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں والاجاہ محمد علی اور نظام علی خاں نظام الملک دوم انگریزوں کے ساتھ تھے۔

والاجاہ محمد علی اور نظام الملک کو حیدر علی کی فتوحات سے حسد اور خوف پیدا ہو چلا تھا اس لئے حیدر علی کے خلاف حیدرآباد میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں نظام الملک، والاجاہ محمد علی اور ایسٹ انڈیا کمپنی شریک تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے نظام الملک نے بہ حیثیت صوبہ

وارد کن میسور کا تمام علاقہ انگریزوں کو سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج پر لکھ کر دیدیا۔ اور انگریزوں کو والا جاہ محمد علی کا ایجنٹ تسلیم کرتے ہوئے محمد علی کو ارکاٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کر لیا۔ (کتاب سندس انڈ ٹریٹیز)

اس معاہدہ کے بعد نظام الملک، والا جاہ محمد علی اور انگریزوں کی متحدہ فوجیں میسور پر بڑھیں۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک مرہٹہ سردار بھی تھا۔ مسلسل دو سال تک جنگیں ہوتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وقت حیدر علی کے فرزند ٹیپو سلطان نے مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن انگریزوں نے نہایت عیاری سے کام لیکر سلطان کے پاس ایک قاصد کو جعلی خط دیکر بھیجا۔ یہ خط گویا حیدر علی کی جانب سے تھا۔ جس میں تاکید کی گئی تھی کہ مدراس کا محاصرہ اٹھا کر فوراً حیدر علی سے آکر ملے یہ چال کارگر ہو گئی۔ ٹیپو سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور واپس ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد ہی حیدر علی نے پھر مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ اور بزور شمشیر مدراس کا عہد نامہ لکھوایا۔ جس میں حیدر علی نے حیرت انگیز رواداری دکھلائی۔

انگریزوں سے صرف یہ شرط منوالی کہ بوقت ضرورت حیدر علی کو فوجی امداد دینگے اس صلح نامہ کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے تریاک راؤ کے ماتحت میسور پر حملہ کر دیا۔ حیدر علی نے معاہدۂ مدراس کی رو سے انگریزوں سے مدد چاہی۔ لیکن انہوں نے مدد نہیں دی۔ مسلسل چار سال تک یہ جنگ جاری رہی۔ مرہٹوں کا یہ حملہ اس قدر خطرناک تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ حیدر علی کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ موتی تالاب کے میدان جنگ میں حیدر علی کو کامل شکست ہوئی۔ اور وہ اپنی جان بچاکر تن تنہا فرار ہوئے۔ سرنگاپٹم پہونچکر حیدر علی نے از سر نو تیاری کی اور مرہٹوں پر شبخون مارنے لگے۔ جن سے مرہٹی فوج عاجز آگئی۔ آخر ۳۶ لاکھ روپیہ دیکر حیدر علی نے صلح کر لی۔ کہ کسی طرح مرہٹے ملک

سے چلے جائیں۔

مرہٹوں کی واپسی کے بعد حیدر علی نے کورگ اور کرڑپہ فتح کیا۔ اس عرصہ میں یورپ میں فرانس وانگلستان میں جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے ماہی بندر پر جو ملیبار میں فرانسیسیوں کی تجارتی کوٹھی تھی۔ قبضہ کرلینا چاہا۔ اوراس مقصد کیلئے اپنی فوج بھیجی۔ فرانسیسی حیدر علی کی پناہ میں تھے۔ اور بندرگاہ ماہی ملیبار میں واقع تھی۔ جو حیدر علی کے مقبوضات میں سے تھا۔ انگریزوں کی وعدہ خلافی اور چیرہ دستی کو دیکھ کر حیدر علی نے ۱۷۸۰ء میں ایک کثیر فوج سے کرناٹک پر فوج کشی کردی۔ انگریز مورخین کو اعتراف ہے کہ جنوبی ہند نے اس سے بڑھکر طوفانی حملہ اوراس قدر کثیر فوج کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جنگ ابھی جاری ہی تھی کہ نواب حیدر علی کا ارکاٹ کے قریب ۱۷۸۲ء میں انتقال ہوگیا۔

حیدر علی کے انتقال کے بعد ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی۔ مسلسل دو سال کی جنگوں میں انگریزوں کو پے درپے شکستیں ہوئیں۔ اور منگلور کا صلح نامہ مرتب ہوا۔ جس میں انگریزوں نے سلطان کی تمام پیش کردہ شرائط کو منظور کرلیا۔

ابھی اس صلح پر دس بارہ دن بھی نہ گذرے تھے کہ نظام علی خاں اور مرہٹوں نے ایبٹ گیر میں معاہدہ کرتے ہوئے سلطان کی مملکت پر حملہ کردیا۔ سلطان نے بہت چاہا کہ نظام مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ ملجائے۔ سلطان دیکھ چکا تھا کہ مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی کس طرح ایک طرف مرہٹوں اور دوسری طرف انگریزوں کو چیرہ دست بنا رہی ہے اس لئے اس نے تجویز کی کہ حیدرآباد اورمیسور میں ایک زبردست اتحاد قایم ہوجائے اس نے نظام الملک کے آگے تجویز پیش کی کہ نظام کی بیٹیوں سے اپنے بیٹوں کی اوراپنی بیٹیوں سے نظام کے بیٹوں کی شادی ہوجائے۔ لیکن نظام الملک نے اس تجویز کو یہ کہکر

ٹھکرا دیا کہ سلطان کا خاندان ایک نایک کا خاندان ہے۔

اس کے بعد سلطان کو بجز جنگ کے چارہ نہیں تھا۔ چار سال کی مسلسل جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں اور نظام الملک کو شکست ہوی۔ اور سلطان کے ہاتھ بہت سا ملک آیا۔ یعنے اب سلطنت خداداد کی سرحدیں حیدرآباد اور پونا کے قریب قریب پہونچ گئیں۔ ایک طرف تو یہ مذکورۂ بالا جنگ جاری تھی۔ اور دوسری طرف سلطان نے تجارت، صنعت و حرفت اور بحری طاقت پر بھی توجہ کرنی شروع کی۔ اور ملک اس قدر طاقتور اور خوش حال بن گیا کہ سلطنت خداداد اس زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت مانی جاتی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز مدراس میں بیٹھے ہوئے سمجھ رہے تھے کہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے سلطنت خداداد کمزور ہوچکی ہوگی۔ اس لئے مدراس کا گورنر میڈوز نے جس سے میسور کی رانیاں خفیہ طور پر سازش کر رہی تھیں۔ بغیر اعلان جنگ سلطنت خداداد پر فوج کشی کردی دو سال تک یہ جنگ جاری رہی۔ میڈوز شکست کھاکر مدراس واپس ہوگیا۔ یہ دیکھ کر لارڈ کارنوالس گورنر جنرل نے سلطان کے خلاف ایک جتھہ تیار کیا۔ اس جتھے میں نظام الملک اور مرہٹے شامل ہوگئے۔ لیکن پھر بھی خوف تھا کہ سلطان کی طاقت سے یہ متحدہ فوجیں عہدہ برآ نہ ہوسکیں گی اس لئے کارنوالس نے ایک انگریزی افسر کرنل ریڈ کو خاص اسی کام پر مامور کیا کہ سلطنت خداداد کے اندر سازشوں کا جال بچھائے۔ کارنوالس کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی۔ کشن راؤ کی نمک حرامی سے بنگلور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور انہوں نے بڑھکر سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں مہدی خاں ناطہ کی نمک حرامی سے گنجام کے مورچہ پر انگریز قابض ہوگئے۔ بارش کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ اور انگریزی کیمپ میں سامان رسد کی قلت ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر کارنوالس نے محاصرہ اٹھالیا۔ لیکن عین وقت میں جب انگریز

واپس ہو رہے تھے تو مرہٹوں کی فوج ان سے آکر مل گئی۔ ان کے پاس سامان رسد بافراط تھا جس کی وجہ سے انگریزوں نے پھر سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ اور آخر ۱۷۹۲ء میں امراء و وزراء کی غداری کو دیکھتے ہوئے سلطان نے مجبوری صلح کر لی۔ جس کی وجہ سے اس کی آدھی سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔

انگریزوں کے جانے کے بعد سلطان نے از سر نو فوجی تنظیم کی اور ملک میں ایک نئی روح پھونکی۔ بحری بیڑے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ چھ سات سال کے عرصہ میں سلطنت خداداد پھر اس قدر مضبوط ہو گئی کہ دشمنوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔

انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ اگر سلطان کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس ملک میں انکا گذر محال ہے۔ اور دوسری طرف سلطان بھی تلا ہوا تھا۔ کہ ان غیر ملکیوں کو ملک سے نکال باہر کرے۔ اس غرض سے اس نے سلطان ترکی، افغانستان وغیرہ سے خط و کتابت بھی کی۔

یہ زمانہ انگریزی گورنر جنرل ولزلی کا تھا۔ اس نے سلطان کے ارادے کو بھانپ لیا مرہٹے اور نظام الملک پھر اس کے ساتھ مل گئے۔ اور پھر ایک بار سازشوں کا وسیع جال بچھایا گیا اور اس جال میں سلطان کے امراء میر صادق، میر معین الدین، بدرالزماں خاں نائطہ، میر غلام علی لنگڑا، میر قمرالدین اور پورنیا بھی پھنس گئے۔ پورنیا کو میسور میں ہندو راج قایم کرنے کی فکر تھی۔ دوسرے غدار صرف اپنی اپنی تن پروری کے لئے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ معین الدین اور قمرالدین کو گرم کنڈہ کی ریاست حاصل کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔

میر قمرالدین فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے اس قدر غداری سے کام لیا کہ انگریزی فوج نے بغیر کسی مقابلہ کے سرنگا پٹم پہونچکر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی غدار نے شہزادہ فتح حیدر

کو بھی جنگ سے باز رکھا۔ آخر ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو پورنیا اور میر معین الدین کی غداری سے انگریزی فوج قلعہ پر آگئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطان دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اس کو خبر ملی کہ انگریزی فوج قلعہ پر آچکی ہے۔ وہ اسی طرح اٹھا۔ اور طاؤس نامی گھوڑے پر سوار ہو کر انگریزوں کے مقابلہ کیلئے نکلا۔ سلطان اور اس کے باڈی گارڈ نے دوپہر سے لیکر چار بجے تک انگریزوں کو شمالی فصیل پر قبضہ کرنے سے روک رکھا۔

پورنیا کی غداری کی وجہ سے انگریزی فوج جنوبی فصیل پر قابض ہو چکی تھی۔ اس طرح فوج شہر میں داخل ہو کر دوسری جانب سے سلطان پر گولیاں برسانے لگی۔

فصیل قلعہ پر سلطان کی موجودگی کی اطلاع میر صادق نے انگریزوں کو دی تھی۔

جب سلطان نے یہ دیکھا کہ انگریز اندرونی فصیل پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ تو وہ واپس ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ محل میں پہونچکر محل کو بارود سے اڑا دے۔ اسی مقصد سے اس نے محل میں بارود بچھا رکھی تھی۔ اس مقصد میں اس کو کامیابی نہیں ہوی۔ اس لئے کہ غدار میر صادق نے سلطان کی واپسی کا راستہ جو ڈڈی دروازہ سے تھا۔ بند کر دیا تھا۔ ڈڈی دروازے کو بند پاکر سلطان آگے بڑھا اور شہر کے اندرونی بڑے دروازے پر پہونچا۔ یہاں سلطان تین طرف سے انگریزوں میں گھر چکا تھا۔ اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ غلام کے پاس چھاگل موجود تھی۔ لیکن اس نے ایک قطرہ پانی بھی نہیں دیا۔ اسکے عوض اس نے سلطان کو مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردے۔ لیکن غیور سلطان نے پلٹ کر کہا:۔

"گیدڑ کی صدسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے۔"

شب سہ رنگ کے وقت تک سلطان دست بدست جنگ کرتا ہوا شہید ہوا۔

سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے سرنگا پٹم کے باشندوں پر نہایت سخت ظلم و ستم کئے۔ یہاں تک کہ کرنل آرتھر ولزلی نے جو انگریزی فوج کا ایک افسر تھا۔ چند پاجیوں کو پھانسی کی سزا دی۔

سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی سلطنت خداداد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور انگریزوں نے تمام ملک پر قبضہ کرتے ہوئے مدراس کا صوبہ بنایا۔ جس کو آج مدراس پریسیڈنسی کہا جاتا ہے۔ اور یہ پہلا صوبہ ہے۔ جو انگریزوں نے بنایا۔

سلطنتِ خداداد کی تباہی کے اثرات

(الف) ہندوستان پر

انگریزی مورخین کو اعتراف ہے کہ ہندوستان میں حیدر اور ٹیپو سلطان سے بڑھکر انہیں کوئی حریف نہیں ملا۔ حیدر علی کے زمانے میں اگرچہ انگریزوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ بلکہ ان کی ہستی تک ان کے رحم و کرم پر موقوف ہو گئی تھی۔ لیکن حیدر علی میں رواداری بھی حد درجہ تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اکھڑتے ہوئے قدم پھر ملک میں جم گئے۔ لیکن ٹیپو سلطان کا نصب العین یہ رہا کہ

"ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے"۔

سلطان یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ غیر ملکی اس ملک پر حکمرانی کریں اور اس نے اپنی زندگی اسی مقصد کے لئے وقف کر دی۔ ادھر انگریزوں نے بھی اس کی سلطنت کو مٹانے کے لئے اپنا پورا پورا زور لگا دیا۔ اور ملک کی بدقسمتی سے نہ صرف مرہٹے اور نظام الملک انگریزوں کے ساتھ مل گئے۔ بلکہ سلطان کے غدار امرا و وزراء بھی سازش میں شریک ہو گئے۔

یہ ٹیپو سلطان ہی کا خوف تھا کہ انگریز ملک کے کسی حصّہ پر بھی قابض ہونے سے ڈرتے تھے۔ یوں تو والا جاہ محمد علی کے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ جنوبی ہند کے اکثر اضلاع میں حکمرانی کر رہے تھے۔ جس کو دوگانہ سلطنت یا ڈوبل (Duel) گورنمنٹ کہا جاتا ہے۔ لیکن انہیں کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ حکومت صرف اپنے ہی نام سے کریں۔ لیکن ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ خوف بالکل جاتا رہا۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ انہوں نے سلطان کی شہادت کے دوسرے ہی سال ارکاٹ کی برائے نام حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ حیدرآباد کو جو اب تک آزاد تھا۔ باجگذار بنا لیا۔ اور چھ سال کے اندر اندر تمام ہندوستان پر سوائے پنجاب اور سندھ کے قابض ہو گئے۔ اور شہنشاہِ مغلیہ ان کی حفاظت میں بلکہ ماتحتی میں لے لیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان کی شہادت کے بعد جب جنرل ہارس سلطان کی لاش پر آیا تو وہ فرطِ خوشی سے چلا اٹھا:۔

"آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ صرف چھ سال کے اندر اندر اس جملہ کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا۔

ٹیپو سلطان کی شخصیت کس قدر عظیم المرتبت تھی۔ اور سلطنت خداداد ہندوستان میں کس پایہ کی سلطنت تھی۔ اس کا اندازہ انگریزوں نے کر لیا تھا۔

ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک سلطنت اور اس کا جلیل القدر فرمانروا ٹیپو سلطان تھا جو انگریزوں کے راستے میں حائل تھا۔ اس کی شہادت پر خود لارڈ ولزلی نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:۔

"میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کرونگا کہ ڈائرکٹران کمپنی ہندوستان پر رحم کرنے کی درخواست کریں۔" (تاریخ باسو)

ولزلی کو سر جان اینس ٹھروٹ چیف جسٹس آف بنگال لکھتا ہے :۔

"ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے نمایاں، سب سے شاندار اور سب سے بڑا کارنامہ اس طرح آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں"

ڈاکٹر جان آر ہنڈرسن سی۔ آئی۔ ای لکھتا ہے :۔

"ٹیپو ایک عظیم المرتبت شخصیت تھا۔ ایسی شخصیت کہ ہندوستان پھر اس کی نظیر نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کے ارادے بہت بلند۔ اس کی قابلیت حیرت انگیز۔ اس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ وہ ایک بہادر انسان تھا۔ اور اس نے جوانمردی کی موت حاصل کی"

(ب) مسلمانوں پر

۴ رمئی ۱۷۹۹ء کی شام تک کہا جاتا تھا کہ مسلمان ہندوستان پر حکمران ہیں۔ اور ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ لیکن ۵ رمئی کے آفتاب نے دیکھا کہ وہ قوم جو کل شام تک آزاد تھی۔ آج غلام بنی ہوئی ہے۔ یہاں ماتم اس کا نہیں کہ ایک حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہندوستان میں یوں تو مسلمانوں کے ہاتھ سے بہت سی حکومتیں چھن گئیں۔ خاندانوں کا عزل ونصب ہوتا رہا لیکن مسلمان ان سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ایک خاندان کے بعد کوئی دوسرا خاندان برسر حکومت آگیا۔ دکن کی بہمنی سلطنت مٹ گئی۔ لیکن اس کا نعم البدل اور پانچ اسلامی سلطنتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور جب یہ سلطنتیں مٹ گئیں تو مغلیہ سلطنت نے ان کی جگہ لے لی۔ لیکن سلطنت خداداد کے مٹ جانے پر مسلمانوں کا کوئی ملجا و ماوی نہیں رہا۔ مسلمانوں کی جو دھاک ملک میں بیٹھی ہوئی تھی پوری کی پوری ختم ہوگئی۔

سلطنت خداداد کے خاتمہ کا اثر مسلمانوں کے علم، زبان، کلچر اور اقتصادی حالت پر نہایت بُرا پڑا۔ یوں تو جب تک سلطنت باقی تھی ایک ایک شہر علم کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ لیکن خصوصی طور پر سرنگاپٹم، سرا، حیدرنگر (بدنور) اور ارکاٹ نہ صرف علم وفضل کا مرکز تھے بلکہ ان شہروں سے ان کا کلچر وابستہ تھا۔ ان شہروں سے کمتر درجہ پر کولار، بڑا بالاپور، کڑپہ کرنول اور گرم کنڈہ تھے۔

سرنگاپٹم کی آبادی چار اور پانچ لاکھ کے درمیان تھی۔ سرا کی اسلامی آبادی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس ایک شہر میں نوّے[9] مساجد آباد تھیں۔ یہ شہر بیجاپور کے وائسرائے کا اور بعد میں مغلیہ گورنر کا صدر مقام رہا تھا۔ حیدرنگر (بدنور) کو سلطنت خداداد کے وائسرائے کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور یہاں نوے ہزار مکانات تھے۔ ارکاٹ نوابان ارکاٹ کا پایۂ تخت تھا۔ کڑپہ اور کرنول میں مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی تھی۔ کولار میں اسلامی علوم کا ایک کالج قائم تھا۔ بڑا بالاپور، بیجاپور کے زمانے ہی سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔

ان شہروں کی اسلامی آبادی کو منتشر کردیا گیا۔ اور یک لخت دو چار سال کے بعد ہی یہ تمام شہر ویران ہوگئے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج سرنگاپٹم میں چند سو سے زیادہ اسلامی آبادی نہیں ہے۔ سرا میں مسلمانوں کے صرف ۰۰ ، مکان باقی رہگئے ہیں۔ جو اپنی زندگی نہایت افلاس کی حالت میں بسر کررہے ہیں۔ سوائے دو مسجدوں کے جن میں ایک بیجاپور کے عہد کی اور دوسری بادشاہی یعنے عالمگیر کے عہد کی بنی ہوی ہے۔ باقی ۸۸ مساجد ویران اور مسمار ہوگئی ہیں۔ حیدرنگر (بدنور) ایک بالکل معمولی گاؤں بنا ہوا ہے۔ ارکاٹ بالکل تباہ ہوگیا۔ ان شہروں سے مسلمانوں کا کلچر وابستہ تھا۔ ان کی تباہی سے مسلمانوں کے علم و کلچر پر

ہندوستان - سلطان ٹیپو کی زندگی میں
(میر جعفر کی غداری سے صرف ملک بنگالہ پر
انگریز قابض ہوگئے تھے۔)
نیپال
دہلی
سلطنت اودھ
بنگال
گوالیار
راجپوتانہ
ہندوستان
آزاد
سالسیٹ
بمبئی
مملکت حیدرآباد
شمالی سرکار
خلیج بنگالہ
مدراس
سیلون
بحر ہند
ماخوذ از تاریخ ہند از جے۔سی۔آلن
انگریزی مقبوضات
سلطنت خداداد
آزاد ہندوستان

ہندوستان ۱۸۰۵ء میں

یعنے ٹیپو سلطان کی شہادت کے چھ سال بعد

(از تاریخ جے۔ سی آلن)

اس نقشہ میں جس علاقہ پر خالص انگریزی حکومت تھی اس کو [x x x] اس طرح دکھایا گیا ہے

اور جو صوبے ۱۸۰۶ء میں آزاد تھے۔ ان کے ناموں کے ساتھ آزاد لکھا گیا ہے۔

پر تباہی آگئی۔

زبان سلطنتِ خداداد کے خاتمہ کے ایک سال بعد علاقہ میسور سے فارسی زبان کو جو دفتری زبان تھی، نکال کر دفاتر میں کنڑی اور انگریزی کو رواج دیا گیا۔ مدراس میں ٹمل اور انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔

اقتصادی حالت جب تک اپنی حکومت تھی مسلمانوں کا ذریعہ معاش فوجی ملازمت تھا۔ سلطنت کی تباہی نے مسلمانوں کو بیکاری کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا۔ اور ہزارہا خاندان جو آسودہ اور خوشحال تھے۔ افلاس میں گھر گئے۔ ان کی محبوب سلطنت کی تباہی سے مسلمان رنج اور غم وغصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان سیکھنا پسند نہیں کیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ملازمت وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ڈاکٹر بچانن جو سلطنتِ خداداد کی تباہی کے ایک سال بعد اس ملک میں آیا تھا۔ اپنی اقتصادی رپورٹ میں لکھتا ہے:۔

"حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے بنگلور میں مسلمان بالکل تباہ حالت میں نظر آئے۔ اس لئے کہ ان کی فوجی ملازمتیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ اور یہ نئی حکومت کی فوجی ہو یا سول ملازمت کرنا نہیں چاہتے۔ بعض مسلمانوں نے جن کے پاس کچھ روپیہ ہے تجارت شروع کر دی ہے۔ اور باقی زراعت کر رہے ہیں۔ (ماڈرن میسور صفحہ ۲۸۱)

ہر جگہ مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔

مسلمانوں کی انگریزی زبان سے نفرت اور انگریزی زبان سے بیزاری کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہندوؤں نے تمام ملازمتوں پر قبضہ کر لیا۔ اور مسلمان کہیں کے نہیں رہے۔ انگریزی تو وہ پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے علم وفضل کے مرکزوں کی تباہی سے اپنے خاص

علوم سے بھی یہ بے بہرہ ہو گئے۔

اب رہی تجارت یا زراعت ان کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اس لئے ان کو ہندو بنیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ سود در سود کے چکر سے مسلمانوں کے پاس جو کچھ روپیہ یا زمین تھی وہ بھی بنیوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی۔ اور مسلمان بالکل ہی تباہ حالت کو پہونچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان نے آخری وقت اپنے غدار امرا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا۔ جب تم اور تمہاری آئندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک ایک گٹھی کو ترسیںگی"

سلطان کی یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اس کا ثبوت دے رہی ہے۔

(نوٹ:۔ تاریخ میسور کا یہ مضمون جس میں راجگان میسور کے حالات ہیں۔ کرنل ولکس اور رئیس کی تاریخوں سے لیا گیا ہے۔ اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات تاریخ سلطنت خدا داد سے لئے گئے ہیں۔ جس میں ہر واقعہ کے متعلق متعدد مستند حوالے دئے گئے ہیں

جنوبی ہند کی دوسری ریاستیں

ٹراونکور

ریاست میسور کے علاوہ جو ریاستیں جنوبی ہند میں باقی ہیں۔ ان میں ٹراونکور کی ریاست جزیرہ نمائے جنوبی ہند کے جنوب مغربی انتہائی گوشہ میں ہے۔ اس ریاست کا رقبہ ۷۶۲۱ مربع میل اور آبادی تقریباً باون لاکھ ہے۔ جس میں ۳۲ لاکھ ہندو، ۱۶ لاکھ عیسائی اور چار لاکھ مسلمان ہیں۔ ٹراونکور میں عیسائیوں کی اس قدر کثیر آبادی کا سبب وہ سیرین عیسائی ہیں جو اس ملک میں عیسائی مذہب کی ابتداء ہی میں آکر آباد ہو چکے تھے۔

ٹراونکور کی تاریخ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی ہے۔ یہاں ایک بہت ہی قدیم خاندان حکمران ہے۔ ملک کی طبعی حالت اسکی بہت بڑی ذمہ وار ہے۔ مغربی گھاٹ اس کے مشرقی حدود کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اس لئے حملہ آوروں نے اس ملک پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ اور ٹراونکور و اسلئے بھی جنوبی ہند پر جو سلطنت بھی حکمران ہوی۔ اس کو برابر خراج دیتے رہے۔ ۱۷۹۵ء میں یہ ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگئی۔

کوچین

کوچین ریاست ٹراونکور کی شمال میں ہے۔ یہاں بھی ایک قدیم خاندان حکمران ہے کوچین کا رقبہ ۱۴۱۷ مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ جس میں مسلمان ۷ فیصدی ہیں۔ یہاں یہودیوں کی بھی ایک خاصی آبادی ہے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۱۴۵۱ بتلائی گئی ہے۔

یہ ان یہودیوں کی اولاد سے ہیں۔ جو عیسائی مذہب کی ابتدا میں ملک شام سے آکر یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ایک معبد بھی ہے۔ جو ۱۵۶۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔

۱۷۷۶ء میں نواب حیدر علی نے کوچین پر قبضہ کرلیا تھا۔ ۱۷۹۱ء تک یہ ریاست سلطنت خداداد کی باجگذار رہی۔ اس کے بعد ۱۷۹۲ء میں انگریزوں کے ماتحت آگئی۔

پدوکوٹہ

ساحل کورومنڈل کے ضلع رامناڈ میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس کا رقبہ ۱۱۷۹ مربع میل اور آبادی چار لاکھ ہے۔ یہاں بھی ایک قدیم خاندان حکمران ہے۔

بنگن پلی

جنوبی ہند میں یہ ایک اسلامی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ ۲۷۵ مربع میل اور آبادی تقریباً چالیس ہزار ہے۔ وجیانگر کے زوال کے بعد ضلع کرنول پر جب بیجاپور والوں نے قبضہ کرلیا۔ تو بنگن پلی کا علاقہ سدھی سنبل کو بطور جاگیر دیا گیا۔ بیجاپور کے بعد جب مغلوں کا تسلط ہوا تو یہاں محمد بیگ خان کو قلعدار بنایا گیا۔ محمد بیگ خان ۱۷۲۵ء تک قلعدار رہا۔ اس کے بعد جب ا و تین قلعدار ہوئے۔ ان میں تیسرے قلعدار فضل علی خاں نے ریاست اپنی بہن کے داماد سید محمد خاں کو دیدی۔ موجودہ حکومت اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔

نواب حیدر علی نے جب کرنول فتح کیا۔ تو سید محمد خان کے لڑکے سید حسن نے حیدر علی کی اطاعت کرلی۔ سید حسن کا انتقال ۱۷۸۳ء میں ہوا۔

میسور کی تیسری جنگ میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی، نظام حیدرآباد اور مرہٹہ سلطنت

خداداد پر حملہ آور ہوئے تو بنگن پلی کے نواب ان سے مل گئے۔ زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد جب ملک کے حصے بخرے ہوئے تو یہ ریاست نظام حیدرآباد کے ماتحت ہوگئی۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد جب کڑپہ، کرنول، بلاری وانت پور کے ضلعے ایسٹ انڈیا کمپنی نے حیدرآباد سے لے لئے تو بنگن پلی کی ریاست بھی انگریزوں کے ماتحت ہوگئی۔

سنڈور

ضلع بلاری میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس کا رقبہ ۱۶۰ مربع میل ہے۔ یہاں کا خاندان مراری راؤ حاکم گتی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور گھوڑ پڑے کہلاتا ہے۔ مراری راؤ کی شخصیت تاریخ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ارکاٹ کے محاصرہ میں جس میں کلایو محصور ہوگیا تھا۔ اسی مراری راؤ نے چنداصاحب کا ساتھ یکایک چھوڑ دیا تھا۔ جس سے چنداصاحب نے محاصرہ اٹھا لیا اس کے بعد میسور کی پہلی جنگ میں یہ والا جاہ محمد علی اور انگریزوں و نظام کا ساتھ دیا تھا۔ بعد میں نواب حیدر علی نے گتی پر قبضہ کرلیا اور مراری راؤ قید ہوگیا۔ لیکن سندور کا علاقہ اس کے رشتہ داروں کے قبضہ ہی میں رہا۔ اور یہ ہمیشہ مرہٹوں اور نظام کا ساتھ دیتے رہے سلطنت خداداد کے زوال کے بعد یہ ریاست انگریزوں کے ماتحت آگئی۔

شانور

بنگن پلی اور سندور جیسی ایک اور چھوٹی سی ریاست شانور ہے۔ جو آج کل بمبئی علاقہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس ریاست کے حکمران بھی ہمیشہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں کو مدد دیتے رہے ہیں۔

زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد اس ریاست کو مرہٹوں کے ماتحت دینے کی تجویز ہوی تھی۔ لیکن بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کو اپنی ماتحتی میں لے لی۔

یوروپین اقوام اور جنوبی ہندوستان

اس تاریخ کے آخری ابواب میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی کش مکش اور انگریزوں کی کامیابی کا کچھ بیان آگیا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس ملک میں صرف یہی دو قومیں یوروپ سے آئیں۔ ان سے پہلے پرتگال والوں کا بھی ذکر آچکا ہے۔ اس لئے اب مجمل طور پر ان تمام قوموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس ملک میں یوروپ سے آئی تھیں۔

ہندوستان اپنی دولت سونا، چاندی اور جواہرات کے لئے زمانۂ قدیم سے اس قدر مشہور تھا کہ دنیا کے کسی اور ملک کو اس قدر شہرت حاصل نہیں تھی۔ یوروپ جب اپنے زمانۂ جہالت یا تاریکی کو ختم کرکے ترقی کے میدان میں آیا تو اس کو خواہش پیدا ہوی کہ ہندوستان کا ایک نزدیک ترین بحری راستہ دریافت کیا جائے۔ اس سے پہلے یوروپ سے ہندوستان کی تجارت بری راستہ سے ہو رہی تھی۔ اور یہ تجارت ایران، عرب و شام کے سوداگروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے خوب نفع اٹھاتے تھے۔ اب یوروپ والوں نے چاہا کہ اس تجارت پر قبضہ جماکر آپ خود نفع اٹھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لئے مہمیں بھیجنی شروع کیں۔

ان مہموں سے یوروپین اقوام کی غرض ملک گیری نہیں تھی۔ صرف اپنی تجارت کو فروغ

دیتا تھا۔ اس لئے کہ ہندوستان کی سوغات ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ یوروپ اس زمانہ میں اس قدر متمول نہیں تھا۔ جس قدر کہ آج ہے۔ بہرطور جن یوروپین اقوام نے ہندوستان سے تجارتی روابط کے لئے جدوجہد کی۔ ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پرتگالی

جب یوروپین قوموں میں تجارت کا یہ خیال پیدا ہوا تو سب سے پہلے اسپین والوں (Spaniards) نے حرکت کی۔ لیکن کولمبس (Columbus) بجائے ہندوستان کے امریکہ (America) پہونچ گیا۔ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کا سہرا پرتگال کے واسکوڈی گاما (Vasco-de-Gama) کے سر ہے۔ وہ آفریقہ کا جنوب ہوتا ہوا ہندوستان کے ساحل ملیبار پر ۲۲ رمئے ۱۴۹۸ء کو پہونچا۔ سامری نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کو یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے یہ آج کے مہمان کل اس کی حکومت کو تہ و بالا کر دیں گے۔

بہرطور ۱۵۰۰ء میں پرتگال والوں کی پہلی تجارتی کوٹھی کلیکٹ (   ) میں قایم ہوئی۔ ۱۵۱۰ء میں انہوں نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۱۰ء میں کلیکٹ کو لوٹ کر تباہ کرتے ہوئے سامری کا محل بھی جلا دیا۔ ایک صدی کے اندر اندر ان کی کوٹھیاں کوڑیال بندر (منگلور) کوچین، سیلون، آرمز، ڈیو، گوا، اور ناگ پٹن (ناگور) ضلع جنوبی ارکاٹ میں قایم ہو گئیں۔

پرتگال والوں کے آنے سے پہلے بندوق اور آتشیں اسلحہ سے ہندوستان ناواقف تھا آتشیں اسلحہ کی بدولت ہی وہ یہاں کے باشندوں پر فتحیاب ہوئے۔ اور ان بندرگاہوں پر جن پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ طرح طرح کے ظلم کئے انہوں نے ہندوستان کی تجارت سے اسقدر

فائدہ اٹھایا کہ اس زمانے میں پرتگال یورپ کا سب سے متمول ملک بن گیا۔ پرتگال والے ہندوستان میں مقامی حکمرانوں کو بھی مدد دینے لگے۔ بیک وقت ان کے سپاہی دو حریف حکمرانوں کی فوج میں نظر آتے تھے۔ اگلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ وجیانگر والوں کی ہندو فوج میں بھی پرتگالی نظر آتے تھے۔ اور بیجاپور کی اسلامی فوج میں بھی۔ وجیانگر کے زوال سے انکی تجارت پر بھی زوال آیا۔ لیکن اس کا ایک اور سبب بھی ہے۔ یعنے ڈچ قوم ان کی رقیب بن گئی تھی۔ اس کے اور اسباب بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ملکی لوگوں پر انہوں نے مذہب کے نام پر حد درجہ ظلم کرنا شروع کر دیا تھا۔

پرتگال والوں نے گوا اور دوسرے ساحلی مقامات پر مسلمانوں اور ہندوؤں پر جو ظلم وستم کیا اس کی ادنیٰ مثال سیاح فریزر کے بیان سے ملتی ہے۔ جو ۱۶۷۵ء میں گوا گیا ہوا تھا۔

سیاح فریزر لکھتا ہے :۔

"میں صبح ہی صبح اس مقام پر پہونچا جو پرتگالی پادریوں کا دارالقضا کہلاتا ہے اگر اس دارالقضا کو مقتل کہا جائے تو بالکل مناسب ہوگا۔ بازار کے بیچ میں ایک بہت بھاری اور بڑا انجن سولی کی طرح کھڑا کیا گیا ہے۔ جس کر ایک چرخ لگا ہوا تھا۔ انجن پر پہونچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن لوگوں کو سزا دینی ہوتی تھی۔ اس کو ایک شہتیر پر چڑھا کر انجن کے ذریعہ اوپر کھینچ لیتے تھے۔ اور پھر وہاں سے اس کو گرا دیتے تھے جس کے صدمے سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ پادری جس کسی کو آگ میں جلانے کا حکم دیتے تھے۔ انہیں ایک قسم کا لباس پہنا کر جلادوں کے حوالے کیا جاتا تھا۔ جو انہیں لے جاکر

آگ میں زندہ ڈال دیتے تھے۔ بازار میں سوائے سور کے اور کوئی گوشت فروخت

کرنا ممنوع تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس ظلم کو سہ رہے تھے۔"

(کتاب تحفۃ المجاہدین میں پرتگالیوں کے ظلم وستم کی پوری تاریخ دی گئی ہے)

ڈچ

پرتگال والوں کے تمول اور کامیابی کو ہالینڈ والے (Hollanders) رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے جہازات تیار کیئے۔ پرتگال والوں سے بحری لڑائیاں لڑیں۔ ان کے مقبوضات اور کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ پرتگال والوں کے قبضہ میں صرف گوا، دیو اور دمن رہ گئے۔ جنوبی ہند میں ڈچ والوں نے پلیکٹ اور سدراس میں جو مدراس کے قریب ہی ہیں۔ اپنی کوٹھیاں قایم کیں۔ شمال میں بنگال میں ان کی تجارت چنسورا میں وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ چنسورا میں انہوں نے ۱۶۷۵ء میں کوٹھی قایم کی تھی آگرہ میں بھی ایک مختصر کوٹھی تھی۔ چند سال کے بعد یہ قوم ملک کی سیاست میں دخل دینے لگی۔ اس وقت انگریز بنگالہ میں قدم جمانے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ انگریزوں کو بنگالہ سے بے دخل کر دیں۔ تاریخ ہند کا مشہور غدار میر جعفر اس وقت بنگالہ میں حاکم تھا۔ گو اس نے اپنے آقا سراج الدولہ سے غداری کر کے انگریزوں کے قدم ملک میں جما دیئے تھے۔ اور نواب بن گیا تھا۔ لیکن اب اس کو انگریزوں کی موجودگی گران گذرنے لگی۔ اس نے ڈچ سے سازش شروع کی۔ ڈچ نے بٹاویا سے ایک بحری بیڑا دریائے ہگلی میں بھیجا۔ کلایو نے جو اس وقت بنگالہ میں تھا۔ بھانپ لیا کہ ڈچ والوں کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے کرنل نورڈ کو حکم دیا کہ ڈچ کے بیڑہ پر حملہ کرے۔ ڈچ کا بیڑا تباہ ہو گیا۔ اسکے ساتھ ہی انکی تجارت پر بھی زوال

آگیا۔ صرف چنسورا بنگال میں ان کی تجارت باقی تھی۔ جنوبی ہند کے بندرگاہوں پلیکٹ اور مدراس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۰۵ء میں انگریزوں نے چنسورا کے عوض ملک سماٹرا ان کو دے کر چنسورا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح ڈچ قوم کا تعلق ہندوستان سے منقطع ہو گیا

انگریز اور فرانسیسی

ڈچ قوم کے بعد انگریز اور فرانسیسی قومیں ہندوستان میں آئیں۔

انگریزوں نے پہلے تو ہندوستان کو آنے کیلئے ایک شمال مشرقی راستہ کی تلاش کی لیکن اس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۷۹ء میں ان کے ایک بحری افسر سر فرانس ڈریک نے (Francis Drake) نے ایک پرتگالی جہاز پر چھاپہ مارا۔ مال غنیمت میں اس کو ایک نقشہ ملا۔ جس میں ہندوستان کا بحری راستہ دکھایا گیا تھا۔ اس نقشہ کی مدد سے ۱۵۹۲ء میں سر جان لنکاسٹر (John Lancaster) راس امید (Cape of Good Hope) کے راستہ سے جاوا پہونچا۔ ۱۶۰۸ء میں جب انگریز افسر نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا وہ کپتان ہاکنس (Hawkins) تھا۔ اس کا جہاز ۱۶۰۸ء میں بندرگاہ سورت میں پہونچا۔ وہ جیمس اول شاہ انگلستان کی جانب سے شہنشاہ جہانگیر کے نام خط لایا تھا۔

پرتگال والوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ اس لئے ہاکنس دہلی سے سورت کو جلد واپس آگیا۔ اس کے چار سال بعد ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے ایک بحری بیڑہ پرتگال والوں کے خلاف بھیجا۔ اور پرتگال والوں کو شکست دی۔ ۱۶۱۳ء میں شہنشاہ جہانگیر نے انگریزی کمپنی کو بندرگاہ سورت میں تجارت کرنے کیلئے اجازت دیدی۔ یہ اجازت سر تھامس رو (Thomas Roe) دی گئی تھی۔ جو انگریزی سفیر بن کر آیا تھا۔ سورت کے علاوہ ملیبار کی بندرگاہوں میں بھی انہوں

نے کوٹھیاں قایم کیں بسنہ ۱۶۲۵ء میں مدراس سے ۳۰۰ میل جنوب میں ایک کوٹھی ارمیگاؤں میں قایم ہوی بسنہ ۱۶۴۰ء میں کلکتہ میں ایک کوٹھی قایم ہوی۔ یہاں کی تجارت اس وقت تک صرف پرتگال والوں کے ہاتھ میں تھی۔ پرتگالی غلاموں کی تجارت کے علاوہ بنگال کے نواب سے بھی شاہجہاں کے خلاف سازباز کر رہے تھے۔ یہ خبر جب دہلی پہونچی تو شہنشاہ شاہجہاں نے فوج بھیجکر پرتگال والوں کو بنگالہ سے بے دخل کیا۔ ان کی کوٹھیاں تباہ کیں اور جہازات جلا دئے گئے۔ پرتگال والوں کی تجارت پر زوال آتے ہی انگریزوں نے درخواست کی۔ چنانچہ ان کو ہگلی کے قریب تجارت کرنے کی اجازت دی گئی۔ انہیں حکم تھا کہ دریائے ہگلی میں ان کے جہازات نہ آئیں۔ ان کو ایک بھاری محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔

اس کے بعد ہی انہوں نے شاہزادہ شجاع سے جو شاہجہاں کا دوسرا لڑکا تھا ہگلی میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی۔

عام طور پر تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیمار تھی۔ اس کے علاج کے لئے شہنشاہ نے ایک انگریز طبیب کو بندرگاہ سورت سے طلب کیا تھا۔ اس کے علاج سے شہزادی اچھی ہوگئی۔ اس کے صلہ میں شاہجہاں نے انگریزوں کو بنگالہ میں تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔ لیکن اکثر مورخین اس روایت کو غلط کہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ شجاع بنگالہ کا گورنر تھا۔ اس کی ایک حرم بیمار تھی۔ اس وقت بفٹن نے جو انگریزی جہاز میں ڈاکٹر تھا۔ اس حرم کا علاج کیا۔ اس صلہ میں شجاع نے انگریزوں کو بنگالہ میں تجارت کی اجازت دیدی۔

اسی زمانہ میں انگریزوں نے جنوبی ہند میں مدراس میں اپنی تجارتی کوٹھی قایم کی۔ اس کی سند ان کو سنہ ۱۶۳۹ء میں مدراس علاقہ کے ہندو حاکم نے جو وجیانگر کے راجہ کی جانب سے یہاں حکمران تھا۔ ملی۔ یہاں یہ کمپنی سنہ ۱۷۴۳ء تک صرف تجارت کرنے تک محدود تھی۔ اس سال انوارالدین نے

ہیں فرانس والوں کے خلاف مدد دی۔

اس کے بعد ہی انگریز کرناٹک اور ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ جس کا حد حال اس تاریخ میں آ چکا ہے۔ اور نتیجہ معلوم ہے۔

فرانسیسی

انگریزوں کی طرح فرانسیسی بھی ہندوستان میں ١٦٦٤ء میں آئے۔ ١٦٦٨ء میں بندرگاہ سورت میں ان کی پہلی کوٹھی قایم ہوئی۔ ١٦٦٩ء میں مچھلی بندر میں انگریزی کوٹھی کے قریب ہی کوٹھی قایم کی۔ ١٦٧٤ء میں پانڈیچری میں ان کی ایک اور کوٹھی قایم ہوئی۔ ١٦٩٣ء میں ڈچ نے اس پر قبضہ کر دیا۔ ١٦٩٧ء میں پھر فرانس والے پانڈیچری پر قابض ہو گئے۔ ١٧٢٥ء میں ماہی بندرگاہ میں ایک کوٹھی قایم ہوئی۔ اور ١٧٣٩ء میں تنجاور ضلع میں کاریکال میں بھی ان کی ایک اور کوٹھی قایم ہوئی۔

جس طرح ڈچ اور فرانسیسی لڑ رہے تھے۔ اسی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں میں بھی تجارتی رقابت تھی۔ اور ان میں بھی جنگیں ہوتی تھیں۔ یوروپ میں جب کبھی جنگ چھڑتی تو اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ ایک ایسی ہی جنگ ١٧٤٣ء میں ارکاٹ کے نواب انوارالدین نے ان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ یہاں جس طرح انگریزی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح فرانسیسیوں کا بھی ہوتا ہے۔ فرانسیسیوں کو ملک گیری کا بالکل خیال نہ تھا۔ یہ اپنی تجارت پر قانع تھے۔ لیکن انوارالدین کی کارروائی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کے اور انگریزوں کے خلاف کارروائی کریں۔ فرانسیسی طاقت اسی وقت تک کامیاب رہی۔ جب تک ڈوپلے گورنر رہا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ فرانسیسی اثر تمام ملک پر مسلط ہو جائیگا۔ ڈوپلے کے واپس جاتے ہی فرانس

والوں پر زوال آگیا۔ گو ایک عرصہ تک یہ انگریزوں کے خلاف ملکی حکمرانوں سے ساز باز کرتے
رہے۔ لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ جنوبی ہند میں ان کے مقبوضات اب صرف پانڈیچری، کاریکال
اور بندرگاہ ماہی ہی ہیں۔

جرمن اور فلمش

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جرمن قوم نے بھی ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم
کئے تھے۔ لیکن یہ بہت دیر بعد آئی تھی ۱۷۵۱ء میں ان کے تجارتی جہازات دریائے ہگلی میں کلکتہ
کے قریب آئے۔ ان کی تجارتی کوٹھی چندرنگر کے قریب بنی۔ ڈچ، انگریز اور فرانسیسیوں نے
اس کی مخالفت شروع کردی۔ نو سال کے بعد یہ کمپنی اپنی تجارت بند کرکے جرمن واپس چلی گئی۔
اسی طرح فلمش قوم بھی یہاں کامیاب نہ ہوسکی۔ گو اس نے اپنی کوٹھی ۱۷۲۳ء میں بنگالہ ہی میں قائم
کی تھی۔

انگریز کیوں کامیاب ہوئے

یہ ایک حقیقت ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے پاس کوئی بحری طاقت نہیں تھی۔ عالمگیر کے عہد
میں پرتگال والوں نے اپنی بحری طاقت کے ذریعہ ہندوستانی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا
اور حجاج کے جہازات کو بھی لوٹنا شروع کردیا تھا۔ انگریزوں نے یہ حالات دیکھے ہوئے تھے اور
انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ بحری طاقت کے فقدان نے مغلیہ سلطنت کو کس طرح بے بس رکھا ہے۔
پرتگال والوں کی تمام تر توجہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر تھی۔ انگریز اپنا اثر جمانے کیلئے کامیابی سے
انکا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مشرقی ساحل کا رخ کیا۔ بنگالہ اور مدراس میں ان

کی کوٹھیاں قایم ہوئیں۔ میر جعفر کی غداری سے بنگالہ کا ملک ان کے ہاتھ آگیا۔ فرانس والوں نے بھی مشرقی ساحل کو ہی اپنا آماجگاہ بنایا۔ لیکن ان کی بحری طاقت انگریزوں کے برابر کبھی نہیں ہوی۔ یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرانس والوں کو ملک گیری کی ہوس نہیں تھی ۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ بلکہ اپنے اولوالعزم گورنر کو بھی واپس بلا کر اپنے اقتدار کا خاتمہ کر لیا۔ اب صرف انگریز رہ گئے جو اپنی بحری طاقت سے پورا فائدہ اٹھا کر ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دیکر ملک گیری شروع کر چکے تھے۔ ارکاٹ کے خاندان نے انہیں ملک گیری سے آشنا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں صرف دو سلطنتیں تھیں جو کامیابی سے ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ایک میسور کی سلطنت خداداد تھی۔ اور دوسری مرہٹوں کی جن کے پاس کچھ بحری طاقت بھی تھی۔ انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ سلطنت خداداد کے حکمران جب بحری طاقت پر توجہ کرتے ہوئے فرانس اور ترکی سے دوستانہ بڑھانے لگے تو انگریزوں کو خوف پیدا ہو چلا کہ اب ان کی تجارت اور ملک گیری کا خاتمہ ہو جائیگا۔ انہوں نے آخر اس سلطنت کو بھی سازشوں کے ذریعہ ختم کر دیا۔ مرہٹے بھی اسی طرح سازشوں کا شکار ہو کر ختم ہو گئے۔

اس لئے ہندوستان میں انگریزی راج قایم ہونے کے بڑے اور اصلی اسباب دو ہیں۔

(۱) انگریزوں کی بحری طاقت ۔

(۲) خود ہندوستانیوں کا آپس کا نفاق۔ جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں نے اور بڑھا دیا۔ جس کے ثبوت میں ملک کی تاریخیں بھری پڑی ہیں ۔

مدورا ۔ ملک کافور کی مسجد

تاریخ مدورا

جنوبی ہند کی تاریخ اسلام کا ایک گمشدہ ورق

ساحل کورومنڈل پر ضلع مدورا کو مسلمانوں سے اوائل اسلام ہی سے تعلق رہا ہے۔ اس کا بندرگاہ کائل پٹن عرب سوداگروں کی منڈی تھی۔ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جنوبی ہند بلکہ کل ہندوستان میں ساحل کورومنڈل اور ملیبار ہی دو ایسے خطے تھے۔ جو اسلام سے اسی وقت واقف ہوگئے تھے۔ جب اس کا ظہور عرب میں ہوا۔ اس کے علاوہ مدورا کی سیاسی تاریخ کو بھی مسلمانوں سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی حکومت کی بنیاد اسی ضلع اور اسی شہر میں پڑی تھی۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک بھولا ہوا سبق یا ایک گمشدہ ورق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سیاح ابن بطوطہ اس حکومت کا اپنے سفرنامہ میں ذکر نہ کرتا تو مدورا کی ایک اسلامی تاریخ صفحہ علم سے بالکل محو ہو جاتی۔

"تاریخ جنوبی ہند" کے اگلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ مسلمانوں نے ۱۳۱۰ء میں جنوبی ہند پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ان کے پیش نظر مدورا کی راجدھانی تھی۔ جہاں دو بھائی تخت کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی سندر پانڈے نے سلطان علاؤالدین سے مدد مانگی تھی اور علاؤالدین نے ملک کافور کو اس کی تائید پر بھیج دیا تھا۔ اپنا ملک جس قدر

واقعات روشنی میں آچکے ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کافور مدورا شہر کو فتح کرکے سندر پانڈے کو تخت نشین کرکے واپس ہوا۔ کافور کے واپس جانے کے بعد سندر پانڈے کے خلاف پھر ملک میں بغاوت ہوی۔ اور ٹراونکور کے راجہ راوی ورما کل سیکرا نے مدورا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سندر پانڈے اور مسلمانوں کا نام تاریخ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر سی اسلامی فوج کا یہاں خاتمہ ہوگیا۔ جو کافور سندر پانڈے کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ یہ خبر جب دہلی میں پہونچی تو مبارک شاہ خلجی نے ۱۳۱۸ء میں خسرو کو جنوب میں بھیجا۔ جس نے راوی ورما کل سیکرا کو شکست دیکر پھر مدورا اور ملیبار پر قبضہ کرلیا۔ (خسرو کا ارادہ تھا کہ خود حاکم بن بیٹھے۔ لیکن دوسرے مسلمان امرا جیسے ملک تیغہ ملک گل اور ملک تیمور کی موجودگی نے اس کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ لیکن خفیہ طور پر اس نے مسلمانوں کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا وہ پچھلے صفحات میں لکھا جاچکا ہے) اور یہی وجہ ہے کہ خسرو کی واپسی پر ہندوؤں نے پھر اس مسلمان فوج کا بھی خاتمہ کردیا جو خسرو نے اس ملک میں چھوڑی تھی۔

(نوٹ :- اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں نے یہاں مستقل حکومت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ وہ صرف سندر پانڈے کی حکومت کے محافظ کے طور پر ملک میں تھے۔ کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا۔ کہ کافور کے جانے کے بعد مسلمانوں کے کون کون سردار اس ملک میں رہ پڑے تھے)

یہ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ کافور کی واپسی پر خود ہندوؤں نے سندر پانڈے کی حکومت کا خاتمہ کردیا تھا۔ اب مبارک شاہ کی اس فوج کا جس کو خسرو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ خاتمہ ہوگیا۔ اور اس کی خبر دہلی پہونچی تو اس وقت سلطان محمد تغلق سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے خواجہ جہاں کو جنوب پر فوج کشی کا حکم دیا۔

خواجہ جہاں نے مدورا کو از سر نو فتح کر کے یہاں جلال الدین احسن کو گورنر مقرر کیا۔
ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

" بادشاہ نے معبر کے ملک (جو دلی سے چھ مہینے کے راستے پر ہے) کا حاکم سید
جلال الدین احسن شاہ کو مقرر کیا تھا۔"

یہی سیاح لکھتا ہے :۔

" جلال الدین احسن سلطان محمد بن تغلق کے امرائے دربار سے تھا۔"

فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں اسی نام کی تصدیق کی ہے ۔ مورخ برنی (ضیاء الدین) نے اسی نام کو سید حسین لکھا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ وہ سادات کیتھل میں سے تھا ۔

جلال الدین احسن گورنر بننے کے بعد چھ سال تک محمد بن تغلق سے وفادار رہا۔ اس کے بعد وہ بغاوت کر کے مدورا کا خود مختار حاکم بن گیا یہ گویا پہلا اسلامی بادشاہ ہے جو مدورا کی سلطنت پر حکمران ہوا ۔ اسکی بغاوت کے متعلق ابن بطوطہ لکھا ہے :۔

" اس نے مخالفت کی اور خود بادشاہ بن بیٹھا ۔ اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اور دینار کے ایک طرف یہ عبارت نقش تھی ۔ :۔

"سلالۃ طٰہٰ ویٰس ابو الفقرا والمساکین جلال الدنیا والدین"

اور دوسری طرف یہ عبارت تھی :۔

" الواثق بتائید الرحمٰن احسن شاہ السلطان" ۔"

اس سکہ اور عبارت کی تصدیق ان سکوں سے بھی ہوتی ہے ۔ جو مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے دستیاب کیا ہے ۔ ان سکوں پر ۷۳۷ھ ہے (یعنے ۱۳۳۶ء) اس سال سے اگلے سالوں کے جو سکے ملے ہیں۔ ان پر سلطان محمد بن تغلق کا نام ہے ۔ محمد بن تغلق کے جو سکے

[illegible] پر پہنچا [illegible] اس میں ابھی [illegible]

[illegible] دن میں دور ا کیے بعد [illegible]

[illegible] اس جگہ [illegible] کرتا تھا۔ جس کے لیے بندرگاہ کے قریب

[illegible] بنایا گیا تھا۔ جب کبھی مخالفین کا خوف ہوتا تو اہل

جہاز [illegible] پر چڑھ کر محفوظ ہو جاتے تھے۔"

پانچ سال حکومت کرنے کے بعد جلال الدین احسن نے وفات پائی۔ اسکی دو لڑکیاں

تھیں۔ ان میں [illegible] سے تھا۔ جو ابن بطوطہ سے منسوب تھی۔ دہلی میں اس کا نکاح ہوا

تھا۔ ابن بطوطہ اپنی [illegible] بی بی کے متعلق لکھتا ہے :۔

"نہایت نیک بخت بی بی تھی۔ رات کو تہجد پڑھتی تھی۔ پڑھنا بھی جانتی تھی۔

لیکن لکھنا نہیں آتا تھا۔"

جلال الدین کی وفات پر امراء نے اس کے ایک امیر علاؤ الدین اروجی کو تخت پر بٹھایا

اس نے ایک سال تک حکومت کی۔ یہ ایک سال ہندوؤں سے جنگ ہی میں گذرا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :

"اس نے حکمران ہونے کے بعد کسی ہندو راجہ پر حملہ کیا۔ اور بہت سا مال و دولت لے

کر پھر دارالحکومت کو واپس آیا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد اس نے پھر اسی ہندو

راجہ پر چڑھائی کی۔ اور [illegible] کو اتفاقاً جنگ میں ایک تیر آ کر لگا۔ جس کے صدمہ

سے فوراً مر گیا۔"

علاؤ الدین کے بعد اس کا داماد قطب الدین تخت نشین ہوا۔ لیکن امراء اس کی عادتوں

سے ناراض تھے۔ تخت نشینی سے چالیس دن بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا امیر

غیاث الدین دامغانی جو ترکی النسل تھا۔ تخت پر بیٹھا۔ اس نے جلال الدین احسن کی دوسری بیٹی سے جو ابن بطوطہ کی سالی تھی۔ نکاح کیا۔ اس کے عہد میں راجہ بلالا سوم سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ بوڑھے سالار راجہ بلالا پے در پے حملے کرتا رہا کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔ لیکن جاں باز مٹھی بھر مسلمان برابر مدافعت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بلالا سوم ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس جنگ کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے۔ جس سے اس زمانے کے مسلمانوں کا جوش وخروش، ان کا جذبۂ ایمانی اور باوجود اس قدر اقلیت میں ہونے کے انکے استقلال اور جوانمردی کا پتہ چلتا ہے۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"اس بادشاہ (دامغانی) کے قرب وجوار میں ایک راجہ بلال دیو تھا۔ یہ بڑا عظیم الشان راجہ تھا۔ اس کا لشکر ایک لاکھ کے قریب تھا۔ اس کے ساتھ بیس ہزار مسلمان تھے۔ جن میں اکثر چور اور ڈاکو اور بھاگے ہوئے غلام تھے۔ اس نے معبر پر حملہ کیا۔ اس وقت بادشاہ کے پاس فقط چھ ہزار فوج تھی۔ جن میں سے نصف تعداد تو اچھے سپاہیوں کی تھی۔ اور باقی یونہی فضول اور بے سامان تھے۔ شہر کبان کے باہر مقابلہ ہوا۔ معبر کے لشکر نے شکست کھائی۔ اور وہ سب شہر مترہ دارالخلافہ کو واپس آ گئے۔ اور راجہ نے کبان کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر بہت بڑا اور مضبوط تھا۔ اس نے دس مہینے تک اس کا محاصرہ کیا۔ اور قلعہ والوں کے پاس صرف چودہ دن کی خوراک باقی رہ گئی۔ راجہ نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم قلعہ چھوڑ دو تو تمہیں امان ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم پہلے بادشاہ سے خبر منگا لیویں۔ راجہ نے کہا اچھا اسی چودہ دن کے عرصہ میں اجازت منگا لو۔ راجہ نے سامان

غیاث الدین کو لکھا۔ اس نے جمعہ کے دن وہ خط سب لوگوں کو سنایا۔ حاضرین سن کر رو دیئے اور کہا۔ ہم اپنی جانیں اللہ کے راستے میں وقف کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر راجہ نے وہ شہر لے لیا تو ہمارے شہر پر آئیگا۔ گرفتار ہونے سے تلواروں کے سائے میں مرنا بہتر ہے۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عہد کیا کہ کوئی نہ بھاگے۔ اور دوسرے دن سب نکلکر اپنے عمامے گھوڑے کی گردن میں باندھ دیئے۔ یہ علامت اس بات کی تھی کہ مر جائیں گے۔ بھاگ کر نہ آئیں گے۔ ان میں سے دلیر اور بہادر سب آگے بڑھے۔ وہ تعداد میں تین سو کے قریب تھے۔ میمنہ پر سیف الدین بہادر کو کھڑا کیا۔ یہ شخص بڑا عالم، پرہیزگار اور بہادر تھا۔ اور میسرہ پر ملک محمد سلحدار کو اور سلطان قلب میں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی تین ہزار فوج تھی۔ باقی تین ہزار کو ان کے پیچھے کیا۔ اور ان پر اسدالدین کیخسرو فارسی کو سردار بنایا۔ زوال کے وقت انہوں نے سفر شروع کیا۔ دشمن بالکل غافل تھا۔ ان کے گھوڑے چراگاہ میں گئے ہوئے تھے۔ اسدالدین نے ان پر ناگہاں حملہ کیا۔ راجہ نے سمجھا کہ چور ہیں۔ اس لئے بغیر کسی تیاری کے ان کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ اور ان کا مقابلہ کیا۔ اتنے میں بادشاہ غیاث الدین بھی جا پہونچا۔ راجہ نے فاش شکست کھائی۔ اور ارادہ کیا کہ سوار ہو کر بھاگ جائے۔ وہ عمر میں اسی برس کا تھا۔ ناصرالدین نے جو غیاث الدین کا بھتیجا تھا۔ اس کو پکڑ لیا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کو قتل کرے۔ کیونکہ وہ اس کو پہچانتا نہ تھا۔ لیکن اس کے ایک غلام نے کہا کہ یہ راجہ ہے۔ اس لئے ناصرالدین نے اس کو قید کر لیا۔ اور اپنے چچا کے پاس پکڑ کر لے آیا۔ بادشاہ نے ظاہر میں اسکی تعظیم کی۔ اور خراج میں بہت سامال، ہاتھی اور گھوڑے لے لیئے۔ کیونکہ

اس سے وعدہ کرتا تھا کہ اسے چھوڑ دونگا۔ جب اس کے پاس کچھ نہ رہا تو اس کو ذبح کرڈالا۔ اور اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھوسہ بھروا کر مترہ کی فصیل پر اس کو لٹکا دیا۔ میں نے بھی اسکو وہاں لٹکا ہوا دیکھا ہے۔"

(ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ از مولوی محمد حسین ایم۔ اے۔)

راجہ بلال سوم کے خاتمہ کے بعد غیاث الدین دامغانی نے ابن بطوطہ کی تحریک پر جسیرائر مالدیپ کی فتح کا ارادہ کیا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"اس غرض کے لئے اس نے کئی جہاز مقرر کئے۔ اور وہاں کی ملکہ کے لئے تحفے، و امراء کے لئے خلعتیں تیار کیں۔ محتاجوں کے لئے بیں جہازوں میں صدقہ بھروایا۔ لیکن یہ زمانہ مالدیپ کے سفر کا نہ تھا۔ اس لئے یہ مہم تین مہینے کے لئے ملتوی کردی گئی۔ اسی اثنا میں غیاث الدین دامغانی کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اسکی تکمیل نہ ہوسکی۔"

اس اولوالعزم سلطان کا عہد صرف دو سال تک رہا۔ اس زمانہ میں مدورا میں وبا پھیل گئی تھی۔ بادشاہ بھی اسی میں مبتلا ہوکر فوت ہوا۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ اسی بادشاہ کے زمانے میں مدورا میں آیا ہوا تھا۔ اس نے یہاں کے بہت سے حالات اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔ جن سے اس وقت کے رسم و رواج اور دوسرے امور پر روشنی پڑتی ہے

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"جب میں کیمپ کے قریب پہونچا تو اس نے میرے استقبال کے لئے ایک صاحب کو بھیجا بادشاہ لکڑی کے برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ دستور ہے کہ بادشاہ کے روبرو کوئی شخص موزہ پہنے نہیں جا سکتا۔ میرے پاس اس وقت موزے نہ تھے۔ ایک ہندو نے مجھے

موزہ دیتے۔ حالانکہ بہت سے مسلمان موجود تھے۔ میں نے اس ہندو کی مروت پر تعجب
کیا۔ میں بادشاہ کے سامنے گیا۔ مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اور قاضی حاجی صدرالزماں
بہاؤالدین کو بلوایا۔ اور اس کے قریب تین خیمے مجھے ٹھہرنے کے لئے دئے۔ اور فرش
اور کھانا یعنے چاول اور گوشت بھجوانے۔ اس ملک میں ابھی ہمارے ملک کی طرح کھانے
کے بعد دودھ کی لسی پیتے ہیں۔"

میدان جنگ میں دامغانی کے ظلم وستم کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"جب ہندو رات کو کیمپ پر چھاپہ مارنے کے واسطے آتے تھے تو سوار لوگ فوراً دشمن
کے تعاقب میں چلے جاتے تھے۔ اور جو قیدی شام کو پکڑ کر لاتے تھے تو ان کو چار
جماعتوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ہر ایک گروہ کو کھنگر کے ایک ایک دروازے پر لیجاتے
تھے۔ اور ہر ایک دروازے کے قریب وہ لکڑی جو کل قیدی اپنے کندھوں پر جنگل
سے لائے تھے گاڑ دیتے تھے۔ پھر اس لکڑی میں ہر ایک قیدی کو پرو دیتے تھے۔
اور ان کی عورتوں کے بال اسی لکڑی سے باندھ دیتے تھے۔ اور بچوں کو ان کے
گودوں میں ذبح کرتے تھے . . . .

یہ بے رحم اور قابل نفرین کارروائی میں نے کسی بادشاہ کو کرتے ہوئے نہیں دیکھی
اور اسی وبال سے یہ بادشاہ جلد مر گیا۔"

غیاث الدین دامغانی کے بعد اس کا بھتیجا ناصرالدین تخت نشین ہوا۔ اس کے متعلق
ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

" یہ ناصرالدین دہلی میں بادشاہ (محمد بن تغلق) کا ملازم تھا۔ جب اس کا چچا معبر
کا بادشاہ ہوگیا تو یہ شخص دہلی سے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگ آیا۔ اسکی تقدیر

میں غیاث الدین کے مرنے کے بعد بادشاہ ہونا لکھا تھا۔ جب اسکی بیعت کی گئی۔ تو شاعروں نے اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔ ان کو اس نے بڑے بڑے صلے دئے۔

پھر ناصرالدین نے اپنی پھوپی کے بیٹے کو جس کے ساتھ سلطان غیاث الدین دامغانی کی لڑکی بیاہی ہوئی تھی قتل کروا دیا۔ اور اس کی بیوہ سے آپ نکاح کر لیا۔۔۔۔"

ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصرالدین نے مالدیب کی ملتوی شدہ مہم کو پھر بھیجنا چاہا۔ لیکن خود ابن بطوطہ کے بیمار ہو جانے سے یہ مہم رک گئی۔ اور ابن بطوطہ یہاں سے بعد صحت ہونے کے چلا گیا۔ وہ اپنی واپسی کے وقت کایل سے گذرا۔ شہر کایل کے متعلق وہ لکھتا ہے:

"اطراف عالم کے جہاز تجارت کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس شہر میں ایک خوبصورت سنگین مسجد ہے۔ اس کے صحن میں انگور اور عمدہ انار کے کثرت سے درخت ہیں ۔

یہاں میں شیخ صالح محمد نیشاپوری سے ملا۔ یہ ان مجذوب فقیروں سے ہیں جو اپنے بال بڑھاتے ہیں۔ اور شانوں پر چھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک شیر رہتا تھا۔ شیخ کے ساتھ تیس فقیر بھی تھے۔ شیر انہیں فقیروں کے ساتھ کھاتا۔ اور انہیں میں مل کر سوتا تھا۔ ایک فقیر کے پاس ایک ہرن بھی تھی۔ اور سات لومڑیاں بھی تھیں۔ ہرن اور لومڑی اس شیر سے ڈرتی نہیں تھیں۔ بلکہ شیر کے ساتھ ملکر سوتی تھیں۔"

سیاح ابن بطوطہ کی تحریر سے مدورا کے اسلامی بادشاہوں کے پانچ نام معلوم ہوتے ہیں۔ گو ابن بطوطہ نے انکی مدت حکومت کے سنین نہیں بتائے ہیں۔ لیکن محکمۂ آثار قدیمہ نے جو سکے دستیاب کئے ہیں۔ ان سے ناموں کی تصدیق کے علاوہ انکی مدت حکومت کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔

ناصرالدین کے بعد سے پھر کچھ اور حالات مدورا کے نہیں ملتے۔ ہاں سکوں کے ذریعہ اور تین نام ملتے ہیں۔ یہ عادل شاہ، فخرالدین مبارک شاہ، اور علاؤالدین سکندر شاہ کے ہیں۔

ناصرالدین کا عہد وہ زمانہ ہے۔ کہ جنوب میں سلطنتِ وجیانگر نہایت مستحکم ہو چکی تھی۔ اور اب بجائے ہوسےسالا سلطنت کے اس وجیانگر کی سلطنت کے حملے مدورا پر ہوتے رہے۔ اس لئے ۱۳۴۴ء سے یعنے ناصرالدین کے عہد سے لیکر آخری بادشاہ علاؤالدین سکندر کے آخری سال ۱۳۷۷ء تک مدورا کے مسلمانوں کا کوئی حال نہیں ملتا۔ اس تمام عرصہ میں وہ وجیانگر سی عظیم الشان ہندو سلطنت کا برابر مقابلہ کرتے رہے۔ اس سال یعنے ۱۳۷۷ء میں انکا خاتمہ ہوگیا۔ وجیانگر والوں نے مدورا پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ کے متعلق تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے :-

"ہمسایہ سردار باکن نے معبر پر حملہ کیا۔ تمام معبر اس کے قبضہ میں آگیا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ مسلمانوں پر حد درجہ ظلم کیا گیا۔"

اس پر ایک ہندو مورخ لکھتا ہے :-

"کہ ہندوؤں کے ظلم وستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان دشوار گزار پہاڑیوں اور جنگلوں میں اپنے مذہب کو چھپا کر رہنے لگے۔"

مدورا کی سلطنت، وجیانگر کے قلب میں ایک کانٹا تھا جو نکل گیا۔

جنوبی ہند اور اس کے مسلمان حملہ آور (South India and her Mahomedan Invaders) کا مصنف لکھتا ہے :-

"مدورا کی فتح کے بعد ہی راجگان وجیانگر نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔"

مدورا کی فتح پر ہندوؤں نے جس قسم کا جشن منایا۔ اس کے متعلق نلس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"۱۳۷۷ء میں وجیانگر کے ہندوؤں نے مدورا کو فتح کر لیا۔ برہمنوں نے اس فتح کو اپنا معجزہ دکھانے کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ یعنے انہوں نے کہا کہ بتوں نے خوش ہو کر مدورا کو پھر انہیں کو بخش دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برہمنوں نے ہندو جنرل کمپنا کو مندر

ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب مندر میں داخل ہوا تو [illegible] نے دیکھا کہ مندر اسی حالت پر [illegible]

[illegible] پہلے تھا۔ یعنی وہ تو اُتنی [illegible]

[illegible] جو ۴۰۰ سال پیشتر جل رہا تھا۔ اب بھی اسی طرح جل ۔

[illegible] صندل کا سفوف اور وہی پھول جو اس دن شام کو مندر میں پڑھا

کے لئے حاضر تھے۔ مرجھائے ہوئے آج بھی موجود ہیں "

غرض ۴۸ سال کے بعد مدورا کی یہ اسلامی سلطنت مٹ گئی ۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے پانچ سلاطین کے نام معلوم ہوتے۔ اور باقی تین سکوں کے ذریعہ اگر انہیں کے ذریعہ سلاطین مدورا کی فہرست مرتب کیجائے تو حسب ذیل نتیجہ نکلتا ہے :-

(۱) جلال الدین احسن ۱۳۳۵ء سے ۱۳۴۱ء

(۲) علاؤالدین ۱۳۴۱ء

(۳) قطب الدین ۱۳۴۲ء صرف چالیس دن

(۴) غیاث الدین دامغانی ۱۳۴۲ء سے ۱۳۴۴ء

(۵) ناصر الدین ۱۳۴۴ء (ایک ہی سکہ ملا ہے)

ان پانچوں ناموں کی تصدیق ابن بطوطہ کے علاوہ سکوں سے بھی ہوتی ہے۔

۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۵ء تک کے سکے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔

(۶) عادل شاہ ۱۳۵۶ء / ۷۵۷ھ صرف ایک سال کے چند سکے ملے ہیں

(۷) فخرالدین مبارک ۱۳۵۹ء / ۷۶۰ھ سے ۱۳۶۸ء / ۷۷۰ھ تمام سالوں کے سکے ملے ہیں۔

(۸) سلطان علاؤالدین سکندر ۱۳۶۲ء / ۷۶۴ھ سے ۱۳۶۷ء / ۷۶۹ھ تک

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ ۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۵ء تک مدورا میں آیا صرف ناصرالدین ہی بادشاہ رہا یا اس کے اور کوئی جانشین ہوئے۔ کوئی ذریعہ نہیں کہ اس کے متعلق دریافت کیا جائے

مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے:-

"گوری پالیم میں (جو مدورا کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے) اس میں ایک مسجد اس زمانے کی ہے۔ جس کو مسلمان نہایت اہمیت دیتے ہیں اس کے احاطہ میں دو قبریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان علاؤالدین اور اس کے بھائی شمس الدین کی ہیں۔"

معلوم نہیں ہوتا کہ یہ علاؤالدین آیا جلال الدین احسن کا جانشین تھا یا کوئی اور جو ناصرالدین کے بعد ہوا۔ تیروپرنکن رام میں (جو مدورا سے چار میل پر ہے) پہاڑ پر ایک قبر ہے جس کو مسلمان سکندر ولی کی قبر بتاتے ہیں۔ غالباً یہ اسی آخری سلطان مدورا کی ہے۔

ٹامسن نے بھی اپنی تاریخ مدورا میں سلاطین مدورا کے نام دئے ہیں اس نے جن ناموں کو دیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) ملک نائب کافور ۱۳۱۰ء سے ۱۳۱۲ء تک

(۲) علاؤالدین ۱۳۱۳ء " ۱۳۱۹ء "

(۳) اتم الدین خان ۱۳۱۹ء " ۱۳۲۲ء "

(۴) قطب الدین داماد ۱۳۲۲ء " ۱۳۲۸ء "

(۵) نعتمال الدین ۱۳۲۵ء " ۱۳۳۴ء "

(۶) سوادالملک ۱۳۳۱ء " ۱۳۳۶ء "

احمدالملک

نندق ملک ۱۳۳۹ء " ۱۳۶۸ء "

لیکن مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے مترجم سفرنامہ ابن بطوطہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

یہ فہرست بالکل غلط اور نام نامانوس ہیں۔

سلاطین مدورا کے سکّے

اب جس قدر سکّے (جن کا اوپر ذکر آچکا ہے) ملے ہیں۔ ان کے نقوش یہاں کتاب معبر سے دئے جاتے ہیں۔

(۱) جلال الدین احسن (۱۳۳۴ء ۷۳۵ھ سے ۱۳۳۹ء ۷۴۰ھ تک)

دینار طلائی

سلالہ طٰہ و یٰس	الواثق
ابوالفقراء والمساکین	بتائید الرحمٰن
جلال الدنیا والدین	احسن شاہ

چاندی کا سکہ

جلال الدنیا	شاہ
والدین	احسن ۷۳۷ھ

تانبے کے سکّے

(۱)

السلطان	شاہ
الاعظم	احسن سلطان

(۲)

سلطان	شاہ
السلاطین	احسن

(۳)

جلال الدنیا	السلطان
والدین	الاعظم

چاندی کا سکّہ

الحسینی	شاہ
	احسن

(۲) علاؤالدین اودوجی سنہ ۷۴۰ھ ۱۳۳۹ء

مخلوط سکّہ

شاہ	علاؤالدین
اودوجی	والدین

ثانیہ

اودوجی شاہ	علاؤالدین
السلطان	والدین

(۳) قطب الدین فیروز شاہ سنہ ۷۴۰ھ ۱۳۳۹ء

شاہ	قطب الدین
فیروز	والدین

(۴) غیاث الدین محمد وامغان شاہ ۷۴۱ھ ۱۳۴۰ء سے ۷۴۲ھ ۱۳۴۱ء

چاندی

شاہ	السلطان

الاعظم غیاث | والخان
الدنیا والدین | محمد

ثانیہ

السلطان | غیاث الدنیا
الاعظم | والدین

(۵) ناصرالدین محمود شاہ ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء

ناصرالدنیا | محمود غازی
والدین | والخان شاہ السلطان

(۶) عادل شاہ ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء

مخلوط

السلطان الحلیم | عادل شاہ

ثانیہ

(۱) السلطان | عادل شاہ
الاعظم | السلطان
(۲) عادل شاہ | السلطان
(۳) عادل | شاہ

فخرالدین مبارک شاہ ۷۶۱ھ ۱۳۵۹ء ۷۷۰ھ ۱۳۶۸ء

ثانیہ

(۱) برگزیدہ | مبارک شاہ

اللہ فخر شاہ	شاہ جہان
شاہان	۱۹۷ھ
(۲) برگزیدہ	خادم
اللہ	مصطفیٰ ۷۹۵
(۳) برگزیدہ	خادم
اللہ	رسول اللہ
(۴) النبی	محمد
ناصف	مصطفیٰ

علاؤالدین سکندر شاہ ۷۷۴ھ ۷۷۹ھ
۱۳۷۲ء ۱۳۷۷ء

ثانیہ

(۱) برگزیدہ	شاہ
رحمان	سکندر
	السلطان ۷۷۵ھ
(۲) علاؤالدنیا	سکندر شاہ
والدین	السلطان

ان سکوں پر کپتان ٹوفنل (Toffaned) نے سب سے پہلے روشنی ڈالی ہے۔
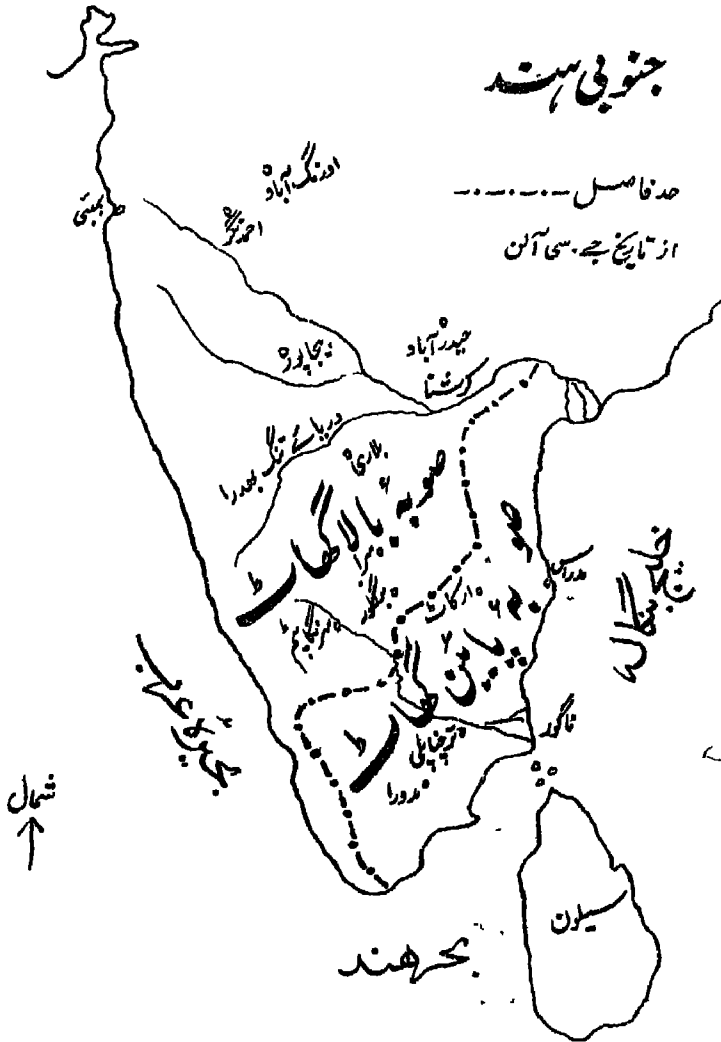
اس نقشہ میں جنوبی ہند کی وہ تقسیم بتلائی گئی ہے۔ جو شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے کی تھی جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مشرقی میدانی ملک کو پائین گھاٹ اور مغربی پہاڑی حصہ کو بالا گھاٹ کا نام دیا گیا۔ (نوٹ) جنوبی ہند میں پہاڑیوں کو گھاٹ کہتے ہیں۔

جنوبی ہند کے مسلمان

جنوبی ہند کے مسلمان بلحاظ نسل مختلف طبقوں میں منقسم ہیں

(۱) دکنی مسلمان۔

(۲) لبے، مرکیار، نینار، راؤتھرا ور موپلے وغیرہ۔

(۳) اہل نوائط۔

(۱) دکنی مسلمان

یہ وہ مسلمان ہیں جو بیجاپورا ور گولکنڈہ کی فوجوں کے ساتھ جنوبی ہند میں آئے۔ ان میں زیادہ تر بیجاپوری مسلمانوں کی تعداد ہے۔ اضلاع بلاری، اننت پور، ریاست میسورا ور مشرق میں ویلورتک انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔ مشرقی اضلاع میں کرنول، نلورا ور مدراس میں ترچناپلی تک ان مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے جو گولکنڈہ سے آئے تھے۔ بہر طور موجودہ مسلمان ان مسلمانوں کی اولاد ہیں جو سلطان علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق کے عہد میں شمال سے نکلکر دکن میں آئے۔

اور وہاں سے جنوب میں پھیلے۔ ان میں سیّد بھی ہیں، شیخ، مغل اور پٹھان بھی ہیں۔ ان مسلمانوں کی مادری زبان دکھنی ہے۔ جس کو اردو سمجھنا چاہئے۔ معاشرت کے لحاظ سے ان میں ابھی تک وہی رسم و رواج ہیں جو دکن کے مسلمانوں میں ہیں۔

(۲) لبّے، مرکیار، نیتار، راونھر اور موپلے

بلحاظ نسل لبے، مرکیار اور موپلے وغیرہ صرف جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان عربوں کی اولاد سے ہیں جو کبھی اس ملک میں تجارت کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے خاندان بھی ہوں، جن کو عربوں سے قطعی تعلق نہ ہو۔ بلکہ بعد میں اسلام لائے ہوں۔ ان مسلمانوں کے متعلق مورخین و محققین کی جو رائیں ہیں۔ ذیل میں دی جاتی ہیں:۔

(۱) لبے

مدراس سنسر رپورٹ سنہ ۱۹۰۱ء میں تحریر ہے:۔

"لبے مسلمانوں کی ایک قوم ہے۔ جس میں تامل خون ہے۔ یہ قوم پان، چمڑے اور دوسری اشیا کی تجارت کرتی ہے۔ یہ مرکیاروں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان کی زبان میں بہ نسبت مرکیاروں کے عربی الفاظ بالکل کم استعمال ہوتے ہیں۔"

مدراس رپورٹ بابت سنہ ۱۸۸۱ء میں مرقوم ہے:۔

"لبے ڈریوڈین قوم سے ہیں۔ جن میں عرب خون کی آمیزش ہو گئی ہے۔ یہ قوم نہایت محنتی اور جفاکش ہے۔ لبے تجارت میں خوب ماہر ہیں۔"

سنہ ۱۸۹۱ء کی رپورٹ میں لکھا ہوا ہے:۔

"مسلمانوں کی ایک مخلوط قوم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگلے مسلمان فاتحین

اور ٹیپو سلطان نے مسلمان بنایا تھا"

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :-

"حجاج بن یوسف کے ظلم سے بنی ہاشم کے لوگوں نے عرب سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لی تھی۔ ان میں ساحل کوکن پر جو اترے وہ نوائط کہلائے۔ اور راس کماری اور مشرقی ساحل کورومنڈل پر جو اترے وہ لبے کہلائے۔ لبے لفظ "لبیک" سے نکلا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب یہ لوگ اس ملک میں آئے تو نہایت غریب تھے۔ یہاں کے لوگ جب انہیں مخاطب کرتے تھے تو وہ جواب میں لبیک کہتے تھے۔ جس کی معنی "میں حاضر ہوں" کے ہیں۔ لفظ لبے کی ایک اور تشریح بھی کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ شروع میں ان لوگوں کی تعداد بالکل قلیل تھی۔ یہاں کے ملکی حاکموں نے جب انہیں ستانا شروع کیا تو انہوں نے لبیک کہا یعنے "ہم آپ کے غلام ہیں"۔

ایک اور مورخ کا بیان ہے :-

"لبے ان عربوں کی نسل سے ہیں جو گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں کایل پٹن میں جو ساحل کورومنڈل پر ہے۔ تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ جب یہاں رہتے ہوئے ان کو ایک عرصہ گذر گیا تو انہوں نے یہاں کی دیسی عورتوں سے شادی کر لی اور لبے انہیں عربوں کی اولاد سے ہیں"

لفظ لبے حال کی ایجاد ہے۔ ورنہ تامل زبان میں جو قدیم کتابیں ہیں انکے لئے لفظ "سونگن" لکھا ہوا ہے۔ سونگن سے مراد "ملک عرب" ہے۔ اس لحاظ سے لبے عربوں اور جنوبی ہند کے باشندوں کی ایک مخلوط نسل ہیں۔

بعض مورخین لکھتے ہیں :-

"لبے عام طور پران مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو عرب باپ اور ڈریویڈین ماں سے پیدا ہوئے۔ انہیں میں مرکیار اور راوتھر بھی ہیں۔ یعنے وہ لبے جو سپاہی یعنے صاحب سیف ہوئے وہ راوتھر کہلائے۔ اور جو ملاح بنے مرکیار کہلائے۔

ان تمام روایات پر اگر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ لبے، عرب اور ٹمل قوم دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ باپ کی جانب سے انکی نسل عربوں سے ملتی ہے توماں کی جانب سے یہ جنوبی ہند کی ٹمل قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان عربوں کی اولاد ہیں جو اس ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے۔ ان میں بعض عرب تو یہیں رہگئے تھے۔ اور بعض ملک عرب کو آتے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں شادیاں بھی کیں۔ اور کنیزیں بھی رکھیں۔ اس میل جول سے جو نسل پیدا ہوئی وہ لبے کہلائی۔ ممکن ہے کہ بعض ٹمل خاندان براہ راست مسلمان ہو کر انہیں میں مل گئے ہوں۔ لبے زیادہ تر سنی مذہب کے پیرو ہیں۔ اپنے آبا واجداد کے مسلک پر لبے صرف تجارت کرتے ہیں۔ شاذ ونادر ہی کوئی سرکاری ملازمت کرتا ہے۔ یہ لوگ شادیاں بھی آپس ہی میں کرتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے ساتھ ایک نام لگا ہوا ہے۔ یہ نام یا تو ان کے وطن کو یا ماں کے سلسلۂ نسل ونسب کو ظاہر کرتا ہے۔

لبے ضلع مدورا کے بندرگاہ کایل پٹن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ عرب زیادہ تر اسی بندرگاہ میں تجارت کے لئے آتے تھے۔ یہاں سے ان کی نسل پھیلتے پھیلتے مندرجہ ذیل اضلاع میں پھیل گئی۔

مدورا، ترچناپلی، تنجاور، تناولی، شمالی وجنوبی ارکاٹ، سیلم اور علاقہ میسور کے جنوب مشرقی حصہ میں گرگیسوری، نرسی پور وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

(ii) مرکیار

مدراس سنسر رپورٹ ۱۹۰۱ء میں لکھا ہے :-

"مسلمانوں کا ایک قبیلہ ہے۔ جس میں عربوں اور ہندوؤں کے خون کی آمیزش ہے یہ اکثر تاجر پیشہ اور لباہن سے بالکل علیحدہ ہیں"

مورخ جے ڈبلیو فرانسز لکھتا ہے :-

"مرکیار بڑے تاجر ہیں۔ جزیرۂ سیلون اور سٹریٹ سٹلمنٹس یعنے ملایا وغیرہ سے انکی تجارت ہے۔ اکثر دیسی جہاز ان کے قبضہ میں ہیں۔ ان کی زیادہ تر تعداد پورٹو نووو یعنے محمود بندر میں ہے۔ مرکیار لفظ "مرکب" سے نکلا ہے۔ جس کی معنی کشتی کے ہیں۔ روایت ہے کہ جب عرب اپنے ملک میں ظلم وستم کی زیادتی نہ سہہ سکے تو ہندوستان کے ساحل پر آئے تو ان سے مقامی باشندوں نے ان کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے اپنی کشتیاں دکھلائیں۔ جنہیں وہ مرکب کہتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں نے ان کا نام مرکیار رکھدیا۔ مرکیار اپنے آپ کو لباہن سے برتر مانتے ہیں۔ اس لئے لباہیں میں شادی نہیں کرتے"

(iii) نبیار

کیاسٹس انڈ ٹرائبس آف سدرن انڈیا میں لکھا ہے :-

"ہندو قوم میں جو نبیار ہیں۔ وہ ویلا ذات کے ہندوؤں کا ایک فرقہ مانا گیا ہے"

نبیار کی معنی بھی وہی ہیں جو نایک کے ہیں۔ یعنے "آقا و سردار" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈریویڈین کا یہ طبقہ کبھی اس ملک میں حکمران یا کم از کم اعلیٰ فوجی ملازمت میں تھا۔ مدورا کی تاریخ میں بہت سے ایسے نام پائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کی اس قوم سے جو لوگ مسلمان ہوئے

انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اس ملکی و فوجی اعزاز کو باقی رکھا۔

بعض مصنفوں نے نینار کو لفظ ناویار سے تبلایا ہے۔ جس کی معنی ملاح کے ہیں۔ اور وہی روایت پیش کرتے ہیں جو مرکیاروں کے متعلق مشہور ہے۔ یعنے عرب ناؤ کے ذریعہ ہندوستان آئے۔ اور ناویار کہلائے گئے۔ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ جنوبی ہند کی ہندو قوموں میں نینار پہلے سے موجود تھے۔ اوران میں جو مسلمان ہوئے انہوں نے اپنے قدیم لقب کو اپنے نام کے ساتھ باقی رکھا۔

(۱۷) راوتھر

یہ بھی نینار کی طرح جنوبی ہند کی ٹمل قوم کا ایک قبیلہ ہے۔ انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو اپنے نام کے ساتھ اپنے قدیم لقب کو باقی رکھا۔

راوتھر کی معنی گھوڑا سوار کے ہیں۔

مدورا کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے:۔

"اگلے دنوں میں ملک کے راجاؤں کے پاس جو سوار فوج تھی وہ راؤتھر کہلاتی تھی۔ اس لئے راوتھر ایک جنگی قوم ہے"

کیاسٹس انڈٹرائبس کا مصنف لکھتا ہے:۔

"قدیم زمانہ میں شاہی فوج میں سواروں کو راوتھر کہا جاتا تھا"

(۷) موپلے

یہ بھی عربوں اور ہندوؤں کی ایک مخلوط نسل ہے۔ جو مغربی ساحل پر اضلاع ملیبار ٹراونکور، کوچین اور کنارا میں پائی جاتی ہے۔ مسلمان عرب تاجر جو ان ملکوں میں آتے تھے یہاں انہوں نے شادیاں بھی کیں۔ اور کنیزیں بھی رکھیں۔ اس لئے موپلے انہیں عربوں کی اولاد

سے ہیں۔ ان کے اوضاع واطوار اور ان کے رسم و رواج میں عربی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے گو ان کی زبان ملیالم ہے۔ لیکن عربی الفاظ بہت زیادہ مستعمل ہیں۔

ماپلا نام کے متعلق مورخ لوئیس مور لکھتا ہے :-

"موپلا کی معنے نوشاہ یا داماد کے ہیں۔ یہ نام اس لئے دیا گیا کہ عرب تاجر جب ملک میں آئے تو نہایت معزز مانے جاتے تھے۔ انہوں نے جب یہاں شادیاں کیں تو ملکیوں کے داماد بن گئے۔ اور موپلا کے نام سے پکارے جانے لگے۔ اور اسی طرح یہ نام آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے پڑ گیا"

اب بھی اس ملک میں نوشاہ کو موپلا ہی کہا جاتا ہے

نلس اپنی تاریخ مدورا میں لکھتا ہے :-

"مدورا کی کلن قوم نے ہی پہلے پہل مسلمانوں کو یہ نام دیا۔ اس لئے کہ عرب تاجروں نے اس قوم کی عورتوں سے شادی کی تھی"

اس کے برخلاف یول اور برنل "انڈین انٹی کوئٹیز" (Indian Antiquities) میں لکھتے ہیں :-

"ماپلا کے معنی داماد کے ہیں۔ ضلع تنجاور میں یہ نام ابھی تک باقی ہے۔ یعنے راجہ کی بیٹی سے جس کی شادی ہوتی ہے۔ اس کا نام موپلے صاحب رکھا یا جاتا ہے"

پدمانابھ منن کی تاریخ ملیبار میں لکھا ہے :-

"لفظ موپلا دراصل مہاپلا کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مہا کی معنی بڑے اور معزز کے ہیں۔ عرب تاجر معزز ہونے کی حیثیت سے مہا کہلاتے تھے۔ ان کی اولاد مہا پلے کہلائی۔ پلے کی معنے بیٹے کے ہیں"

لوگن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

" ممکن ہے کہ لفظ ما محمد سے ہو۔ محمد سے مراد عام مسلمانوں سے ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی اولاد اس ملک میں موپلا کہلاتی۔ ملیالم زبان میں پلا کی معنے بیٹا۔ بچہ اور اولاد کے ہیں "

مورخ ڈے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

" ما کی معنے ماں کے ہیں۔ اور پلا بچے کو کہتے ہیں۔ عربوں نے دیسی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس لئے بچے بجائے باپ کے منسوب ہونے کے ماں سے منسوب ہوئے "

ولسن بھی اپنی تاریخ میں مورخ ڈے کی روایت ہی لکھا ہے۔

لیکن ڈنکن لکھتا ہے کہ کسی شخص نے ایک قاضی کو دق کرنے کیلئے ماں کا بچہ کہا۔ اس وقت سے یہ نام یہاں کے مسلمانوں کا پڑ گیا۔

کتاب "ایشیاٹک ریسرچ (Asiatic Research) میں لکھا ہے :-

" لفظ ما۔ مہا۔ ہے۔ لفظ موخا کے بگڑے ہوئے تلفظ ہیں۔ پلا کی معنے بچے کے ہیں چونکہ اگلے مسلمان موخا (ملک عرب) سے ہجرت کرکے یہاں آئے تھے۔ انہیں موپلا کہا گیا "

براون لکھتا ہے :-

" موپلا لفظ معبر کا بگڑا ہوا تلفظ ہے معبر کے معنی "پانی پر" ہیں۔ اس لئے کہ عرب سمندر کے ذریعے آئے تھے۔ اس لئے انہیں موپلا کہا گیا "

مورخ پرسی۔ باجز لکھتا ہے :

" موپلا کے متعلق اب تک جس قدر روایتیں مروج ہیں سب سے زیادہ قرین قیاس

نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ موپلا مفلح کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مفلح لفظ فلاح
سے بنا ہے۔ جس کی معنی کاشتکاری یا زراعت کے ہیں۔ عرب جب اس ملک میں آئے
تو انہوں نے زراعت اختیار کر لی۔ اور ان کا نام بلحاظ پیشہ مفلح تھا۔ جو بگڑتے
بگڑتے موپلا بن گیا۔"

ان مذکورۂ بالا اقتباسات و مورخین کی آراء سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لبے، مرکبار اور موپلے ان عربوں کی اولاد سے ہیں جنہوں نے اس ملک میں یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اور ممکن ہے کہ ان علاقوں کے باشندے بھی جو براہ راست اسلام لائے۔ وہ بھی اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ جس طرح ان علاقوں میں جہاں دکنی مسلمان آباد ہیں۔ کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو دکنی مسلمانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے برخلاف نبنار اور راؤتھر مسلمان خالص ہندوستانی نسل سے ہیں۔

ان سب کے علاوہ جنوبی ہند میں وہ طبقے بھی ہیں۔ جنہیں نداف کہا جاتا ہے۔ اضلاع بلاری کڑپہ و کرنول میں انہیں پنجارے کہا جاتا ہے۔ گو اور جگہ ان کی زبان دکنی یا ہندوستانی ہے لیکن ان اضلاع میں انکی زبان تلگو ہے۔ اور یہ اپنی ہی برادری میں شادیاں کرتے ہیں۔ یہ نہایت تعجب سے دیکھا گیا کہ انہیں مساجد میں آنے نہیں دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔ کہ مسلمانوں میں بھی اچھوت ہیں۔

ضلع اننت پور و بلاری، غیرہ میں چند مسلمان قبیلے ایسے ہیں۔ جنہیں منڈوتلکر کہا جاتا ہے۔ (تلکر بمعنی ترک) یہ سنگ تراشی کا کام کرتے ہیں۔ ان کا قبیلہ گاؤں سے دور بالکل علیحدہ رہتا ہے۔ دوسرے مسلمانوں میں یہ شادیاں نہیں کرتے۔ اسی طرح رولا (اننت پور) کے قریب مسلمانوں کا ایک قبیلہ ہے۔ جس کے افراد کو "لمباڑی قوم" (جنوبی ہند کی مشہور

خانہ بدوش قوم جو کوڑیوں کے زیورات اور ہڈی اور پیتل کی چوڑیاں پہنتی اور ہر جگہ لکڑیاں حصیریں یا چونا بیچتی نظر آتی ہیں) اپنا پیشوا مانتی ہے:

اہل نوائط

اہل نوائط جس قدر جنوبی ہند میں پائے جاتے ہیں شاید اس قدر شمالی ہند میں نہیں ہیں۔ ان کی کثیر تعداد ساحل کوکن اور مدراس کے قریب ضلع جنوبی ارکاٹ اور ویلور میں پائی جاتی ہے۔

نوایط کے متعلق مشہور مورخ طبری کا بیان ہے:۔

"نوایط قوم قریش سے ہیں"

لیکن تاریخ یمن کا مصنف بتاتا ہے:۔

"نوایط ملاحوں کا ایک قبیلہ ہے"

جامع اللباب کا مصنف لکھتا ہے:۔

"نوایط شہر کوفہ کے عابد میں سے تھے"

غرضکہ ان کی اصل کے متعلق روایات بہت مختلف ہیں۔ جو کچھ کتب تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے:۔

(۱) نوائط (بنو = اولاد۔ نائطہ = فرزند نضر بن کنانہ قریش) چونکہ نائطہ کی اولاد میں ہیں۔ اس لئے قوم قریش سے ہیں۔ (طبری)

(۲) نوائط۔ (بنو) وائط۔ ایک مقام کا نام جو بغداد سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر ہے: یہ لوگ وائط میں رہتے تھے۔ بنو وائط کہلانے لگے۔ یعنی وائط کے باشندے۔ رفتہ رفتہ کثرت استعمال

سے یہ لفظ نوائط بن گیا۔

(۳) نوائط (بنو = اولاد۔ وائط = ملاح) چونکہ یہ لوگ اچھے تیراک اور کشتی بانی میں مشتاق تھے۔ اس لئے بنو وائط کہلانے لگے۔ جو آگے چلکر نوائط ہو گیا۔ (تاریخ یمن)

(۴) نوائط (بنو = اولاد۔ نائطہ = متحد یا متفق) یہ لوگ شروع میں ایک ہی لیڈر کے ماتحت ہوتے تھے۔ اس لئے نوائط کہلانے لگے۔

(۵) نوائط = عمائدین کوفہ سے ہیں۔ (جامع اللباب)

اب ان روایات کے بعد خود اہل نوائط کی روایات کو دیکھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ قوم قریش سے ہیں۔ اس کا سبب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قریش مکہ معظمہ کی ایک معزز اور سردار قوم تھی۔ اور جناب رسول اللہ صلعم بھی اسی کے ایک فرد بزرگ ہیں۔ بہرحال نوائط کے تین گروہ ہیں

(۱) جو اپنے کو نائطہ بن نضر بن کنانہ کی اولاد بتاتا ہے۔

(۲) جو مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) جو اپنے آپ کو حضرت امام زین العابدین کی اولاد ظاہر کرکے اپنے نسب نامہ کو مالک بن کنانہ پر ختم کرتا ہے۔

ان تینوں روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ نوائط نضر بن کنانہ کی اولاد سے ہیں۔ ذیل کا شجرہ اس کو اچھی طرح واضح کرتا ہے:۔

نضر بن کنانہ

- مالک
  - قریشی نائطہ (گروہ دوم)
  - سادات نائطہ (گروہ سوم)
- نائطہ (گروہ اول)
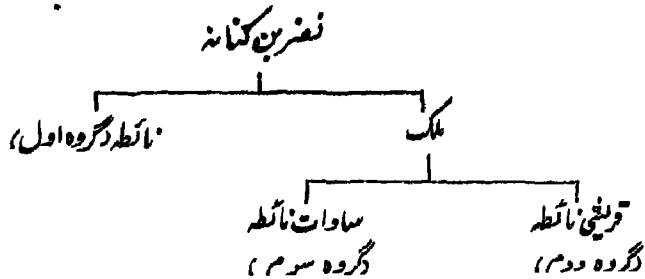
نضر بن کنانہ چونکہ قریش تھا۔ اس لیئے تینوں گروہ قریش ہیں۔ پہلے اور دوسرے گروہ کو چھوڑ کر تیسرا گروہ اہلِ بیت رسول اللہ سے سلسلۂ نسب رکھتا ہے۔ اس لئے سادات نائطہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ اور ان کا شجرہ حسب ذیل ہے :۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم

فاطمۃ الزہرا رض | (حضرت علی رض)

امام حسن رض — امام حسین رض — (بی بی) شہر بانو

امام حسین رض
↓
امام زین العابدین
↓
امام باقر
↓
امام جعفر صادق
↓
سید محمد
↓
سید عبداللہ (مقیم وائط)
↓
سید عبدالرحمن (وائطی)

(بی بی) شہر بانو
↑
شہریار
↑
خسرو پرویز
↑
نوشیرواں
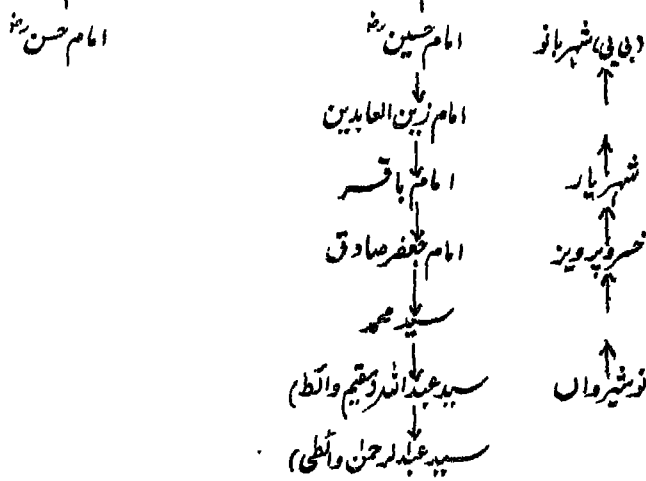
نوائط کی اس روایت کو تسلیم کرنے میں بعض مورخین کو بجا طور پر شک ہے۔ وہ روایت یہ ہے :۔

"مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد جس میں پہلا اور دوسرا گروہ شامل ہے۔ نائطہ کہلاتی ہے۔ تیسرا گروہ سید کہلاتا ہے۔ یہ شبہ اس لیئے پیدا ہوتا ہے کہ صرف نائطہ کی اولاد ہی نائطہ کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ مالک کی اولاد نائطہ نہیں کہلا سکتی۔"

ایک مورخ لکھتا ہے :۔

"نوائط کا پہلا گروہ بنو نضر کہلاتا ہے۔ دوسرا گروہ جو مالک سے نسبت رکھتا ہے وہ شیخ ہے۔ اور تیسرا گروہ حضرت امام زین العابدین کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے سید ہے۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں۔ جنوبی ہند میں جو لوگ نوائط کہلاتے ہیں۔ وہ شیخ تو ہیں مگر بنو نضر نہیں کہلاتے۔ بلکہ اپنے آپ کو صرف نوائط کہتے ہیں۔ اس مجموعی لقب کے علاوہ ان کے چند فروعی لقب بھی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ الگ الگ اپنے اپنے خاندانی ناموں سے بھی اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں"

مورخین کے ایک اور گروہ کا خیال ہے:۔

"نوائط کا پہلا مسکن مدینہ ہے۔ اور چونکہ یہ اہل بیت کی اولاد ہیں۔ اس لئے عوام میں ان کی عزت وحرمت بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ عادات وخصائل اور علم وفضل کے لحاظ سے بھی مرتبہ سیادت کو بڑا دخل ہے۔ کسی زمانہ میں زمین کی کاشت اور سائنس کی ترقی میں یہ لوگ سب سے پیش پیش تھے۔ اس لئے حجاز میں بھی یہ ذی عزت تھے"

ہم اس کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ کہ نوائط کا پہلا مسکن مدینہ ہے۔ کیونکہ قریش مکہ میں رہتے تھے۔ ہاں اسلام لانے کے بعد بہت سے قریش مدینہ میں آگئے تھے۔ اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد نے اسی جگہ سے ترقی کی۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ سادات نائطہ کا پہلا مسکن مدینہ ہو۔ لیکن قریشی نوائط کا پہلا مسکن مدینہ نہیں ہو سکتا۔ ان مذکورۂ بالا تینوں روایات کو لیتے ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے:۔

"یہ تینوں گروہ مدینے میں رہتے تھے۔ حجاج بن یوسف کا ظلم جب حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً نقل مکان کرکے مقام واسط میں آکر آباد ہوگئے۔ جو بغداد سے نو[9] میل۔۔

کے فاصلہ پر ہے۔ پھر وہاں سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ اس روایت کی تاریخ سے جو حوالہ دیا جاتا ہے وہ پہلے دو گروہوں کے متعلق ہے۔ سنہ ۴۰ ہجری اور تیسرے گروہ کے متعلق سنہ ۱۵۲ھ ہے"۔

مورخ ابو جعفر طبری، نواب عزیز یار جنگ، نواب شاہنواز صمصام الملک ان تاریخوں پر متفق ہیں۔ تزک والا جاہی کے مصنف نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن ان تاریخوں پر ایک گہری نظر ڈالی جائے۔ تو پہلی تاریخ یعنے سنہ ۴۰ھ وہ سنہ ہے جبکہ حجاج بن یوسف کا پتہ بھی نہ تھا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت سنہ ۶۱ ہجری میں ہوئی ہے۔ اور کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس سے پہلے اہلِ مدینہ یا مکہ پر کسی مسلم گورنر کی جانب سے ظلم ہوا ہو۔ حجاج، عبدالملک بن مروان کا گورنر تھا۔ اور یہ خلیفہ یزید کے بعد تیسرا خلیفہ ہے۔ اس کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ ایسی ہی حالت دوسرے سنہ یعنے سنہ ۱۵۲ھ کی ہے۔ یہ زمانہ "خلافت عباسیہ" کا ہے۔ اس وقت دوسرا خلیفۂ عباسی منصور دادِ حکومت دے رہا تھا۔ اس لئے حجاج کے ظلم و ستم کی روایات خصوصًا اس معاملہ میں صحیح نہیں ٹھہرتیں۔ چونکہ حجاج اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے بدنام ہے۔ اس لئے نوائط کی ہجرت کو اس کے ظلم سے منسوب کر دینا اگرچہ سہل ہے۔ مگر تواریخ سے ثابت کرنا دشوار ہے۔

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سنہ غلط لکھ دئے گئے ہیں۔ تو خود روایات کہہ رہی ہیں کہ ان سنن میں یہ لوگ مدینہ سے نکلکر واسط آئے تھے۔ تو جغرافیہ اور تواریخ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔ کہ یہ مقام بغداد سے نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حجاج حجاز کا گورنر بھی تھا اور واسط کا بھی۔ لہٰذا یہاں بھی اس کے ستم سے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ دوسرے سنہ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ منصور عباسی نے جہاں علویوں اور بنو فاطمہ

پر ظلم وستم کیئے۔ وہاں نوایط پر بھی کیئے۔ لیکن یہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ ظلم وستم سے تنگ آ کر مظلوم لوگ اس کے پائے تخت کے پاس جاکر پناہ لیتے ہیں۔ اسی طرح کی مضحکہ خیز وہ روایت بھی ہے۔ جس میں حجاج کے ظلم کی داستان بیان کرتے ہوئے بعض مورخوں نے لکھا ہے:۔

" یہ لوگ وائط میں ایک ہی سردار سید عبداللہ کے ماتحت رہتے تھے۔ اور جب وہاں بھی ان پر ظلم ہوا تو بصرہ میں جا رہے۔ اور یہاں ان کے دوسرے سردار عبدالرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ جو سید عبداللہ کا جانشین تھا۔ تب ان لوگوں نے ہندوستان کی کی طرف ہجرت کی "

آخر بصرہ بھی تو بغداد کے ماتحت تھا۔ وہاں پناہ گزین ہونا کیسا؟ اور پھر محض عبدالرحمٰن کی وفات ہندوستان کی طرف ہجرت کی وجہ کیونکر ہوسکتی ہے؟

ان روایتوں کے بعد بعض مورخوں کی یہ روایت ہے کہ ۷۵۲ھ میں ہندوستان آئے یہ وہ سن ہے جبکہ بغداد میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ چاروں طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر ہندوستان میں خاندان تغلق کا دور حکومت تھا۔ جس کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

" اس زمانے میں عربی ممالک سے لوگ جوق در جوق آکر بادشاہ وقت کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے تھے "

ہمارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں بہت سے عرب یہاں آئے ہوں۔ اور انہیں میں چند نوایط بھی ہوں۔

اب اگر ان تمام مذکورہ روایات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ کہ نوائط کی اصلیت کیا ہے۔ شہر وائط سے اگر منسوب کیا جائے۔ تو قریش اور اولاد نائط ہونے کی

دلیل کمزور ہو جاتی ہے۔

دوسری روایت جس کا تعلق لغوی معنے (متحد و متفق رہنے والے) سے ہے وہ تو بالکل ہی کمزور ہے۔ کیونکہ پہلے تو یہی ثابت نہیں ہوتا کہ تمام قوم نوائط ایک ہی سردار کے ماتحت رہی ہے۔ خصوصاً جبکہ ان لوگوں کا مختلف اوقات میں عرب سے نکلنا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ پہلے دوسرے اور تیسرے کے درمیان خون کے اختلاف کی بھی ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ تیسرا گروہ یعنے سادات نائطہ میں حضرت شہر بانو کی اولاد ہونے سے عجمی خون بھی شامل ہوگیا ہے۔ نیز اس روایت کو ثابت کرنے کے لئے جو دلیل دی گئی۔ وہ عقلاً بھی بے حد کمزور ہے۔ یہ فرض بھی کر لیا جائے۔ کہ یہ ایک سردار کے ماتحت رہتے تھے۔ محض اس وجہ سے ہمیشہ کے لئے یہ نام ان کو دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور اس کی دوسری مثال دنیا میں شاید کہیں نہیں ملیگی۔

تیسری روایت عمائدین کوفہ ہونے کی ہے۔ اس سے صرف اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عجب نہیں کہ چند نوائط شہر کوفہ میں آئے ہوں۔ جو واسط سے قریب ہے۔

چوتھی روایت ان کی ملاحی اور تیراکی کے پیشہ سے متعلق ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا جبکہ وہ اپنے آپ کو قبیلۂ قریش اور حجاز سے بتاتے ہیں۔ تو مکہ اور مدینہ میں سمندر نہیں ہے۔

غرض جس طرح اہل نوایط کی اصلیت اور وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ اسی طرح ان کے ہندوستان میں آنے کے اوقات میں بھی شدید اختلاف ہے۔ لیکن اس قدر تو یقینی ہے۔ کہ ان کی زیادہ تر تعداد ساحل کوکن (مرہٹواڑی) پر اس وقت آکر اتری جبکہ یہاں ہندو حکومتیں قایم تھیں۔ اس کے بعد بھی جب دکن میں اسلامی سلطنتیں قایم ہوئیں۔ تو ان آنیوالوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا گیا ہے۔ کہ تجارت کے سلسلے میں عرب

عراق اور ایران کے تاجر اسلام سے پہلے اور اسلام لانے کے بعد آتے رہے۔ اسی طرح اہل نوائط بھی تجارت کے سلسلے میں ساحل عراق و یمن سے آکر ساحل کوکن پر اترے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لکھے، ماپلے اور نوائط میں کوئی امتیاز قایم نہیں کیا ہے جس طرح اہل عرب نے ملیبار اور مدورا میں یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اسی طرح ان اہل نوائط نے بھی کوکن کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو اولاد ہوی۔ وہ ملکی قانون (مارماکٹایم) کی رو سے ماں کے خاندان سے منسوب ہوگئی جیسے۔ چیدے، چکر، گھٹالے، موبخے، پھاٹے، پٹھانے وغیرہ۔ ان لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ہندی الاصل ہیں۔ کیونکہ ٹ، پ، ڑ وغیرہ خالص ہندی حروف ہیں۔ یہ حروف فارسی اور عربی زبان میں نہیں ہیں۔ لیکن جو اہل نوائط ملک میں اسلامی سلطنتوں (جیسے دکن کی بہمنی سلطنت وغیرہ) قایم ہونے کے بعد آئے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ آئے۔ اور اسلامی سلطنتوں میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہ لوگ یا تو اپنے قدیم قبائلی نام سے مشہور ہوے یا دکن کی جن شہروں میں آباد ہوے اسی شہر سے منسوب ہوئے۔ جیسے مہکر سے مہکری (مہکر۔ دکن کا ایک شہر) اور انہوں نے حیرتناک طور پر اپنی عصبیت کو محفوظ رکھا۔ ان نو وارد اہل نوائط نے دکن کی ان سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ اور ملکی سیاسیات میں اس قدر دخیل ہوگئے کہ دکن کی تاریخ ان کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

یہاں سے یہ لوگ جنوب میں بیجاپوری اور بعد میں عالمگیر کی فوجوں کے ساتھ آئے دکن کی بہمنی اور بعد میں دوسری پانچ اسلامی سلطنتوں میں انہوں نے کارہائے نمایاں کئے شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے جب جنوبی ہند فتح کیا اور ارکاٹ کی صوبہ داری قایم ہوی تو یہاں کی حکومت اہل نوائط کے ہاتھوں میں دی گئی تھی۔ اور ارکاٹ کا پہلا نائب نواب

محمد سعید عرف محمد سعادت اللہ خان تھا۔

ہندوستان آنے کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ نوائط بھی ترقی کرتے گئے۔ اور ان میں بہت سے خاندانوں کے نام بدل گئے۔ اور وہ خالص نائطہ یا نائطہ کی اولاد کے ناموں سے منسوب ہونے کے بجائے مختلف ہندی ناموں سے منسوب ہو گئے۔ مثلاً نوائط کا ایک خاندان طاہر کہلاتا ہے۔ جس کے متعلق تزک والا جاہی کا مصنف لکھتا ہے :۔

"یہ لوگ پہلے پھٹانے کہلاتے تھے (دیہنے بھنے ہوتے چنے)"

لیکن شاہ محمدؒ طاہر دکھنیؒ کے عقیدتمند ہونے کی وجہ سے شاہ موصوف نے انہیں طاہر کا نام دیدیا تھا۔ اسی کتاب میں ایک دکنی بیت اور آصف جاہ نظام الملک کا مقولہ بھی بطور سند درج ہے۔ شعر کا مضمون یہ ہے :۔

"شاہ طاہر کی وجہ سے وہ طاہر ہو ئے۔ ورنہ اصل میں وہ ومڑی کے پھٹانے ہی ہیں"۔

"کرناٹک کی بے وقوفی اسی سے ظاہر ہے کہ جو چیز کوکن میں ناپاک تھی۔ وہ کرناٹک میں طاہر (پاک) ہو گئی ہے"۔ (تزک والا جاہی)

یہ طعن اس لئے کی گئی کہ اس زمانہ میں اہل نوائط اور والا جاہی یعنے خاندان انوری) میں ان بن تھی۔ اور ارکاٹ کی صوبہ داری کے لئے ہر دو فریق لڑ رہے تھے پٹھانے کا لفظ استعمال کرکے تمام اہل نوائط پر بلا تخصیص چوٹ کی گئی ہے۔ کہ وہ مخلوط النسل ہیں

مذکورہ بالا تمام روایات اور مباحث پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو میری دانست میں نتیجہ یہی نکلتا ہے :۔

(۱) اہل نوائط حجازی یا قریشی نہیں۔ ان کو ملک حجاز سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ عراق اور

ساحل یمن کے باشندے ہیں۔

(۲) بے شک ان کا تعلق وائط سے ہو سکتا ہے جو ملک عراق میں ہے۔

(۳) ان میں جو سادات یا قریشی کہلاتے ہیں وہ صرف اس لئے ہے کہ یمن و عراق میں جب اسلام پھیلا تو یہاں کے باشندوں اور حجازی عربوں میں آپس میں شادیاں ہوئیں اور اولاد کو ماں یا باپ میں جن کا لقب زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا۔ ملقب کیا گیا۔

(۴) اب رہے ایسے نام، جیسے چکر، گھٹالے، گرڈبے، چیدے، پھاٹے، پھٹانے وغیرہ یہ خالص مرہٹی الاصل ہیں۔ عراق و یمن کے تجارتی تعلقات ساحل کوکن سے نامعلوم زمانے سے تھے وہی عراقی و یمنی اسلام لانے کے بعد بھی کوکن سے تجارت کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں یہاں بہت سے قبائل آکر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں تو اولاد ماں کے نام سے منسوب ہو گئی۔ جس طرح جنوب میں رواج ہے۔ اور دوسرا ملکی قانون (مارماکٹایم) کی روسے بھی وہ ماں سے ہی منسوب ہو سکتے تھے۔ اس لئے وہ تمام نوائط جن کے نام مرہٹی خاندانوں کے نام پر ہیں یا جن کے ناموں میں ہندی حروف پائے جاتے ہیں۔ عراقی یا یمنی اور مرہٹوں کی مخلوط نسل سے ہیں۔ آج بھی خالص مرہٹی خاندانوں میں یہی نام مروج ہیں۔

اب رہا نام نائطہ۔ اس میں شک نہیں رہا کہ اس کی معنی صرف مُلّاح کے ہیں۔ اور یہ نام اس لئے پڑ گیا کہ یہ تجارت بحر کے ذریعہ تھی۔ اور چونکہ یہ لوگ کشتیوں میں آتے تھے۔ اس لئے نوائط یعنی ملاح کہلائے گئے۔

جنوبی ہند کا محرم

محرم میں ہندو رسم و رواج اور خرافات کا دخل

جنوبی ہند میں محرم جس صورت میں منایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اس زمانہ میں ہوا۔ جبکہ دکن کی اسلامی سلطنتوں پر مغلوں نے حملے کرنا شروع کیا تھا۔ اس تاریخ میں کسی دوسری جگہ لکھا جاچکا ہے کہ تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد ہی احمدنگر، بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلوں نے حملے شروع کر دیئے تھے۔ جن کی وجہ سے یہ سلطنتیں جنوبی ہند پر پوری توجہ نہ دے سکیں۔ مغلوں سے بچاؤ کے لئے ان سلطنتوں نے مناسب سمجھا کہ مرہٹوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ دکن کی ان اسلامی سلطنتوں میں مرہٹواڑی کے قرب وجوار میں رہنے کی وجہ سے مرہٹی اثر بہت زیادہ اثر کرچکا تھا۔ اور یہاں کے مسلمان بہت سے مرہٹی رسوم اختیار کر بیٹھے تھے۔ (اور اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے حرموں میں ہندو عورتوں کو داخل کر لیا تھا۔ اور ان عورتوں نے شادی بیاہ میں اپنے اگلے رسم و رواج باقی رکھے۔ اور مسلمانوں نے بھی انہیں بے ضرر سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ یہی رسم و رواج ان کی اولاد میں بھی منتقل ہونے آئے۔ اور آج معاشرت کا جزوِ اعظم بن گئے ہیں۔)

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"جب علی عادل شاہ کے لڑکوں کی ختنہ ہوئی تو دکن کے رسم و رواج کے مطابق

لڑکوں کو سرخ لباس پہنایا گیا۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ شب گشت نکالا
گیا اور راستہ میں دوطرفہ آتش بازی ہورہی تھی۔"

فرشتہ کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب شمال سے دکن میں آئے تو اپنے قدیم اور سیدھے سادھے رسم و رواج کو لیکر آئے تھے۔ دکن کی رہائش اور مرہٹوں کے میل جول نے ان میں بہت سی رسوم پیدا کردیں۔ جو آج تک بھی اگر بڑے شہروں میں نہیں تو دیہات میں موجود ہیں۔ مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ مرہٹوں میں یہ رسم موجود ہے۔ کہ نوشاہ جب شادی کے لئے دلہن کے گھر جاتا ہے تو گھوڑے پرسوار ہوکر جاتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں کٹار ہوتی ہے۔ جس کے سرے پر لیموں لگا ہوا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اس رسم کو اختیار کرلیا۔ اب یہ رسم بہت سے بڑے شہروں میں نظر نہیں آتی ہے۔ ہلدی، مہندی اور تیل کی رسمیں جو نکاح سے پہلے مرہٹوں اور ہندوؤں میں رائج تھیں۔ مسلمانوں میں بھی رائج ہوگئیں۔ اور آج بھی ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح کنگن کی رسم ہے جو نکاح کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اور سہاگ کے لئے گلے میں کالی پوت اور چوڑیاں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

معاشرت کے اس پہلو کو نظر انداز کرکے یہاں صرف محرم سے بحث کی جاتی ہے۔

جنوبی ہند میں محرم جس طرح منایا جاتا ہے اسکی تفصیل یوں ہے :-

"محرم کا چاند نظر آتے ہی تیاری شروع کردی جاتی ہے۔ بعض مقامات میں تو پہلی محرم کو ہی اور بعض مقامات پر تیسری اور چوتھی کو علم کے وہ صندوق جس میں سال بھر علم بند رکھے جاتے ہیں نکالے جاتے ہیں۔ شہر میں ان کا گشت ہوتا ہے۔ کہیں گھوڑوں پر پھولوں کی چادریں ڈال کر باجوں کے ساتھ کوئی لڑکا اس صندوق کو لیکر بیٹھتا ہے اور کہیں سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اس گشت کے بعد انہیں مقام مقررہ پر لاکر

بٹھایا جاتا ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں شب کو پھر یہ علم اٹھاتے اور گشت کراتے
ہیں۔ ان کے آگے آگے مجاور عود وان اور مور کے پروں کا مورچل لئے ہوئے چلتے
ہیں۔ اور ایسے ہی موقعوں پر یہ علم اٹھانے والے انگاروں کے آلاؤں میں سے بھی
گذرتے ہیں۔ جس جگہ علم رکھے جاتے ہیں اسی جگہ کے قریب ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا
جاتا ہے۔ جو دو ہاتھ سے چار چھ ہاتھ لمبا اور قریباً ایک آدھ قدم عمیق ہوتا ہے۔
اس گڑھے میں لکڑیاں جلا کر آگ بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب یہ آگ تیار ہو
جاتی ہے تو ان انگاروں پر سے جو بجھنے کے قریب ہوتے ہیں علم اٹھانے والے
دوڑ دوڑ کر گذرتے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر علم اور تعزیئے ساتھ ساتھ بٹھا
رکھے جاتے ہیں۔ اور تعزیہ اکثر نویں کی شب میں گشت کے لئے نکلتے ہیں۔ اور لوگ
ان پر عبیر، پھول وغیرہ پھینکتے ہیں۔ ان علموں اور تعزیوں سے منتیں مانگی جاتی
ہیں۔ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ اور عموماً جب علموں سے منتیں مانگی جاتی
ہیں تو منت پوری ہونے پر دوسرے سال سونے یا چاندی کے چھوٹے چھوٹے
علم نذر دئے جاتے ہیں۔

تعزئے اور علموں کے علاوہ جنوبی ہند کے محرم میں جو خاص باتیں ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) محرم میں گروہ بنتے ہیں۔

(۲) شیر، ریچھ، بندر اور دیوانوں وغیرہ کے سوانگ بھرے جاتے ہیں۔

گروہ میں عموماً پندرہ سے بیس آدمیوں یا لڑکوں کی تعداد ہوتی ہے۔ گروہوں کی کئی
قسمیں ہیں۔

بھانڈ، نانک سوٹے، سندی اور زنگی وغیرہ۔

بھانڈ میں صرف تالیاں بجاکر نظمیں پڑھی جاتی اور نقلیں کی جاتی ہیں۔ ہر گروہ اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتا ہے۔ جوان کے عماموں سے معلوم ہوتا ہے۔ گلے میں کھنٹے رہتے ہیں۔ علاوہ سر گروہ کے گروہ میں ایک بادشاہ ایک وزیر ضرور ہوتے ہیں۔ جو اپنا مخصوص پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مسخرا بھی ہوتا ہے۔ راستوں میں بھانڈ صرف تالیاں بجاتے ہوئے محرم کی مناسبت سے کوئی غم افزا نظم پڑھتے ہوئے۔ یا حریف گروہ کو مغلظ گالیاں نظم میں دیتے ہوئے جاتے ہیں۔ ہر شاعر اپنی گروہ کا نام علٰحدہ رکھتا ہے۔ جیسے شاہی نقال، شاہی فسانہ گو، آزاد ظریف، اکبری بھانڈ وغیرہ۔ ان میں اکثر مقابلہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ مقابلے اکثر راتوں کو کسی جگہ ہوتے ہیں۔ جس کو چوک کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر دو گروہ نقلیں کر کر یا نظمیں سنا کر داد حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح جھنجنے والے یعنی سدی، زنگی وغیرہ ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں جھنجنا ہوتا ہے۔ عموماً یہ شلوار اور ترکی ٹوپی پہنتے اور گلے میں کھنٹے ڈالے ہوئے رہتے ہیں۔ اور پیروں میں گھونگرو بھی باندھتے ہیں۔ ان میں بھانڈوں کے مانند مقابلے بھی ہوتے ہیں۔

نانک سوٹے۔ ان کا لباس بھی قریب قریب بھانڈ کے لباس جیسا ہوتا ہے۔ لیکن بعض جماعتیں پورا لباس کسی خاص رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ انکے گلوں میں بھی کھنٹے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں سوٹے۔ جنہیں نظمیں پڑھتے وقت بجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ نانک سوٹے والے دو گروہ میں منقسم ہیں۔

(۱) مکھنڈ (۲) پاکھنڈ (یہ ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں)

پھر شاعر اپنی اپنی مکھنڈ یا پاکھنڈ کو علیحدہ نام دیتے ہیں۔ جیسے الف والے، نکتہ والے، ترنم، باتر بھوگی، زنار وغیرہ ان میں بھی مقابلے ہوا کرتے ہیں۔

گروہوں کے بعد شیر ہیں۔ جو محرم کا جزوِ اعظم ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ شیر کا سوانگ بھرنے والا مختلف رنگوں سے جو شیر کے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔ اپنے پورے جسم اور چہرے کو رنگ لیتا ہے یہ رنگنے والے علیحدہ ہوتے ہیں جو اجرت پر رنگ دیتے ہیں۔ نقش و نگار اور پٹے اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح اصلی جنگلی شیر پر ہوتے ہیں۔ رنگ آمیزی اور نقش و نگار کے لحاظ سے بعض بعض تو کمال کر دیتے ہیں۔ سر پر اس قسم کی کپڑے کی ٹوپی جس میں کان لگے ہوئے رہتے ہیں۔ اوڑھتے ہیں۔ شیر کو پیچھے کوئی شخص رسی یا زنجیر سے تھامے ہوئے رہتا ہے۔ اور دم کی جگہ رنگین کاغذوں کا ایک جھنڈا بانس پر لگا رہتا ہے۔ جس کو ایک اور شخص شیر کے پیچھے تھامے ہوئے چلتا ہے۔

شیر کے آگے تھوڑے فاصلہ پر عموماً باجے والے رہتے ہیں۔ جو زور زور سے باجے بجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کے پیچھے لکڑی کا کرتب دکھانے والے پھینک کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ شیر ان کے بعد قدم ڈالتا، کودتا ہوا نکلتا ہے۔ کبھی کبھی شیر جب اپنے شناساؤں کے گھر پر سے نکلتا ہے۔ تو اس کے آگے بکرا چھوڑا جاتا ہے۔ جس کو وہ دانتوں سے اٹھا کر چھوڑ دیتا ہے اور یہ شیر کا حق ہے۔

شیروں کے پیچھے ایک بیل گاڑی ہوتی ہے۔ جس کی شکل فیل نما ہوتی ہے۔ یہ گاڑی شیر کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اور بچے اس پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایک پنجرہ نما گاڑی ہوتی ہے۔ جس میں بڑے اور چھوٹے پانچ چھ شیر ہوتے ہیں۔ جو باری باری سے اتر کر چلتے ہیں۔

ریچھ، یہ بیچارہ تیل سے لت پت ہو کر روئی یا اون کے پرزے تمام جسم پر تھوپ کر نکلتا ہے۔ اسی طرح بندر بھی بنتے ہیں۔ دیوانے سچ مچ دیوانے دکھائی دیتے ہیں۔ پریشان ہو

کپڑے پھٹے ہوئے۔ کیچڑ میں لت پت، ہاتھ میں پانی کا ایک مٹکا۔ جس سے لوگوں پر پانی ڈالتے ہوئے بھاگتے رہتے ہیں۔

دوسرے معمولی سوانگ جو ہیں ان میں جلالی قابل الذکر ہے۔ یہ سر سے پیر تک تیل اور سیاہی میں ڈوبا ہوا رہتا ہے۔ کمر پر ایک موٹا سا تھیلا یا اور کوئی چیز رہتی ہے۔ جس سے پیچھے والا بید سے مارتا رہتا ہے۔ اور یہ چیخیں مار مار کر لوگوں سے پیسے طلب کرتا ہے۔

پچپے شاہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک تختہ اور ناریل کا چپہ (ناریل کا پوست) رہتا ہے۔ جس سے وہ تختہ پر بجاتا ہوا اکثر لوگوں کو گالیاں سناتا رہتا ہے۔

ہجڑے موسل وغیرہ لیکر دھان کوٹتے ہوئے نکلتے ہیں۔

غرض کھانے اور کمانے کے لئے اور بھی مختلف سوانگ بھرے جاتے ہیں۔ جیسا دولہ اور دلہن وغیرہ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سوانگوں کی تاریخی حقیقت کیا ہے۔ جب ان سوانگ بھرنے والوں سے پوچھا جاتا ہے تو صرف دو جواب ملتے ہیں۔

(۱) یہ کہ ہمارے بزرگوں نے بھی یہی کیا تھا اور ہم بھی یہی کر رہے ہیں۔

(۲) دوسرا یہ کہ میدان شہادت میں یزید کی فوجیوں نے فتح سے سرشار ہو کر اس قسم کے سوانگ بھرے تھے۔

جہاں تک مورخین نے پتہ لگایا ہے یہ علم عہد عباسیہ کے آخری زمانہ کی یادگار ہے۔ جب بغداد میں عجمی رسوخ بہت زوروں پر تھا۔ اس علم کے متعلق جس سے ہماری مراد پنجہ کا نشان ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ عہد عباسیہ میں اس کو شاہی پھریرے کی بانس یا لکڑی پر بنا کر لگایا گیا۔ اور اس سے مراد پنجتن کی لیجاتی تھی۔ جن کے سایہ میں عباسی پھریرا لہرا رہا ہے۔ چونکہ یہ شاہی نشان تھا۔ فوج اس

پھریرے کو سلامی دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ پھریرے کی بجائے آج کل تو پنجہ کی بانسوں کو بنارسی زرین اور ریشمی ساڑھیوں سے ملبوس کر دیا جاتا ہے۔ اور جو شاہی نشان اس وقت تنظیم کے لئے تھا پنجتن کے نام سے اس کی پرستش کی جانے لگی۔ اور منتیں مانی جانے لگیں۔

ضلع اننت پور و بلاری میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان علموں کے ذریعہ لوگ اپنا قرض بھی وصول کرتے ہیں۔ جب قرضہ دینے والا دیکھتا ہے کہ قرضہ وصول نہیں ہوتا۔ تو وہ اس جگہ آ کر جہاں علم رکھے جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر میرا قرضہ وصول کر کے دو تو میں اتنی رقم نذر چڑھاؤنگا۔ علم جس وقت اٹھائے جاتے ہیں تو علم اٹھانے والے علم لیکر قرضدار کے گھر جاتے ہیں اور اس وقت تک نہیں ٹلتے۔ جب تک قرض وصول نہیں ہو جاتا۔

گروہ ان کا رواج صرف دکن سے ہوا۔ مرہٹوں میں نامعلوم زمانے سے ان کے ہولی کے تہوار میں مختلف نام کے گروہ بنتے تھے۔ اور ان کے شاعر انہیں اپنی قوم کی اگلی تاریخ یاد دلانے کے لئے انہیں نظمیں لکھ کر دیتے تھے۔ جن میں ان لوگوں کو جوش دلایا جاتا تھا کہ اپنے اسلاف کے مانند بہادر بنیں۔

مسلمانوں نے یہ رسم مرہٹوں سے ہی لی۔ اور ان میں بھی گروہ بننے لگے۔ شروع شروع میں یہ گروہ صرف غم حسین اور واقعات کربلا کے متعلق نظمیں پڑھکر سناتے تھے۔ لیکن شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ۔ اور لوگوں سے واہ واہ اور سرپرستی حاصل کرنے کے شوق نے نقلیں اور ہزلیات بھی پیدا کر دیئے۔ اور اس حد تک بڑھ گئے کہ سچ مچ بھانڈ بن گئے۔

اب بھانڈ پر غور کیا جائے تو یہ لفظ بھاٹ کے ہم معنی ہے۔ اور خاص ہندی لفظ ہے اور جو گروہ بنتے ہیں ان کے ناموں پر غور کیا جائے تو بہت سے نام ہندی اور مرہٹی الاصل ہیں۔ جیسے مکھنڈ۔ ایک ہندی لفظ ہے جس کے معنی ضدی اور ہٹ کرنے والے کے ہیں۔ اور

اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جس کے افراد اپنا گذارہ دنگا، فساد یا عورتوں کی ناجائز کمائی پر کرتے ہیں۔

پاکھنڈ: ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنے دغابازوں اور منافقوں کی جماعت ہے۔

نانک سوٹے۔ نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ بابا نانک جو سکھ مذہب کے مشہور گرو گذرے ہیں۔ ان سے تعلق رکھتا ہے۔

تربھوگی۔ یہ بھی دکن کے چوروں کی ایک جماعت کا نام ہے۔ جو لوگوں کے گلے کاٹتے اور انہیں لوٹ لیتے تھے۔ جان شکسپیر نے بھوگی کے معنے دغابازی، مکر اور فریب کے دئے ہیں۔ اس جماعت کا نصب العین ہمیشہ خوش رہنا ہے۔ خواہ کسی حیلہ سے ہو۔

سدی، زنگی، عرب، ترکی اور نقال وغیرہ محتاج تشریح نہیں۔

شیر۔ جسم رنگنے اور طرح طرح کے سوانگ بھرنے کی رسم ڈریویڈین قوموں میں نامعلوم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ دسہرہ کے تہوار میں نیچ ذات کی قومیں اپنے بزرگوں کی رسم پر شیر، ریچھ، بندر وغیرہ کا سوانگ بھرتے ہیں۔ انکی مذہبی روایات اور کہانیوں کو، جو عموماً مسلمان گھروں میں بھی رائج ہیں۔ دیکھا جائے تو ہر کہانی کا موضوع ایک راکشش ہوتا ہے۔ جو لوگوں کو ستاتا، بچوں اور عموماً شہزادیوں کو اٹھا لیجاتا ہے۔ اس پر غالب آنے کیلئے شہزادے یا دوسرے لوگ کوئی نہ کوئی سوانگ بھر کر اس پر حملہ کرتے اور فتح پاتے تھے۔ ڈریویڈین قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھنے کیلئے ہر سال دسہرہ کے تہوار پر اس طرح کا سوانگ بھرتی ہے۔

باقی دوسرے سوانگ جو ہیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ پیدا ہوتے چلے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں نے یہ تمام امور کس طرح اختیار کئے۔ اسی تاریخ میں بتلایا گیا ہے۔ کہ دکن کے مسلمانوں میں مرہٹی طرز معاشرت اور رسوم دن بدن نفوذ

کر رہے تھے۔ مغلوں نے جب دکن پر حملے کئے تو یہاں کی سلطنتیں اپنے آپ کو ملکی کہتی ہوئی مرہٹوں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ مل گئیں۔ اور ان کے ہر تہوار میں شریک ہونے لگیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ محرم جو صرف غم حسین کی مجلسوں تک محدود تھا۔ اب اس میں مرہٹوں کی تقلید میں گروہ شامل ہو گئے۔ اور شاعروں نے موشگافی کرتے کرتے ان گروہوں کو اس صورت میں لے آئے جس طرح اس زمانہ میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہی مسلمان جب جنوبی ہند میں آئے تو ڈراویڈین قوموں کی رسمیں بھی اختیار کر لیں یا بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ سلطنتِ وقت کو خوش کرنے کیلئے جیسے مرہٹے محرم میں شامل ہونے لگے۔ ویسے ہی جنوب میں ڈراویڈین قومیں بھی شامل ہو گئیں۔ اسی لئے دیکھا جائے گا کہ مسلمانوں سے بڑھکر مرہٹے اور نیچ ذات کے ہندو محرم مناتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دکن کی تینوں اسلامی سلطنتیں احمدنگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حاکم شیعہ عقاید کے تھے۔ انہوں نے مجالس غم حسین، تعزیئے اور علم کا رواج دیا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ رواج آئندہ چلکر یہ صورت اختیار کر لیگا۔ جس صورت میں کہ آج مروّج ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان سلطنتوں کے رئیسوں نے بوجہ شیعہ ہونے کے علم کو نہایت فراخدلی سے رواج دیا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے گاؤں ان علموں کے خرچ کیلئے وقف تھے اور اب بھی دیہات میں جو جاگیریں نظر آتی ہیں۔ وہ تمام کی تمام بیجاپوری حکام کی دی ہوئی ہیں۔

اس طرح کا محرم صرف ان مقامات میں رائج ہے۔ جو کبھی گولکنڈہ، بیجاپور اور احمدنگر کے ماتحت تھے۔ اس لحاظ سے اگر جغرافی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اس قسم کا محرم مرہٹواڑی سے لیکر جنوب میں ترچناپلی تک مروج ہے۔ جنوب کا وہ علاقہ جو ملیبار کہا جاتا ہے یہاں محرم بالکل نہیں منایا جاتا۔ ان علاقوں میں جہاں محرم رائج ہے۔ اور خصوصاً کڑپہ،

کرنول، بلاری، اننت پور، میسورا ور مرہٹواڑی میں جاکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیہات میں مسجد تو نہ ملیگی۔ لیکن کم از کم ایک چبوترہ ضرور ملیگا۔ جس کو عاشور خانہ کہا جاتا ہے اور جاگیریں اس عاشور خانہ کے لیۓ وقف ہیں۔ ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ گزیٹیریں دیکھے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے کس فراخدلی سے یہ جاگیریں دی تھیں اور کس طرح ہندو قوم محرم مناتی ہے۔

اننت پور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف (ڈبلیو فرانسس لکھتا ہے:۔

"گرگو (اننت پور میں ایک قصبہ ہے) اپنے محرم کے لیۓ نہایت مشہور ہے۔ جس طرح اس ضلع کے تمام دوسرے مقامات میں ہندو قوم محرم زیادہ مناتی ہے۔ یہاں بھی محرم بالکل اسی قوم کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان اس میں بالکل کم حصہ لیتے ہیں۔ محرم کے ایام میں ہزارہا کی تعداد میں باہر کے مقامات سے ہندو یہاں آتے ہیں۔ گاؤں کا پٹیل (پٹواری) محرم چاوڑی میں بیٹھ کر آنے والوں سے ٹن کے بند صندوقچوں میں نذرانہ وصول کرتا ہے۔ یہ تمام نذرانے نہایت امانت داری سے ایک جگہ جمع کیۓ جاتے ہیں۔ اور اسی رقم سے محرم کا خرچ پورا کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعجب خیز وہ نظارہ ہے۔ جو نویں اور گیارہویں محرم کے دن دیکھا جاتا ہے۔ اس دن لوگ علم لیکر آگ کے الاؤ میں سے چلتے ہیں۔ سب سے پہلے حجام باجہ بجاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے بعد تماشائی بھی اسی آگ میں سے گذرتے ہیں۔"

اس طرح مشترکہ محرم منانے کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا وہ مسلمانوں کی موجودہ طرز معاشرت اور انکے عقائد سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اننت پور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھتا ہے :-

"گو اگلے زمانے میں مسلمان اور ہندو مذہبًا ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ لیکن اب اکثر مسلمانوں نے ہندوؤں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ بہت سے دیہات میں کوئیں دونوں کے لئے مشترک ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شامل ہوتے ہیں۔ ہندو قوم مسلمان فقیروں اور ان کی درگاہوں کا ادب کرتی ہے۔ نذرانے چڑھاتی ہے اور مسلمان مناور میں ناریل کا نذرانہ چڑھاتے اور پھوڑتے ہیں۔ دونوں قوموں کا یہ اتحاد محرم کے دنوں میں اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے۔ اکثر مقامات پر محرم کا تمام انتظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک مسلمان ضرور رہتا ہے۔ جو رسوم بجا لاتا ہے۔ دونوں قوموں کے اس اتحاد نے مسلمانوں میں بھی ایسے فرقے پیدا کر دیئے ہیں۔ جو مسلمان تو کہلاتے ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ رولا کے علاقے میں لمباڑی قوم کے مذہبی راہ نما مسلمان ہیں۔ لیکن یہ دوسرے مسلمانوں کو اپنی بیٹیاں شادی میں نہیں دیتے۔ اور نہ انکی بیٹیوں سے شادی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح مڈکسرا تعلق میں منڈ وتلکر مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جو دوسرے مسلمانوں سے شادی بیاہ نہیں کرتا۔"

(نوٹ :- اس تاریخ کے مصنف نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قریبًا پچیس سال تک ان اضلاع میں گذارا ہے۔ تعجب سے دیکھا گیا کہ نداف یعنے پھلاں جو روئی دھنکتے ہیں۔ انہیں دوسرے مسلمان مسجدوں میں آنے نہیں دیتے۔ ۔۔۔ نہ یہ لوگ سوائے برادری کے دوسرے مسلمانوں سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔)

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر دیہات میں محرم کے ایام کو کھینچکر بیس بیس، چالیس چالیس دن تک اسی طرح تماشہ کیا جاتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ محرم کے ختم ہونے کے بعد ایک اور محرم

چھوٹے پیمانہ پر بچوں کے لئے دس دن تک منایا جاتا ہے اور کوڑی پیر کا محرم کہا جاتا ہے۔

محرم کو دیکھتے ہوئے صرف یہی دو نتیجے نکلتے ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ مسلمان سلاطین بیجاپور، احمدنگر اور گولکنڈہ نے اپنے سیاسی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ گوارا کر لیا کہ مرہٹے اور ہندو بھی محرم جس چاہیں شامل ہو جائیں۔

(۲) حاکم وقت کی خوشنودی اور انکا تتبع کرنے کے لئے ہندوؤں اور مرہٹوں نے خود بخود محرم اختیار کر لیا۔ اور اپنے رسم ورواج اس میں داخل کر دئے۔ جس کی وجہ سے بعد کی آنے والی نسلوں نے بھی انہیں محرم کا جزو سمجھ کر اختیار کر لیا۔

اب صرف انگاروں پر چلنے کے رسم کی تشریح باقی رہگئی ہے۔ جس کو محرم منانے والے مسلمان علموں کی سچائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ آگ پر چلنے کی رسم بھی ہندوستان کی لی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں نامعلوم زمانہ سے انگاروں پر چلنے کی رسم مختلف قوموں میں عموماً اور ڈریویڈین قوموں میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔

ٹرائبس انڈ کیاسٹس آف بنگال کا مصنف سر ایچ ایچ رسلی نے لکھا ہے :۔

"صوبۂ بہار میں ایک ہندو قبیلہ دوسادھ نامی ہے۔ اس قبیلہ کے دیوتا کا نام راہو ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سانپ بنکر سورج اور چاند کو نگل جاتا ہے۔ بیماریوں کو دور کرنے یا کسی منت کے برآنے پر راہو کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر بھگت جو یہ پوجا کرتے ہیں۔ انگاروں پر سے چلتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دہکتی ہوئی آگ کے درمیان ایک سیڑھی رکھی جاتی ہے۔ بھگت آگ میں سے گذر کر سیڑھی پر چڑھتا ہے۔ جس کے پایدان (Rounds) ان تلواروں کے بنے ہوئے ہوتے

ہیں۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد لوگ کھانا کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ آگ پر
چلنے کی یہ رسم قمری ماہ کی چوتھی، نویں یا چودھویں کو ادا کی جاتی ہے۔"

جس طرح بنگال میں یہ رسم جاری ہے۔ اسی طرح ضلع بہار میں بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے
جنوبی ہند میں آگ پر چلنے کی یہ رسم نامعلوم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ اور ڈریوڈین قوم میں
آج بھی اس کو منایا جاتا ہے۔

آر۔ین بیلی (   ) نامی ایک مصنف لکھتا ہے :-

"انگاروں پر چلنے کی رسم میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں۔ وہ جنوبی ہند سے تعلق
رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ماری اماں کا جو کالی کی مترادف ہے پوجا کرتے ہیں۔ ان کی
یہ پوجا دس تک ہوتی ہے۔ انگاروں پر چلنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی
مراد کے برآنے کے لئے عہد کرلیتے ہیں۔ لوگ انگاروں کی اس راکھ کو تبرک سمجھ
کر لیجاتے ہیں۔"

میتھک سوسائیٹی جرنل (Mythic Society Journal) مورخہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں
ایک مضمون نگار لکھتا ہے :-

"مدراس کے قریب آلندور کے ایک مندر میں دروپدی کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ
پوجا دس دن تک کی جاتی ہے۔ اور دسویں دن انگاروں پر چلنے کی رسم ادا
کی جاتی ہے۔ ایک لمبا گڑھا کھودا جاتا ہے۔ جس میں لکڑیاں جلا کر انگارے
بنالئے جاتے ہیں۔ ان انگاروں کو گڑھے میں ہر چہار طرف پھیلا دیا جاتا ہے
اور ان پر کچھ پانی چھڑکتے ہیں۔ جو لوگ دروپدی سے کچھ منت رکھتے ہیں۔ ان
انگاروں پر چلتے ہیں۔ بعد میں لوگ اس راکھ کو تبرک سمجھ کر لے جاتے ہیں۔"

کیاسٹس انڈ ٹرائبس آف سدرن انڈیا میں لکھا ہے :-

"نیلگری کی وحشی قوموں میں بھی سال میں ایک بار دس دن تک انگاروں میں چلنے کی رسم پائی جاتی ہے۔"

ان اضلاع کے گزیٹیرس کے انگریز مورخ حیرت سے لکھتے ہیں کہ نہیں معلوم مسلمانوں نے اس رسم کو کس وجہ سے اختیار کیا۔

بہر طور اس تمام تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ محرم جو اگلے دنوں میں صرف مجالس غم تک محدود تھا۔ اس میں مرہٹواڑی اور جنوبی ہند کی تمام رسمیں یکے بعد دیگرے شامل ہو کر اب اس حالت میں رہگیا ہے۔ جس حالت میں آج نظر آتا ہے۔

مذکورۂ بالا تحریرا ور روایتوں کو جو اس میں بطور سند دئے گئے ہیں۔ غور سے مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند کے محرم اور اس کے رسم و رواج اور دس دن تک کے کھیل تماشے اور انگاروں پر چلنے کی رسم کی وجوہات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کہ کس طرح ہندو مسلم کی ملی جلی معاشرت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ اور اب یہ فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس کو واقعہ شہادت امام حسین علیہ السلام سے کس قدر تعلق ہے۔

ضمیمہ

رزم نامہ تالیکوٹہ

(رونڈہراس کی کتاب "تاریخ خاندان اراویڈو" سے رزم نامہ تالیکوٹہ کے آخری تین قطعے یہاں دئے جاتے ہیں۔ جن میں حسین نظام شاہ سلطان احمدنگر کے کسی درباری شاعر نے اس فیصلہ کن جنگ کا حال لکھا ہے۔ کسی اور جگہ اس جنگ کی تفصیل میں تبلایا گیا ہے کہ یہ حسین نظام شاہ ہی کی استقامت و جوانمردی کا نتیجہ تھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی)

لشکر آراستن حسین شاہ بعزم غزائے کافر و روان شدن بجانب بیجانگر

حسین شاہ آں بادشاہ دلیر — کہ پیشش بود ہمچو روباہ شیر
سر سرفرازاں و گردن کشاں — کہ بروے کند آفریں انس و جاں
خداوند شمشیر و تخت و کلاہ — چو تابندہ خورشید با عز و جاہ
بآں حشمت و جاہ و فرزانگی — بآں ہیبت و زور و مردانگی
نبود و نباید کسے در جہاں — جہاندار و فیروز باعز و شاں
چناں داشت شمشیر و بازوے زور — کزو در جہاں بود غوغا و شور
بدل غیر ازیں آرزوئے نداشت — جز ایں میل خاطر بسوئے نداشت
کہ با کافر راؤ بیجانگر — کند جنگ و کوتہ کند شور و شر
کہ از دست آں کافر نابکار — مسلماں بسے گشتہ بودند زار
ہمی خواست دایم ز لطف خدا — کہ اورا میسر شود ایں غزا

روان گشته القصه از بهر جنگ — سوئے ملک بیجانگر بید رنگ
بیاراست لشکر بعزم نبرد — بدان سان که کس جمع لشکر نکرد

جنگ کردن حسین شاه با رامراج که بادشاه بیجانگر بود و فتح کردن

سحرگاه چون مرغ بگشاد بال — تهی شد دماغ سپهر از خیال
بغول سیه بانگ بر زد خروس، — درآمد به غریدن آواز کوس،
چو کافر خبر یافت، کامد سپاه — جهان گشت بر چشم کافر سیاه
یکے لشکر انگیخت از تیر و تیغ — فروزنده برقش برآمد به میغ
ز نعل ستوران پولاد میخ — بجنبش درآمد زمین هم ز بیخ
زمین نعره کامد برون از کمین — فرو اوفتاد آسمان بر زمین
ز شوریدن بانگ چون رستخیز — بوحش بیابان درآمد گریز
چو بر جنگ شد ساخته سازشان — گریزان شده دیو از آوازشان
دو ابر از دو سو در خروش آمدند — دو دریائے آتش بجوش آمدند
چنان آمد از هر دو لشکر غریو — کزان هول دیوانه شد مغز دیو
چو لشکر بلشکر درآورد روئے — مبارز برون آمد از هر دو سوی
درآمد به غریدن ابر سیاه — ز ماهی تف تیغ بر شد بماه
ز پولیه که پی بر زمین میفشرد — در اندام گاو استخوان گشت خرد
روان رو زنان تیر فولادسای — در اندام شیران فولادخای
ترنگ کمانهائے بازوشکن — بسے خلق را برده از خویشتن
صف ژنده پیلان هیجا شکوه — میان سپاه آمده کوه کوه

مژه چوں سناں چشمہا چوں عقیق　　زخم طوم تا وهم در آ

زبس ژنده پیلاں بصف اندروں　　شد از پائے پیلاں زمـ

غریو دولشکر گذشت از فلک　　بداں ساں که کر گشت گ

ولے کشته کافراں بیشتر　　دل کفر ز اسلام

حسین شاه آں بادشاه جہاں　　کز و در حذر بوده

بیاراست بازار ناورد را　　برانگیخت آب ر

حمایل بکے تیغ هندی چو آب　　بگوهر تر از چشمهٔ

ز فولاد هندی کله بر سرش　　که گوهر بر شک آمـ

نشسته بر بارگی کوه وش　　بخوشحالی و تندی

بشمشیر کیں چوں در آورد دست　　ببازار کافر در آمد

دل از جا سے شد کافر شوم را　　چو از کورهٔ آتش

حسین شاه را فتح شد رهنمون　　بزنهار خواهی در

چو خصماں گرفتار خواری شدند　　و میداں کافر بزار

بزخم سناں کافر رام راج　　سرش بر زمیں خورد ا

ز افتادن کافر از زخم تیز　　تو گفتی بر آمد یکے

بیک کس اشارت چو آں شاه کرد　　سرش را ببرید و بـ

زبس کشته بر کشته مردان مرد　　شده راه کشته بر

زبس غارت آوردن از بهر شاه　　غنیمت نگنجید در

چو شاه آں متاع گراں سنج دید　　چو دریا یکے دشت

شد از فتح کفار و تاراج گنج | خوش آن و بر آسوده از راه و رنج
بعبرت دران کشتگان بنگریست | بخندید پیدا و پنهان گریست
که چندین خلائق درین دار و گیر | چرا کشت باید بشمشیر و تیر
گنه گر بر ایشان نهم نارواست | وراز خود خطا بینم این هم خطاست
فلک را سر انداختن شد سرشت | نشاید کشیدن سر از سرنوشت
که داند که این خاک انگیخته | بخون چه دلهاست آمیخته
بیا ساقی از می مرا مست کن | چون می دروهی نقل در دست کن
ازان مے که دل را بدان خوش کنم | بدو زخ ورش طلق آتش کنم

باز آمدن حسین شاه از غزای کافر و فتح بیجانگر بشهر احمد نگر ورحلت کردن او از دار الفنا بدار البقا

گذارندۂ داستان دری | چنین داد نظم گذارش گری
که چون فرخی شاه را گشت جفت | چو گلنار خندید و چون گل شگفت
در گنج بکشاد بر گنج خواه | توانگر شد از گنج و گوهر سپاه
غنی کرد گردن کشان را به گنج | ز گوهر کشی لشکر آمد به رنج
بفر سود تا کوس بنواختند | وز انجا سوئے ملک خود تاختند
دوار و زنان نای زرین زدند | سراپرده بر پشت پروین زدند
شهنشه بزد کوس و لشکر براند | سر رایت خود بگردون رساند
پس آنگه روان شد بفتح و ظفر | بریده سر راو بیجا نگر،

سوے ملکت خویش و آرامگاہ — کہ بد شہر احمد نگر تخت گاہ

چنیں شاہ آں شاہ فیروز مند — برا فراختہ سر بچرخ بلند

نشستہ بر مرکب خاص خویش — خرامندہ بر اسپ رقاص خویش

بمرکب رواں لشکر از ہر کنار

بچنداں کہ داند کس آنرا شمار

ضمیمہ

سرا

تاریخ میں ہر جگہ سرا کا نام آیا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب جس وقت دکن کا وایسرائے تھا۔ تو اس نے بیجاپور کی فوجوں کو حکم دیا تھا کہ جنوبی ہند پر حملہ آور ہوں۔ بیجاپوری جنرل رن دولہ خاں نے ۱۶۳۸ء میں جنوب پر فوج کشی کی۔ اور تمام بالا گھاٹ کا علاقہ میسور سے جنوب تک فتح کر لیا گیا۔ اور ایک صوبہ بالا گھاٹ بیجاپور کے نام سے بنایا گیا۔ اس صوبہ کا پہلا گورنر رن دولہ خاں تھا۔ اس نے اپنے صدر مقام کے لئے پہلے بنگلور کو اور بعد میں سرا کو منتخب کیا۔ (بنگلور میں رن دولہ خاں کی ایک یادگار باقی ہے۔ جس کو ابھی تک صوبہ دار کا چھتر کہا جاتا ہے۔ یہ بیسونت پور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے)

سرا بنگلور سے شمال کی جانب ۷۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسکی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رنگپا نایک حاکم رتن گیری شکار کے لئے نکلا تھا۔ جس وقت اس میدان میں پہونچا۔ جہاں اب سرا واقع ہے تو

اس نے یہاں ایک خرگوش دیکھا۔ اس نے خرگوش پر شکاری کتے کو چھوڑا۔ خرگوش بجائے بھاگنے کے کتے سے لڑنے لگا۔ رنگپا نایک نے سمجھا کہ اس زمین میں بہادری کی خاصیت ہے۔ چنانچہ اس نے قلعہ اور شہر بنانے کا حکم دیا۔ یہ ابھی تعمیر ہو رہے تھے کہ رن دولہ خاں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس کو بھی آب و ہوا کے لحاظ سے یہ جگہ نہایت پسند آئی۔ یہاں سے سرا کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ سرا پر ۱۶۳۸ء میں قبضہ ہوا۔ رن دولہ خاں کے بعد ۱۶۸۷ء تک سرا کے اور پانچ گورنر ہوئے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں :-

(۱) افضل خان (۲) ملک ریحان

(۳) عبدالحلیم خان (۴) سید مفتاح

(۵) نجیب خاں احراری۔ رستم جنگ

۱۶۸۷ء میں جب شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے بیجاپور کا خاتمہ کر دیا تو سرا بھی مغلیہ سلطنت کے ماتحت آگیا۔ عالمگیر کی جانب سے پہلا گورنر قاسم خاں مقرر ہوا۔ جس کو شہنشاہ نے کل جنوبی ہند کے فتح کرنے کا حکم دیا۔ قاسم خاں کی فتوحات مشرق و جنوب میں اس قدر وسیع ہوئیں کہ تمام مشرقی میدانی علاقے کو جسے ساحل کورومنڈل کہا جاتا ہے۔ سرا سے علحدہ ایک اور گورنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ صدر مقام پہلے جنجی اور بعد میں ارکاٹ قرار پایا۔

مغلیہ قبضہ کے بعد سرا کے ماتحت یہ سات پرگنے دئے گئے۔ جہاں ایک ایک نائب گورنر تھا۔

(۱) بسواپٹن (۲) بودی ہال (۳) سرا (۴) پگگنڈہ (۵) بڑا بالاپور (۶)

ہوسکوٹہ (۷) کولار۔

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل ریاستیں بھی سرا کے ماتحت تھیں۔

(۱) ہرپن ہلی (۲) کنداپی (۳) آنئے گندی (وجیانگر) (۴) بدنور (۵) چتل ورگ (۶) میسور (۷) ماگڑی۔

یہ ریاستیں اپنا اپنا سالانہ خراج سرا کو بھیجدیتی تھیں۔

"قاسم خاں کے بعد ذوالفقار خاں سرا کا گورنر مقرر ہوا۔ اسکے عہد میں ہندو ریاستوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس نے از سر نو فوج کشی کر کے جنوب کو کامل طور پر فتح کر لیا۔ اسی سلسلہ میں جب میسور کے راجہ کو یہ معلوم ہوا کہ ذوالفقار خاں سرنگاپٹم (میسور) پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اس نے شہنشاہ عالمگیر کو تحفے تحائف بھیجکر از سر نو حلف وفاداری کی تجدید کی۔

سرا اس وقت اپنے پورے عروج پر تھا۔ بیجاپوری مسلمانوں کو اس پر قبضہ کئے ہوئے پچاس سال گذر چکے تھے۔ یہ جنوب میں بیجاپوری تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت یہاں پچاس ہزار گھرانے اور نوّے مساجد آباد تھیں۔

آتش خاں کے بعد سرا کے اور بیسے گورنر (صوبیدار) مقرر ہوئے۔ جن کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

(۱) قاسم خاں (۲) آتش خاں (۳) معمور خاں کوڑاڑہ (۴) چین قلیچ خاں (۵) خداوند خاں (۶) تہور خاں (۷) پردل خاں (۸) کفایت خاں (۹) محمود خاں (۱۰) داؤد خاں (۱۱) عبداللہ خاں (۱۲) عبدالرسول خاں (۱۳) امین خاں (۱۴) غالب خاں (۱۵) نجیب خاں (۱۶) درگاہ قلی خاں (۱۷) عابد خان (۱۸) حیدر علی۔

عالمگیر کی وفات کے بعد جب ملک میں خانہ جنگی پھیل گئی تو سرا بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ یہ امین خاں کا زمانہ تھا کہ سرا کے گورنر اور ارکاٹ کے صوبہ دار سعادت اللہ خاں میں کش مکش شروع ہوگئی۔ سعادت اللہ خاں چاہتا تھا کہ سرا کا صوبہ بھی اس کے ماتحت کردیا جائے۔ لیکن امین خاں نے سختی سے مخالفت کی۔ امین خاں کے بعد اسکے جانشین کمزور نکلے یہی وہ زمانہ ہے کہ نظام الملک آصف جاہ اول نے دخل دیکر سعادت اللہ خاں کی مرضی سے امین خان کو گورنر مقرر کیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سرا والوں نے حیدرآباد یا ارکاٹ کی سیادت کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ اور ہمیشہ ارکاٹ اور سرا میں نا اتفاقی رہی۔

ملک میں یہ خانہ جنگی اس طرح تھی کہ ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے سرا پر قبضہ کرلیا۔ چونکہ حیدرآباد تمام جنوبی ہند کو اپنے ماتحت سمجھ رہا تھا۔ اس لیئے نواب بسالت جنگ ملک سے مرہٹوں کو بے دخل کرنے کیلئے جنوب میں آیا اور حیدرعلی کی مدد سے ہوسکوٹہ پر قابض ہوگیا ہوسکوٹہ کے بعد بسالت جنگ کے حکم سے حیدرعلی نے سرا پر بڑھکر ۱۷۶۱ء میں اسے مرہٹوں کے قبضہ سے چھڑالیا۔ اس حسن کارگذاری اور دلیری کے صلے میں بسالت جنگ کی سفارش پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے حیدرعلی کو "نواب سرا" کا خطاب حاصل ہوا۔ اور اس طرح نواب حیدرعلی سلطنت مغلیہ کے آخری گورنر تھے۔ جس کے بعد ہی انہوں نے اپنی علیحدہ سلطنت قایم کی جو تاریخ میں "سلطنت خداداد" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۷۶۶ء میں مرہٹے پھر سرا پر قابض ہو گئے۔ مگر ۱۷۷۴ء میں ٹیپو سلطان نے ایک ایسی فاش شکست دی کہ اسکے بعد مرہٹے پھر دریائے کرشنا کی جنوب میں آنے کی جرأت نہ کرسکے۔ اس طرح سرا ۱۷۷۴ء میں سلطنت خداداد کا ایک حصہ بن گیا۔ اور یہاں ایک گورنر مقرر

کردیا گیا۔ اور یہ گورنری اس سلطنت کے خاتمہ تک رہی۔ جب ۱۷۹۹ء میں سلطنت خدا داد کو زوال آیا تو سرا پر بھی زوال آگیا۔

مغربی مورخین ٹیپو سلطان پر الزام لگاتے ہیں کہ وہی سرا کی ویرانی کا ذمہ دار ہے اس لیئے کہ اس نے بارہ ہزار گھرانوں کو یہاں سے سرنگاپٹم بھیج دیا تھا۔ مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو سرا کی ویرانی کا سبب ٹیپو سلطان نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس کمیشن پر آتا ہے جو زوال سلطنت خدا داد کے بعد ملک کے تجزیہ کے لیئے مقرر ہوئی تھی۔ جسطرح سرنگاپٹم میں مسلمانوں کے جھتے کو توڑ کرا سے ویرانہ بنایا گیا۔ یہی پالیسی سرا میں بھی عمل میں آئی۔ اسکے بعد جب میسور میں ہندو راج قایم ہوا اور پورنیا وزیر اعظم بنا تو رہے سہے خاندان بھی اس کی پالیسی سے بتدریج سرا چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ کیونکہ تمام جاگیریں ضبط کرلی گئیں لوگوں کیلیئے کوئی وسیلۂ معاش نہیں رہا تھا۔ اس لیئے کہ مسلمان صرف فوجی ملازمت کرتے تھے یہ سرا کی اسلامی آبادی ہی تھی جو بیجاپور، سلطنت مغلیہ اور بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فوجوں کو سپاہی مہیا کرتی رہی تھی۔ جس کا ثبوت سرا کے قبرستانوں سے ملتا ہے۔ ان تمام قبرستانوں میں جو شہر کے کل رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیکھا جائے تو نوے فیصدی قبریں عورتوں کی نظر آئیں گی۔ جس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مردانہ آبادی فوجی ملازمت کے سلسلہ میں ہمیشہ شہر سے باہر رہی ہے۔

سرا کی صنعتیں

سرا اپنے زمانہ عروج میں پھولدار چھینٹ، کملوں اور لاک کے لیئے مشہور تھا۔ یہاں کی چھینٹ تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔ بلکہ غیر ممالک کو بھی جاتی تھی۔ سلطنت خدا داد کے زوال کے بعد ہی ان صنعتوں پر زوال آگیا اور آج چھینٹ بنانے والوں کا نام و نشان بھی نہیں۔
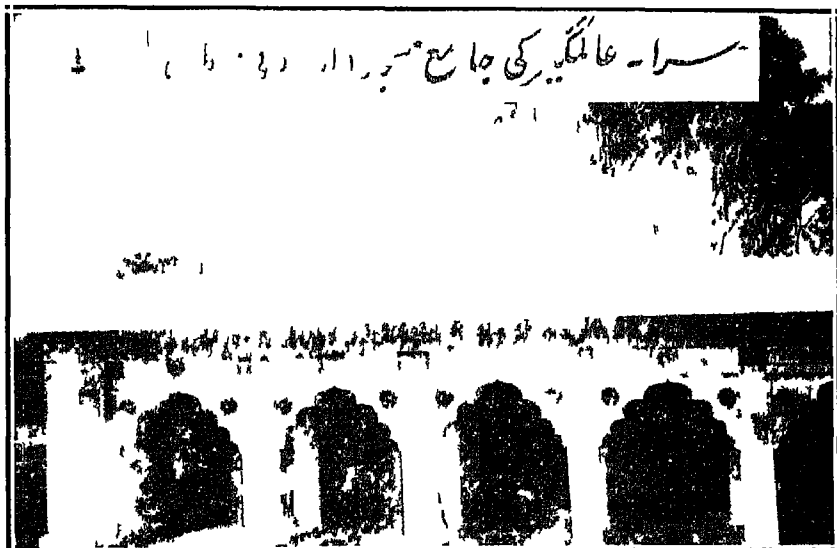
سرا کی موجودہ حالت

اس وقت اپنے دیکھنے والوں کیلئے سرا ایک شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا ہے۔ کل سات ہزار کی آبادی ہے جس میں نصف سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سرا جس وقت عروج پر تھا۔ تو اسکی آبادی سات میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ صرف پٹھانوں کے محلہ میں پٹھانوں کے چودہ ہزار گھر آباد تھے مگر اب یہ تمام رقبہ قبرستانوں اور کھیتوں سے گھرا ہوا ہے۔ بلکہ گھروں کے اندر تک قبریں موجود ہیں۔

آثارِ سرا

جامع مسجد

یہ مسجد شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد نہایت عالیشان اور سنگین ہے۔ رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ اسلامی تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور ایک ہی پتھر کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ شاید رئیس کی مراد اس سے یہ ہے کہ ایک ہی چٹان سے یہ تمام پتھر لیا گیا ہے۔ مسجد پر چار خوشنما بلند مینار اور تین گنبدیں ہیں۔ درمیانی محراب سنگ مرمر کی ہے۔ جس پر نہایت خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ قریب ہی ایک موٹی سنگین زنجیر ہے۔ جس میں چراغ آویزاں کیا جاتا ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک بہت بڑا کنواں ہے اس سے ایک نالی کے ذریعہ حوض میں پانی بھرا جاتا ہے۔ مسجد کے مشرقی روبہ پر پانچ دروازے ہیں۔ شمال وجنوب اور مغرب میں بھی دروازے تھے۔ مگر اب بند کر دئے گئے ہیں۔ صرف ایک بڑا مشرقی دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا ہے۔ مسجد کے اندر اور باہر پختہ سنگین فرش ہے۔ اندر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں۔ لیکن مسجد کی باہری دیوار پر چند کتبے دوسری ویران شدہ مسجدوں کے لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ لوگوں نے ویران شدہ مسجدوں کی تاریخ محفوظ رکھنے کیلئے یہ کتبے یہاں

لاکر لگا دئے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان میں اس مسجد کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ ان کتبوں میں جو اب مسجد کی دیوار پر نقل کر دئے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل تاریخیں ملتی ہیں:-

(۱) تاریخ عیدگاہ سنہ ۱۶۳۸ء

(۲) ملک ریحان کی درگاہ کی تاریخ سنہ ۱۶۳۸ء سے سنہ ۱۶۵۰ء

(۳) تاریخ مسجد سدی مختار

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

سنہ ۱۰۱۱ء

(۴) تاریخ مسجد شیخ فرید

در گوش عقل آمد از غیب ایں ندا

"بیت المقدس است" بگو تاریخ ایں بنا

سنہ ۱۰۱۱ھ

جستجو اور تاریخ و نیز ایک اور قدیم کاغذ سے معلوم ہوا کہ اس جامع مسجد کی تعمیر سنہ ۱۰۱۱ھ میں ہوئی تھی، چونکہ مسجد شیخ فرید کی تعمیر کا سنہ بھی سنہ ۱۰۱۱ھ ہی ہے۔ اس لئے ہم کو مسجد شیخ فرید کی جستجو ہوئی مگر اس کا کوئی پتہ نہ مل سکا۔ بعد میں بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اسی جامع مسجد کو مسجد شیخ فرید بھی کہتے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا کہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے جس انجینئر نے اس مسجد کو تعمیر کیا تھا۔ اس کا نام شیخ فرید ہے۔ اس لئے اس میں شک نہیں رہا کہ اس مسجد کی تاریخ تعمیر

"بیت المقدس است"

سنہ ۱۰۱۱ھ

سہے -

مقبرۂ ملک ریحان

یہ مقبرہ شہر کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اور اسی کے مقابل سے بنگلور کو سڑک جاتی ہے۔ ملک ریحان سرا کے گورنر رہے ہیں۔ آپکے اوصاف آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔ آپ کا دور حکومت اس قدر مسعود و بابرکت رہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں یکساں آپ کے نام کے گرویدہ ہیں۔ آپ کی مدت حکومت ۱۴ سال تھی۔ اس چودہ سال میں آپ نے جس طرح حکومت کی اور لوگوں کے دلوں پر آپ کا قبضہ ہوگیا۔ وہ حیرتناک ہے۔ ایک شاعر آپ کی چہاردہ [۱۴] سالہ عہد حکومت کے متعلق لکھتا ہے :- ؎

درسنہ ایکہزار و چہل ہفت	رونق افزائے ملک شد ایں جا
صاحب دولت و ریاست بود	سیرتش ہمچو اولیائے خدا
وصف ایشاں چہ ساں کنم تحریر	از شمار و حساب ہست جدا

آپ کی وفات سنہ ۱۰۶۱ھ میں ہوی۔ کسی شاعر نے آپ کی وفات کی تاریخ لکھی ہے :- ؎

سال رحلت زعقل پرسیدم	ہاتف از غیب گفت بہ ندا
عرشیاں و ہم ملایک گفت	روح ریحان بعرش بجا

(ملک ریحان کے مقبرے پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ یہ تاریخیں ایک قدیم کاغذ میں نظر سے گذری ہیں۔

ملک ریحان کے مقبرے اور قبرستان کے لئے اگلے وقتوں میں جو جاگیریں عطا ہوئی تھیں۔ ان میں سات مواضع شامل تھے۔

(۱) وجی گنڈ (۲) بلور (۳) چن گنگنہ (۴) ہلکور (۵) کوس گنٹہ (۶) گرناتھ ہلی

(۸) اس موضع کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

معلوم ہوا کہ جس وقت سلطنتِ خداداد میسور کو زوال ہوا تو یہ جاگیر دیوان پورنیا کے حکم سے ضبط کر لی گئی۔ اور اس کے عوض ڈھائی ایکڑ زمین دی گئی۔ جس میں اگر بارش ہو تو فصل ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ ہر سال ملک ریحان کا عرس ہوتا ہے جس کا خرچ سرا کے ہندو مسلمان دونوں ملکر ادا کرتے ہیں۔ کندوری اور باقی دیکھ بھال متوسلین مقبرہ اس آمد سے کر رہے ہیں جو ڈھائی ایکڑ کے کھیت سے ہوتی ہے۔

ملک ریحان کا مقبرہ ایک وسیع قبرستان میں ہے۔ مقبرہ کی عمارت اسلامی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور گنبد کے اندر سنہری نقش ونگار کیا ہوا ہے۔ اوپر بہت ہی خوبصورت اور نازک چار مینار ہیں۔ اس مقبرے اور سرا کے دوسرے مزارات ومساجد وغیرہ کے متعلق لوئیس رئیس اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

" میسور میں سارا سنک (SARACENIC) طرزِ تعمیر کے بہترین نمونے سرا میں پائے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ یہی مغلیہ تعمیرات کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تعمیرات کا نمونہ سرا کی جامع مسجد اور مقبروں سے ملتا ہے سرا کے مقابر پر جو گنبدیں ہیں۔ اگرچہ بڑے نہیں ہیں۔ مگر بہت خوبصورت ہیں اور اس طرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ گویا ایک پھول کھلا ہوا ہے۔ اور اس کی پتیاں جھک کر مل گئی ہیں "

گوہر تاج ہندوستان کا مقبرہ

یہی صنعت اس مقبرہ کے گنبد میں بھی ہے۔ یہ مقبرہ ملک ریحان کے قبرستان میں واقع ہے۔ مقبرہ ایک اونچی سطح پر واقع ہے۔ جس پر سیڑھیوں کے

سرا کے کھنڈرات - بیگم کی مسجد

سرا مقبرہ ملک یحان   بائیں جانب کا مقبرہ عالمگیر کی بیٹی کا ہے
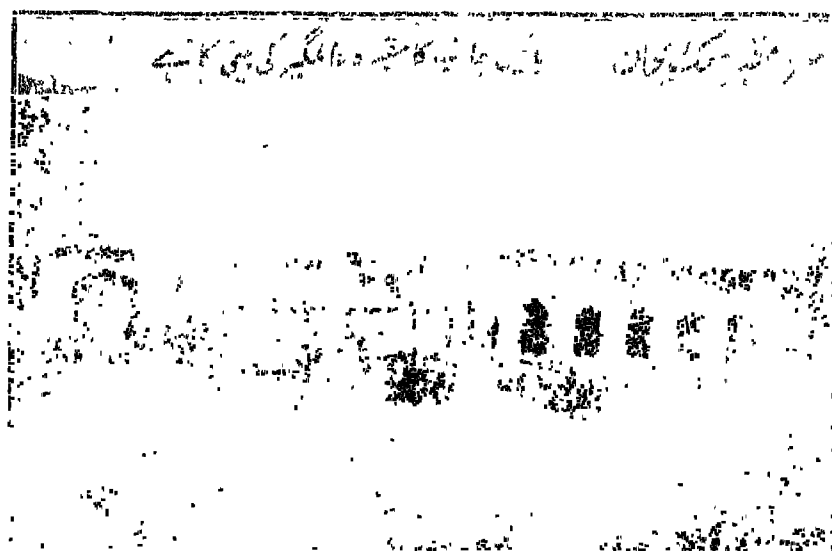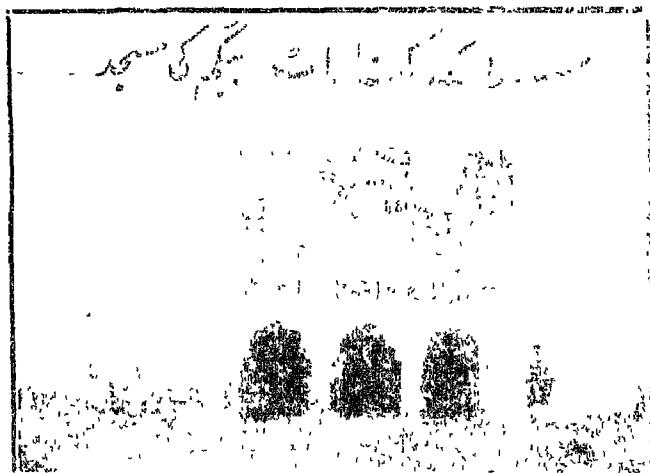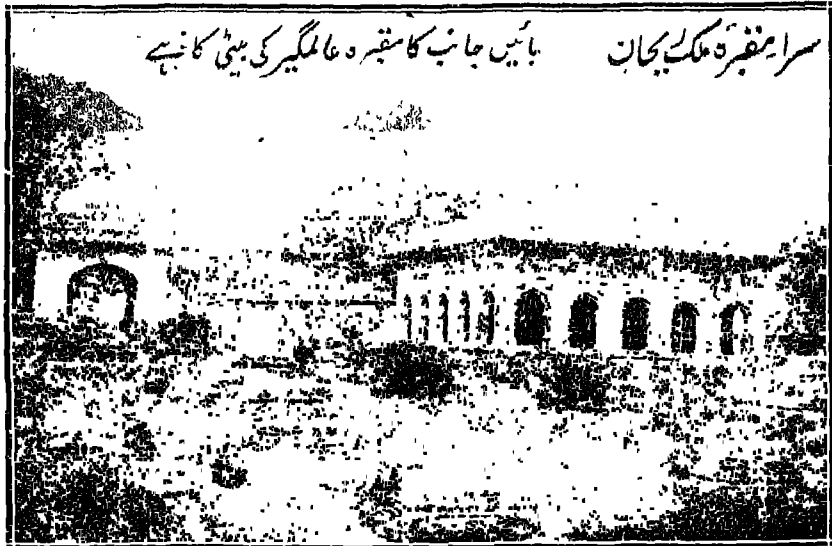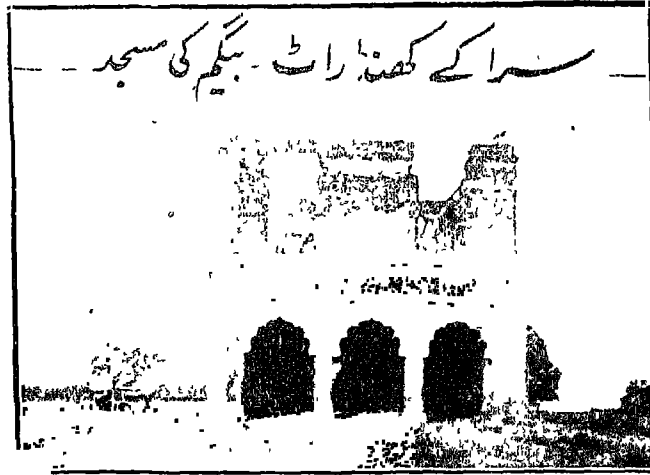
ذریعہ جاتے ہیں۔ مقبرے سے ملحق جانب مغرب ایک مختصر سی مسجد ہے۔ مقبرے کے جنوب میں ایک اونچے چبوترے پر بہت سی پختہ قبریں ہیں۔ مگر ایک پر بھی کتبہ نہیں۔ انہی میں ایک مختصر سی گنبد کے نیچے جو چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے ایک ننھی سی قبر ہے۔ جس میں شہنشاہ ہندوستان عالمگیر اورنگ زیبؒ کی سات سالہ لخت جگر آرام پذیر ہے۔ شہنشاہ جس وقت جنوبی ہندوستان میں تھا تو اس شہزادی کی وفات ہوگئی اور اس گوہر تاج ہندوستان کو سرا کی سرزمین کے سپرد کیا گیا۔ گنبد کے چاروں طرف جو محرابیں کھلی ہوئی ہیں۔ ان پر لوہے کی کڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس پر مخمل و کمخواب کے پردے پڑے رہتے تھے تاکہ نامحرم آنکھ بھی قبر پر نہ پڑے۔ شاہزادی کے متعلق مشہور ہے کہ قرآن ختم کر چکی تھی۔ بہر طور سرزمین سرا کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے شہنشاہ کی ایک معصوم امانت کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ شاہزادی کے مزار پر کتبہ نہیں ہے۔ البتہ سرہانے تعویذ پر اس طرح لکھا ہوا ہے:-

اللہ

محمد

۱۱۰۴ھ

اس مزار سے چند گز کے فاصلہ پر ایک خوشنما احاطہ ہے۔ جس میں دو زنانہ قبریں ہیں۔ ان پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ لیکن احاطہ کے دروازے کی لوح پر یہ تحریر ہے:-

رحل السلطان علیہ المعراج

۱۲۰۶ھ   ۱۲۰۶ھ

ان دونوں قبروں کے متعلق مشہور ہے کہ ساس اور بہو کی قبریں ہیں۔ مگر یہ کون

اور کیا نہیں۔ اس کا پتہ سرا میں کسی سے نہیں چلتا۔ سنہ ہجری سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے
کہ سلطنت خداداد کے زوال سے صرف آٹھ سال پیشتر یہ کتبہ لکھا گیا ہے۔

نوٹ:۔ لیکن اس کتبہ کے متعلق میسور کے محکمۂ آثار قدیمہ نے ایک عجیب و غریب مضحکہ انگیز تشریح
کی ہے۔ میسور آرکولاجیکل ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ بابت ۱۹۱۵ء کے صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے :۔

"سرا میں ملک ریحان کی درگاہ کے احاطہ میں دو کتبے پائے گئے۔ جو عہد مغلیہ
سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک پر صرف بَلبلیۃ المِرَاج لکھا ہوا ہے۔ بلبلہ ایک
زنانہ نام ہے جو بلال (جو پیغمبر کے موذن تھے) کا مونث ہے۔"

پہلے تو کتبے میں بلبلیۃ المعراج کے آگے کے دو لفظ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اور پھر محکمہ نے یہ کوشش ہی نہیں کی کہ
لیدۃ المعراج کے مفہوم کو سمجھے۔ اور آخر میں تاریخ جو عہد ٹیپو سلطان سے تعلق رکھتی ہے اسکو عہد مغلیہ کا بتلایا گیا ہے۔

بیگم کی مسجد

ملک ریحان کے مقبرے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت ہے جو یاس و حسرت کا ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی ہے۔
یہ عمارت بیگم کی مسجد کہلاتی ہے۔ دراصل یہ زنانہ مسجد تھی۔ جہاں خواتین سرا نماز پڑھتی
تھیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ عیدین کے موقع پر کل عورتیں نماز عید کیلئے اسکے احاطہ میں جمع ہوتی
تھیں۔ اب وہ احاطہ یعنے چار دیواری کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ مسجد کے اوپر
کی چھت اور دیواریں جا بجا سے شق ہو کر گر گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دروازے اور دریچے
نہایت بے دردی سے نکالدئے گئے۔ جس سے ڈراڑیں پڑ گئے ہیں۔ اوپر کا حصہ بالکل مخدوش
حالت میں ہے۔ نیچے بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔

مسجد نجیب خاں احراری

یہ مسجد عہد بیجاپور میں نجیب خاں احراری گورنر سرا نے تعمیر کی تھی۔ کل مسجد سنگین بہت وسیع اور ہموار

عیدگاہ (تعمیر عہد بیجاپور)
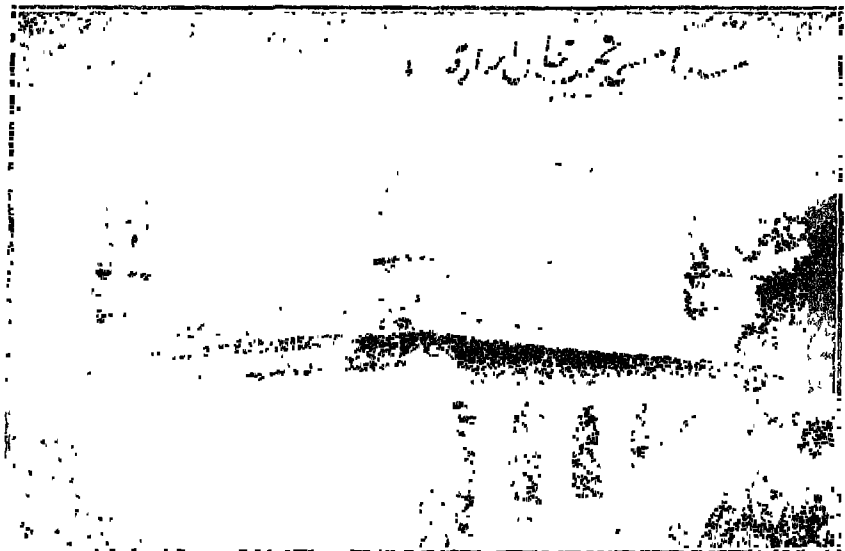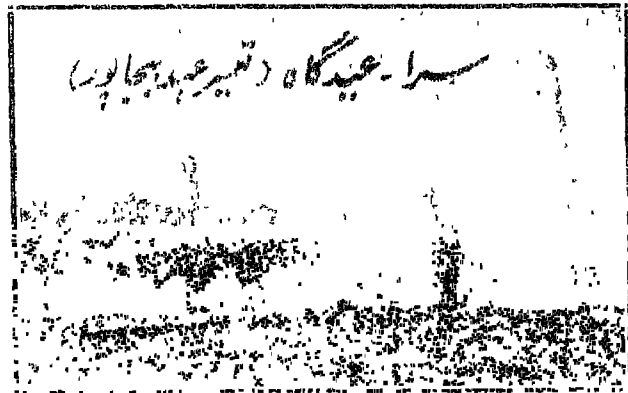
سرا۔ عیدگاہ (تعمیر عہد بیجاپور)

سرا۔ مسجد نجیب خاں احراری
(عہد بیجاپور)
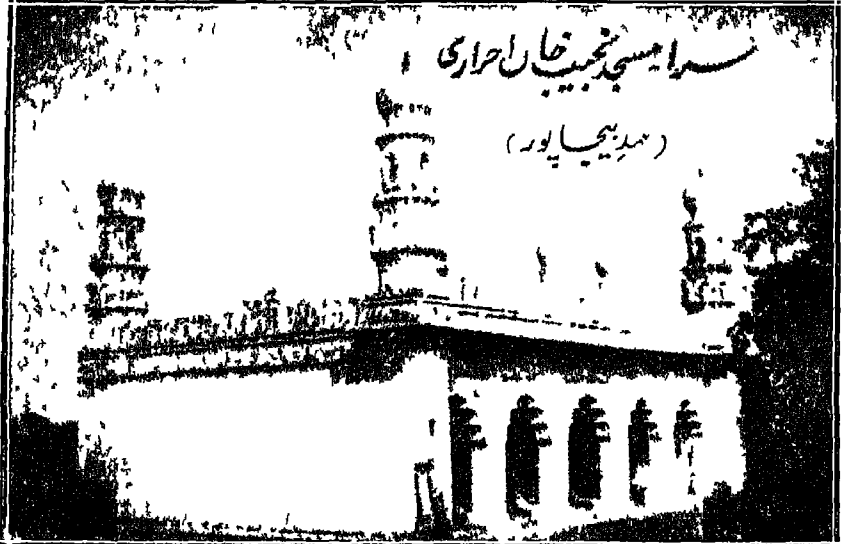
ہے اور ایسی نظر آتی ہے کہ گویا ابھی بنکر تیار ہوی ہے ۔ اس کے عالیشان مینار بہت دور سے نظر آتے ہیں ۔ اس مسجد کے دروازے بھی مختلف سمتوں میں تھے ۔ لیکن بند کر دئے گئے ۔ اور اب ایک ہی بڑا دروازہ ہے ۔ صحن میں گئے ایک مزار ہے جو مٹ گئے ایک بہت بڑا حوض تھا ۔ جس کو پاٹ دیکر اب مختصر کر دیا گیا ہے ۔ اس مسجد کے لئے بھی ایک بہت بڑی جاگیر تھی ۔ جو دیوان پورنیا کے عہد میں زوال سلطنت خداداد کے بعد ضبط ہو گئی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی جاگیر کی سند موضع ناگرہ کے پٹیل کے پاس پیتل کی تختی پر لکھی ہوی موجود ہے ۔ مسجد کے اندر یہ کتبہ لگا ہوا ہے :-

ہاتف ببانگ گفت پس از حمد و از ثنا

"بیت العتیق" حق شدہ تاریخ ایں بنا

شمالی دیوار پر جو کتبہ لگا ہے ۔ اس پر لکھا ہوا ہے :-

از سعی واحد بیگ شد ایں مسجد خان نجیب

کرد اب ایں از خدا در عافیت کرد و نصیب

اس مسجد کی نسبت مشہور ہے کہ زوال سلطنتِ خداداد کے بعد جب انگریزی و میسوری فوجوں نے سرا پر قبضہ کیا تو اس میں گھوڑے باندھے جانے لگے تھے ۔ اور بعد میں واگذاشت ہوی ۔

عیدگاہ

عیدگاہ میں کوئی کتبہ نہیں ۔ عمارت نہایت عالیشان اور بہت بڑی ہے ۔ اس عیدگاہ کی تعمیر کا سنہ ۱۰۳۸ھ ہے ۔ یعنے بیجاپور والوں نے جس وقت سرا پر قبضہ کیا اسی سال یہ عیدگاہ تعمیر ہوی تھی ۔ عیدگاہ سے جانب جنوب تھوڑے فاصلہ پر جھاج بی کا کٹہ (تالاب) ہے ۔ یہ کٹہ دراصل ایک تالاب کا بند ہے ۔ مشہور

ہے کہ یہاں عورتوں کے غسل کیلئے پردے کے انتظامات تھے۔ اس بند کے نیچے اب بھی درختوں کے جھنڈ ہیں جو بالکل تروتازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔

محمد خاں کا روضہ

محمد خاں کا پورا روضہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ جس پر نہایت عمدہ نقش ونگار ہیں۔ روضہ کے اندر عورتوں کے دو مزار ہیں۔ روضہ سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو شکستہ حالت میں ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اور قبرستان ہے۔ اس میں بھی ایک شکستہ مسجد ہے۔ اس مسجد کے اندر ایک چھوٹا سا کتبہ ہے۔ جس پر کندہ ہے :-

"خدایا بدہ رحب ان سلامتے

اسمٰعیل ابن قادر خاں برکے

۱۱۲۰

ابن بوستان ابن جمال ابن مصری ابن علی ابن غفار"

مسجد کے صحن میں ایک سنگین اور عالیشان مقبرہ ہے۔ جس میں دو قبریں ہیں۔ اور دونوں پر ایک گنبد سائبان ہے۔ مگر یہ نہایت تعجب خیز امر ہے کہ ایک قبر تو بھری ہوئی ہے مگر دوسری خالی ہے۔ شاید کسی کے دفن کیلئے پہلے سے تیار کیگئی تھی مگر وہ یہاں دفن نہ ہوسکے اس قبرستان میں اور احاطے بھی ہیں۔ ایک بڑے احاطے میں ایک اور مقبرہ ہے۔ اس پر بھی دو گنبد ہیں۔ جن میں سے ایک قبر ہی پر گرا پڑا ہے۔ نیز ہر جگہ بڑی بڑی سنگین باؤلیاں ہیں۔ جن کے اندر اترنے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس سے آگے ایک اور وسیع قبرستان ہے اور اس میں ایک سادہ مگر بڑا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ سید فرید اللہ شاہ حسینی صاحب چشتی رح کا ہے۔ جن کے متعلق مشہور ہے کہ آٹھ سو سال آگے تبلیغ اسلام کے لئے یہاں آئے تھے۔ وفات کے بعد یہیں دفن ہوئے۔

سرا ۔ روضہ و مسجد قادر خاں ابرکی

سرا ۔ محمد خاں کا روضہ
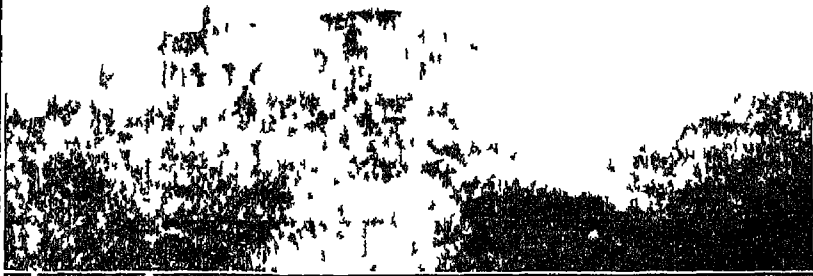
کہا جاتا ہے کہ سید فریداللہ شاہ حسینیؒ کے قبرستان کیلئے پندرہ ایکڑ زمین ملی تھی۔ جو ضبط ہوگئی۔ اب صرف ½۳ ایکڑ رہ گئی ہے۔

سرا کا قلعہ

قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹی سی شکستہ مسجد ملتی ہے جس کی اب صرف ایک محراب باقی ہے۔ اس مسجد کا کتبہ مسجد نجیب خاں احراری کے احاطہ میں پڑا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ملک ریحان کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ کتبہ پر یہ عبارت کندہ ہے :-

بنی ھذا المسجد الشریف العظمی لعالی المبارک
علی نظر الراجی غفور نابع الملک ریحان مبارک
عفی اللہ عنہما بحق نبی الکریم یٰسین وتبارک

مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر قلعہ کا دروازہ ہے۔ اس پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ گو دروازہ ٹوٹ گیا ہے۔ مگر قلعہ کسی قدر اچھی حالت میں ہے۔ اندر سرا کے گورنر کا محل تھا۔ اس کے متعلق رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مغلیہ طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کے نمونہ پر حیدر علیؒ اور ٹیپو سلطانؒ نے بنگلور اور سرنگا پٹم میں اپنے محلات تعمیر کئے تھے۔ اب اس محل کی صرف چار دیواری کھڑی ہے۔ قلعہ کی ایک جانب ایک بہت بڑا سنگین کنواں ہے جس سے نالی کے ذریعہ پانی ایک محفوظ و سائبان دار حوض میں پہونچایا جاتا تھا۔ وہاں سے محل اور دوسری جگہ جاتا تھا۔

مقبرۂ عرب شاہ قادریؒ

قلعہ سے نکلکر گاؤں کو آتے وقت راستے میں عرب شاہ قادری کا مقبرہ اور قبرستان ہے۔ یہ مقبرہ ڈھائی سو سال بیشتر تعمیر ہوا تھا۔ اس مقبرہ اور قبرستان کیلئے موضع ہید گڑھ جاگیر میں ملا تھا۔

جاگیر ضبط ہوکر اب پندرہ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں۔

پٹھان واڑی کی مسجد

قلعہ کے آگے جو وسیع میدان ہے۔ اگلے زمانہ میں یہ نہایت آباد تھا۔ اسکو پٹھانوں کا محلہ یا پٹھان واڑی کہا جاتا تھا۔ یہاں پٹھانوں کے چودہ ہزار گھرانے آباد تھے۔ اس میدان میں ایک سنگین خوبصورت مسجد ہے جو مغلیہ طرز تعمیر کے نمونہ کی ہے۔ مسجد کا ایک مینار شکستہ ہوکر گر چکا ہے۔ اب صرف ایک مینار باقی ہے۔

شہر کے اندر

شہر کے اندر بہت سے قبرستان ہیں۔ ان قبرستانوں میں جو قبریں ہیں کسی پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ البتہ ایک قبر کی لوح پر یہ کندہ ہے:۔ ھٰذالقبر شیخ عبدالکریم ابن شیخ علی ابن شیخ ابن

شہر ربیع الاول ۱۱۲۹ھ ہجری

ایک اور قبرستان میں ایک اونچے چبوترے پر حضرت شاہ شریف حسینؒ کا مزار ہے جن کا عرس شعبان کے مہینہ میں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے اور قبرستان کیلئے بھی ایک جاگیر موضع ارسے پلی میں ملی تھی جو ضبط ہوگئی۔ ممکن ہے کہ ذیل کا کتبہ جو ایک قدیم کاغذ میں نظر سے گذرا اسی مزار کا ہو۔ واللہ اعلم

قدوۃ سالکان ہادیٔ وقت — شاہ عارف بزم خاک بخفت

جستم از عقل سال رحلت را — ہاتف از غیب شیخ را بگفت

از عمر یک صد و شا نزدہ سالگی

نقل فرمودند حساب تاریخ

اور ایک کاغذ پر یہ لکھا ہوا تھا:۔ وفات در ۱۱۷۱ھ ہجری

سسرا، عہدِ مغلیہ کی ایک مسجد
جس کا صرف ایک مینار باقی ہے۔

سسرا ۔ قلعہ

این مسجد نوز و ل شد نجیب خاں صوبہ دار سرا، افتادہ شد بوقت
آوارگی، قلعہ و دیار ۱۲۱۱ھ ہجری۔

(نوٹ:۔ اس تاریخ سے قلعہ و شہر سرا کی تباہی کی تاریخ ملتی ہے جو سلطنت خداداد کے زوال سے ۶ سال بعد ہوی۔)

سرا میں انکے سوا اور کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ جہاں نظر اٹھتی ہے سوائے ویرانوں کھنڈروں، قبرستانوں شکستہ مسجدوں اور مقبروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ صرف جامع مسجد، مسجد نجیب خاں اور ملک ریحان کا مقبرہ کسی قدر اچھی حالت میں ہیں۔ نوّے[۹۰] مساجد میں پانچ، چھ کے سوا جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے اور کسی مسجد کا پتہ نہیں ملتا۔

آہ! یہ ہے وہ شہر جو پونے دو سو سال (یعنے ۱۶۳۸ء سے ۱۷۹۹ء) تک خالص اسلامی تہذیب و تمدن کا جنوب میں مرکز رہا ہے۔ جہاں بیجاپوری اور مغلیہ تہذیب پہلو بہ پہلو کارفرما رہی تہی۔ آج جو مسلمان یہاں آباد ہیں وہ بالکل تباہ حالت میں ہیں۔ اور کوئی صنعتیں اور کارخانے بھی یہاں نہیں ہیں۔ جنکے لئے سرا کبھی مشہور تھا۔

(نوٹ:۔ ابھی حال میں سید امین الدین صاحب نے ایک چھوٹی سی بٹن فیاکٹری ایجاد کی ہے۔ جس میں ناریل کے پوست سے اور ہڈیوں وغیرہ سے گنڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ سرا میں مصنف کتاب کو سید صاحب سے بہت مدد ملی تھی۔ قلعہ کی جو تصویر دی گئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تصویر بھی ہے۔)

جنوبی ہند میں مسلمانوں کی اقلیت کے اسباب

کل ہندوستان میں سب سے پہلے جو خطہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا تھا۔ وہ جنوبی ہند تھا۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں بتلایا جا چکا ہے کہ ساحل ملیبار و مدوراپر عربوں کی نامعلوم زمانہ سے آمد و رفت تھی۔ اس لحاظ سے بہ نسبت شمالی ہند کے جنوبی ہند میں اسلام کو زیادہ وسعت پذیر ہونا تھا۔ برخلاف اس کے کل جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آبادی ۶ فیصدی سے بڑھکر نہیں ہے۔ اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ اس کے علل و اسباب کیا ہیں؟

(۱) اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ اسلام کو چھ سو سال تک یہاں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ گو یہ اپنے آغاز ہی سے ساحل ملیبار و مدورا پر عرب تاجروں اور اولیاء اللہ کے ذریعہ محدود پیمانہ پر پھیل چکا تھا۔

(۲) اسلام کی سیاسی اہمیت ۱۳۱۰ء سے یعنے ملک کافور کے حملے کے بعد سے ہوئی۔ لیکن اسکے چند سال بعد ہی ملک میں ایک ایسا انقلاب آیا جو اس کا سد راہ بنگیا۔ یعنے مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے شہنشاہ محمد بن تغلق کا گورنر جو مدورا میں تھا باغی ہوگیا۔ اور اس طرح شمالی ہند سے جو تعلق پیدا ہو چکا تھا وہ منقطع ہوگیا۔ اور ہندوؤں کی ایک نئی زبردست سلطنت وجود میں آگئی جس کا نام وجیانگر ہے۔ جو شمالی اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی۔ یا بالفاظ دیگر اسلام کے ہی سد راہ ہوگئی گو اسی زمانہ میں دکن میں ایک زبردست اسلامی سلطنت قائم ہوئی جس کا نام دولت بہمنیہ تھا۔ اور یہ سلطنت ہر طرح سے سلطنت وجیانگر کے مدمقابل تھی اور ممکن تھا کہ اگر اس سلطنت کو استقلال نصیب ہوتا تو جنوبی ہند بیشک پھر اسکے قبضہ میں آجاتا اور ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی یا کم از کم مسلمان

اسدرجہ اقلیت میں نہ رہتے (یہاں سیاسی اہمیت سے میری مراد وہ مسلمہ حقیقت ہے کہ رعایا حکمران قوم کا اثر بہت زیادہ محسوس کرنے لگتی ہے۔ جنوبی ہند کی آبادی کا بہت زیادہ حصہ چونکہ نیچ ذاتوں پرمشتمل ہے۔ اس لئے اگر مسلمان اپنے اصول مساوات کے ساتھ ساتھ حکمران بھی ہوتے تو اسلام کو یہاں بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوتی) لیکن مسلمانوں کی خوش بختی نے ایسے اسباب پیدا کردئے جنہوں نے اس سلطنت کو ہی ختم کر دیا۔ یعنے اس سلطنت میں شیعہ سنی اختلافات اس قدر پیدا ہوگئے کہ پوری سلطنت اس آگ کی نذر ہوگئی۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب ہسٹورک لینڈ مارکس آف دکن کے صفحہ ۴ پر لکھتا ہے :۔

"بہمنی سلطنت کے زوال کے اسباب میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ غیر ملکی اور دکنی امراء میں مذہبی اختلافات پیدا ہوگئے۔ یہ علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی کا زمانہ تھا کہ ان اختلافات نے زور پکڑا۔ مسلمانوں کی خانہ جنگی اس وقت تک ختم نہیں ہوئی جب تک دکن کی اسلامی سلطنتیں خود ختم نہیں ہوگئیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی جانب سے اس پر مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں۔ اسی مورخ نے اپنی مذکورۂ بالا عبارت کی تشریح بھی کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"شہنشاہ محمد بن تغلق سے بغاوت کرنے کے بعد دکن میں جب مسلمانوں نے اپنی علیحدہ سلطنت قایم کی تو ایران، عراق، وسط ایشیا اور ساحل عرب سے مسلمان یہاں آکر آباد اور اس سلطنت میں عہدے حاصل کرنا شروع کئے۔ انکی بہادری و ذہانت کو دیکھتے ہوئے بہمنی سلاطین نے انہیں بڑے بڑے عہدے دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ایک بہمنی بادشاہ نے ایک غیر ملکی سردار شاہ قلی سلطان کو اپنی بیٹی مناکحت میں دی۔ خلف حسن بصری اور خواجہ محمود گاوان جو غیر ملکی تھے۔ انہیں ملک التجار کا خطاب دیا گیا۔ اس سے

پہلے دربار میں بادشاہ کے دائیں بازو دکنی امراء کی نشست تھی۔ اب انہیں بائیں بازو بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ اور دایاں بازو غیر ملکی امراء کو دیا گیا۔"

دکنی امراء نے جن کے خاندان اس سلطنت کے بانیوں میں سے تھے، سلاطین بہمنیہ کی ان کارروائیوں کو اپنی توہین سمجھی۔ گروہ بندی شروع ہوی۔ دکنی امراء سنی العقاید تھے۔ اور غیر ملکی شیعہ۔ حبشی جو فوج میں کثیر تعداد میں تھے۔ انہوں نے بھی عقاید کے لحاظ سے دکنی امراء کا ساتھ دیا۔ خانہ جنگی شروع ہوی۔ اور پائے تخت کی گلیاں تبرا کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ مضافات اور سلطنت کے دور دراز مقامات بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہمنی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ جہاں شیعہ امرا کا زور تھا۔ انہوں نے اپنی حکومتیں علیحدہ قایم کیں اور جہاں دکنی یا سنی امراء تھے۔ انہوں نے اپنی علیحدہ۔ اسطرح جو سلطنتیں قایم ہوئیں۔ انہیں تاریخ میں بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار کہا جاتا ہے۔ شیعہ سنی اور ملکی و غیر ملکی اختلاف یہاں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دکن کی یہ اسلامی سلطنتیں اپنی اندرونی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہونے کے علاوہ ہمیشہ ایک دوسرے سے بھی لڑتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی رقیب ہندو سلطنت نے انکے اس اختلاف سے خوب فائدہ اٹھاتے ہوے انہیں آپس میں لڑاتی رہی۔ مسلمان جب خانہ جنگی کو ختم کر کے متحد ہوے۔ تو انہوں نے اس ہندو سلطنت پر حملہ کیا اور اس کو ختم کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس فتح (تالیکوٹہ) کے بعد پھر ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور قریباً ایک صدی تک پھر ان میں آپس میں جنگیں ہوتی رہیں۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے انہوں نے جنوبی ہند پر (جہاں ہندوؤں میں طوائف الملوکی پھیلی ہوی تھی) بالکل توجہ نہیں کی۔

سترہویں صدی کے اخیر میں عالمگیر اورنگ زیب نے جب دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کو ختم کیا تو مرہٹے اب اسکی راہ میں حائل ہو چکے تھے۔ مرہٹے اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

تاہم عالمگیر نے جنوب میں دو صوبہ داریاں قایم کیں۔ ارکاٹ اور سرا۔ ان صوبہ داریوں کے قایم ہونے کے چند سال بعد ہی عالمگیر کی وفات ہوگئی۔ اور جسطرح تخت کیلئے شمالی ہند میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ یہی جنوب میں بھی ہوا۔ اور یہ صوبے ایک دوسرے کے مخالف بن گئے۔

اور جب اس سے نجات ملی تو ارکاٹ ہی میں مسند نشینی کے جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ وقت ہے کہ انگریز اور فرانسیسی جو اب تک صرف تجارت پر قانع تھے۔ ملکی معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کامیاب ہوتے چلے گئے۔ اور تمام ملک عالمگیر کی وفات سے ایک سو سال بعد انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ مسلمانوں کو جو پہلا موقع ملک کافور کے حملے کے بعد ملا۔ اسکو خود انہوں نے چالیس سال کے اندر اندر گنوا دیا۔ اور دوسرا موقع جو ڈھائی سو سال تک (۱۵۹۴ء سے ۱۸۰۰ء تک) تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد حاصل ہوا۔ اسکو بھی انہوں نے اپنی خانہ جنگی میں صرف کردیا۔ جسکے بعد انگریز اس ملک پر قابض ہوگئے۔ ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مسلمان یہاں اس درجہ اقلیت میں ہیں۔

چند تاریخی غلط فہمیوں کی اصلاح

ملک کافور

آج کل چند مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ شہنشاہ علاؤ الدین کے قابل فخر غلام اور جنوبی ہند کے مشہور فاتح کافور کا نام کافور نہیں بلکہ غفور ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ کافور کوئی اسلامی نام نہیں اور یہ ناممکن ہے کہ علاؤ الدین نے اس کا نام اسلامی وضع کے نام چھوڑ کر کافور جیسا غیر اسلامی نام رکھا ہو۔ یہ اصل میں مغربی مورخین کا تعصب اور فریب ہے کہ انہوں نے غفور کو کافور بنا دیا۔ اور ان کی ریس میں اسلامی مصنفین بھی غفور کو کافور لکھنے لگے۔ عوام تو عوام، لکھے پڑھے لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی غلط فہمیوں کی اصلاح کر دی جائے تاکہ آئندہ کہیں ہماری تاریخ ہی مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔

ملک کافور ایک حبشی غلام تھا۔ شہنشاہ علاؤ الدین نے اس کا نام کافور ہی رکھا تھا یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ حبشی سیاہ فام ہوتے ہیں۔ اس لئے اکثر امراء اسلام اپنے حبشی غلاموں کے ایسے نام رکھتے تھے جو ان کی خوش مذاقی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی لئے سعدیؒ شیرازی کا یہ مصرعہ ضرب المثل مشہور ہو گیا ہے:۔

"بر عکس نہند نام زنگی کافور"

اس سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ آیا جنوبی ہند کے اس فاتح کا نام کافور ہی ہے یا

غفور۔ جہاں تک مغربی مورخین کا ہماری تاریخ سے تعلق ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پیداوار تو صرف ایک صدی یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ صدی کی ہے۔ لیکن ان سے کئی صدی پہلے بلکہ علاؤالدین کے زمانے ہی میں حضرت امیر خسرو دہلویؒ نے تاریخ علائی لکھی ہے۔ اور ان کے بعد تغلق کے زمانے میں ابن بطوطہ اور ضیاءالدین برنی گذرے ہیں۔ پھر عہد مغلیہ (عہد اکبر میں) بدایونی نے تاریخ ہند لکھی ہے۔ اور سلاطین بیجاپور کے عہد میں فرشتہ نے اپنی تاریخ مرتب کی تھی۔ ان تمام مشہور تاریخوں میں ان کے مصنفوں نے اس فاتح کا نام کافور ہی لکھا ہے۔

مغربی مورخین پر یہ بیجا الزام ہے کہ انہوں نے اسلامی ناموں کو مسخ کر دیا ہے۔ اس میں انکا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے قدیم تاریخوں میں جو نام دیکھا وہی لکھا ہے اسلئے کافور بالکل صحیح ہے (نوٹ:۔ ریحان کو بھی اب بعض لوگ رحمان لکھنے لگے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے بیترا میں اسی زمانے کے کتبے ابھی موجود ہیں۔ ان پر نام ریحان ہی لکھا ہوا ہے۔ یہ کتبے اسی کتاب میں کسی اور جگہ نقل بھی کئے گئے ہیں) اسلئے لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسکا اصلی نام کافور ہی تھا۔ اب اگر اسلامیت کے جوش میں اسکو کھینچ تان کر غفور بنایا جارہا ہے تو معلوم نہیں کہ یہ لوگ عنبر، سنبل، ریحان اور نسرین وغیرہ ناموں کی کیا تاویل کریں گے۔ جس طرح کافور تاریخ ہند کی ایک مشہور شخصیت ہے۔ اسی طرح عنبر، سنبل اور ریحان بھی مشہور شخصیتیں ہیں۔ غلاموں کے نام اس قسم کے رکھنے کی ایک یہ وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے کے اسلامی سلاطین و امراء میں اس زمانے کے مسلمانوں سے زیادہ مذہبی جوش تھا۔ انہوں نے نہ چاہا کہ اپنے غلاموں کے نام خدا و رسول کے ناموں پر رکھیں۔ جب ہمارے پاس قدیم تاریخی کتب میں اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کافور کا نام کافور ہی ہے تو اب اس قسم کی دماغی اختراعات کو رواج دینا خود اپنی تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔

اگر یہ خیال ہے کہ کافور عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اور مسلمانوں میں عربی نام رکھنے کا قاعدہ ہے تو یہ بھی درست نہیں۔ کافور، عنبر، سنبل، ریحان سب عربی ہیں۔ اور عربی زبان میں مستعمل ہیں۔

پھر یہ کہ کافور کوئی نیا اور اسلامی دنیا میں اجنبی نام بھی نہیں۔ قدیم عربی اسلامی حکومتوں میں بھی کافور نام کے بہت سے غلام گذرے ہیں۔ جن میں بعض نہایت ممتاز، با اثر اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ مثلاً عربی کے مشہور و نامی شاعر متنبّی کے ایک ممدوح کا نام کافور تھا۔

عہد عباسیہ کے سب سے ممتاز خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اس کا ایک مشہور غلام کافور تھا۔ کافور کی دو ایک حکایتیں گلستان (مصنفۂ شیخ سعدی شیرازیؒ) میں بھی ملتی ہیں۔ غرضکہ یہ نام غلاموں کیلئے دنیائے اسلام کا معروف اور متداول نام ہے۔ پھر اسے غفور بنانا ہٹ دھرمی اور شرارت نہیں تو اور کیا ہے۔

دوارسمندرم "ہوسے سالا" سلطنت کے پائے تخت کا نام ہے۔ اصلی نام دوارکا سمندرم تھا۔ جو کثرت استعمال سے رفتہ رفتہ دوارسمندرم اور دورے سمندرم بن گیا۔ تاریخ علائی، تاریخ برنی اور فرشتہ وغیرہ میں اس کو دہور سمندر کے نام سے لکھا ہے۔ اس نام کا شہر موجودہ وقت (ہلے بید ہے جو) میں ریاست میسور کے ضلع ہاسن میں ہے اور اسی شہر میں وہ مشہور مندر بھی ہے جس پر ملک کافور نے قبضہ کیا تھا۔ اب اس شہر کے نام کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کی جا رہی ہے کہ اس شہر کا نام عربوں نے باب البحر رکھا تھا یہ غلط فہمی دوارسے سمندرم کے نام سے پیدا ہوی ہے۔ سنسکرت میں دوارکا، دوارسے، دوار۔ دوارسے کو کہتے ہیں۔ اور سمندرم کے معنے قدیم ڈراویڑ زبانوں میں سمندر کے ہیں۔ اکثر الفاظ

اور ناموں کے آخر میں میم بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یہ عام بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا ترجمہ عربی میں باب البحر ہوگا۔ یعنے سمندر کا دروازہ لیکن عرب اس قدر عقل سے عاری نہیں تھے کہ ایک شہر کو جو سمندر کے ساحل سے قریباً ڈیڑھ سو میل دور ہو۔ اس کو باب البحر کہنے لگیں۔ اور وہ بھی بلا ضرورت عربی مورخوں اور جغرافیہ دانوں نے باب البحر کا نام کئی جگہ استعمال کیا ہے خصوصاً ہندوستان میں یہ نام انہوں نے اس آبنائے کو دیا ہے جو ہندوستان اور سیلون کے درمیان میں واقع ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ اس لیئے کہ اس آبنائے کے قریب تین سمندر ملتے ہیں۔ ایک بحر عرب، دوسرا خلیج بنگالہ، تیسرا بحر ہند۔ اور یہ ابنائے صحیح طور پر ان سمندروں کا دروازہ ہے۔ اسی طرح ملک عرب کے قریب باب المندب بھی ہے یہ آبنائے جو جزیرۂ عرب اور رڈوسی (بحیرۂ احمر) کو ملاتی ہے۔ اور صحیح طور پر ان دونوں سمندروں کا باب (دروازہ) ہے۔

چونکہ دوارسمندرم کے معنے عربی میں باب البحر ہوتے ہیں۔ اس لیئے یہ غلط فہمی پیدا کی جارہی ہے۔ ورنہ درحقیقت باب البحر اور دوارسمندرم میں کوئی تعلق نہیں ہے - قدیم ہندوستان میں اس قسم کے بہت سے نام پائے جاتے ہیں۔ دوارکا گجرات کا ایک مشہور شہر ہے۔ دوارکا کرشن جی کی جائے پیدائش کا بھی نام ہے۔ دوارکا کے معنی دروازہ کے ہیں۔ جس طرح دہلی کے معنے دہلیز کے ہیں۔ ہندوؤں نے اس جگہ کا نام دوارکاسمندرم اس لیئے رکھا ہوگا کہ سمندر کے معنی کثرت کے بھی ہیں۔ اس سے ان کی مراد ہے۔ بہت سے دروازوں والا شہر۔ یعنے بڑا شہر۔ جس میں مکانات کی کثرت آبادی کی بہتات اور دروازوں کی افراط

ہے

میسور

اس نام کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ عربوں ہی نے اس ملک کا نام میسور رکھا تھا۔ یہ غلط فہمی بھی نام ہی کی وجہ سے ہوی ہے۔ میسور کے معنے عربی میں آسانی کے ہیں۔ اورتاویل یہ کی گئی ہے کہ عربوں کے جہاز یہاں آسانی سے لنگرانداز ہوتے تھے۔ اسی لئے عربوں نے اس کو ملک کو میسور نام دیا۔

کسی تاریخ یا جغرافیہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ کہ اس تمام ملک کو جواب ریاست میسور کہلاتا ہے۔ کسی زمانے میں میسور کہا جاتا تھا۔ یہ نام کوئی ۱۴۰ سال کی پیداوار ہے سلطنتِ خداداد کی تباہی کے بعد جب انگریزوں نے شہر میسور کو راجدھانی کے لئے انتخاب کیا تو کل ریاست کو بھی یہی نام دیا گیا۔ ورنہ خاص شہر میسور کوئی قدیم تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ جہاں ہڈناڈ کا پالیگار (زمیندار) سولھویں صدی عیسوی میں ایک معمولی قلعہ بنا کر رہنے لگا تھا۔ (اس کا مفصل بیان تاریخ میسور میں آ چکا ہے)

اگر ریاست میسور کی موجودہ تشکیل نہ ہوتی تو میسور کا نام بھی آج کوئی نہ جانتا۔ وہ ایک معمولی قصبہ ہی رہتا۔ اب اگر اس کو کھینچ تان کر یا عربی کے لفظی معنی لیکر یہ کہا جائے کہ یہاں عربوں کے جہاز آسانی سے لنگرانداز ہوتے تھے تو معلوم نہیں۔ میسور میں وہ کونسا سمندر تھا جس میں عربوں کے جہاز آکر لنگرانداز ہوتے تھے۔ اگر کوئی سمندر تھا تو کیا وہ خشک ہوگیا۔ حیرت ناک بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ ریاست جس کو میسور کا نام دیا گیا ہے۔ قدیم کرناٹک کا ایک حصّہ ہے۔ مغرب میں ساحل سمندر سے لگے ہوئے ملک کے شمالی حصّہ کو کوکن اور کنارا اور جنوبی حصہ کو کرالا یا ملیبار کہتے تھے۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ تمام ملک کو میسور ہی کہا جاتا تھا تو یقیناً یہ بھی ثابت کرنا پڑیگا کہ قدیم زمانے میں میسور ایک بہت

بڑی سلطنت تھی۔ جس کے زیر نگیں ملیبار، کنارا اور کوکن وغیرہ بھی تھے۔ کسی تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس لئے میسور کے متعلق یہ کہنا کہ یہ نام عربوں کا رکھا ہوا ہے۔ بالکل غلط ہے۔

مزار ابو تمیم انصاری رضؓ

مدراس کے قریب کولم نامی ایک گاؤں میں کسی بزرگ کا مزار ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہوگیا ہے کہ یہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ کا مزار ہے۔ یہاں ہر سال بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں آتی ہیں۔ پہلے تو یہ کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو تمیم انصاری رضی اللہ عنہ جو صحابی رسول اللہ تھے۔ ہندوستان آئے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تجارت کے لئے عرب جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر آتے تھے۔ لیکن حضرت ابو تمیم انصاریؓ کا نام کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اب اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابو تمیم انصاری رضی اللہ عنہ جنوبی ہند میں آئے بھی تھے تو انہیں کولم جیسے غیر معروف مقام میں آنے کی کیا ضرورت واقع ہوئی عرب بلاشبہ ساحل مدورا اور ساحل ملیبار پران شہروں میں آتے جاتے تھے جو کسی زمانے میں تجارتی منڈیاں تھیں۔ مگر کولم کوئی تجارتی منڈی نہ تھی۔

یہ بھی ہم فرض کر لیتے ہیں کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ کولم آئے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ عربی تاریخوں میں ابو تمیم انصاریؓ کا مزار ملک شام میں ہونا بتایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی غلط ہو۔ لیکن جو روایت حضرت ابو تمیم انصاریؓ کے متعلق مشہور رہی ہے وہ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کسی طرح عقل سلیم اس کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے وصیت کی کہ میری لاش دفن نہ کرنا۔ بلکہ ایک صندوق میں بند کر کے سمندر میں بہا دینا۔ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق آپ

کے عزیزوں اور دوستوں نے اس پر عمل کیا۔ اور صندوق کو ملک عرب کے سمندر میں بہا دیا وہ دریا میں بہتا، گھومتا پھرتا، موجوں اور تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا ہوا مدراس کے قریب کولم کے ساحل پر آ لگا۔ یہاں کے مقامی حاکم کو خبر دی گئی۔ اس نے صندوق کھلوایا تو اس میں ایک مقدس، نورانی پیکر بے روح نظر آیا۔ اور پہلو میں ایک تحریر شدہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پڑھوایا گیا تو میت کا حال معلوم ہوا۔ وہ نورانی لاش حسب وصیت سمندر ہی کے کنارے سپرد خاک کر دی گئی۔

اب مقام غور ہے کہ ایک جلیل القدر صحابیؓ رسولؐ پر کس قدر اتہام ہے کہ آپ نے احکام اسلام اور عمل رسولؐ کے خلاف یہ وصیت کی ہو کہ لاش صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دی جائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ عربی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ نے خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں انتقال فرمایا ہے۔ کس کی مجال تھی کہ اس زمانہ میں احکام اسلام کے خلاف کوئی وصیت یا کام کر سکتا۔ اس کے بعد یہ بھی غور طلب امر ہے کہ اگر راجہ نے اس کو پڑھوایا کیونکہ یہ تو عربی زبان میں ہو گی اس وقت یہاں عربی زبان جاننے والا تھا کون۔ ہندو راجہ اس وصیت پر عمل کرنا کیوں ضروری سمجھتا جبکہ ہندوؤں میں دفن میت کا رواج ہی نہ تھا۔ حضرت ابو تمیم انصاری کی وصیت پر عمل بھی کیا تو مزار پر کتبہ کیوں نہ لگایا۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ وصیت اب کس کے پاس محفوظ ہے۔ راجہ نے جب میت کو دفن کیا اور مقبرہ بنوایا تھا تو اس کے لئے کتبہ بھی لگا دینا آسان تھا۔ ہندوؤں نے اگر اپنی تاریخ مرتب نہیں کی تو کم از کم وہ اپنے چند کارنامے کتبوں کی صورت میں ضرور چھوڑ گئے ہیں۔

تیسرے۔ اس سے بھی قطع نظر کر کے یہ دیکھنا ہے کہ جب کولم میں اسلامی سلطنت نہیں تھی تو

اس کی دیکھ بھال اور نو لینٹ سولھویں صدی کے انجینئر کس طرح ہوتی رہی۔ یہاں تو جب تک گولکنڈہ کی اسلامی سلطنت نے اس ملک پر قبضہ نہیں کر لیا مسلمان لوگ آباد ہی نہ تھے۔ اگر اس واقعہ میں کچھ بھی حقیقت ہوتی تو گولکنڈہ کی تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مدورا میں اسلامی سلطنت قایم تھی۔ اور مشہور سیاح ابن بطوطہ جنوبی ہند میں آیا ہوا تھا۔ اگر یہ مزار حضرت ابوتمیم انصاری کا ہوتا تو سیاح ابن بطوطہ ضرور اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کرتا۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مزار حضرت ابوتمیم انصاریؓ کا نہیں ہے۔ اب جو مقبرہ بنا ہوا ہے وہ سو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی بہت بعد کا۔ اور قبر نہایت لمبی ہے۔ فن تعمیر کے جاننے والوں کا خیال ہے، کہ ساٹھ ستر برس سے زیادہ کا نہیں ہے۔ جبکہ مسلمانوں میں ضعف اعتقاد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مقبرہ بعد کو بنوایا گیا ہے۔ بہرحال کوئی قرینہ اس روایت مشہورہ کو باور کرنے کا نظر نہیں آتا۔

مطبوعہ برقی کوثر پریس معسکر بنگلور

چند تاریخی ناموں کی تشریح

نظہر نگر: ۔ ترچناپلی۔ مسلمانوں نے اس شہر کو حضرت نظہر وَلی کے نام پر یہ نام دیا تھا۔ حضرت نظہر ولیؒ کا زمانہ چارھویں صدی ہجری ہے۔

دہور سمندر، دوار سمندرم یا دوار کا سمندرم: ۔ ہوسے سالا سلطنت کا پائے تخت جس کو ہلے بید کہا جاتا ہے۔

معبر: ۔ جنوبی ہند کا مشرقی حصہ جو مدراس سے تناولی تک ہے۔

پائین گھاٹ و بالا گھاٹ: ۔ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اس میدانی ملک کو جو مشرق میں ہے پائین گھاٹ اور مغربی حصہ کو جو پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ بالا گھاٹ نام دیا۔ گھاٹ سے مراد پہاڑی ہے۔

فرنگی کنڈہ: ۔ مدراس کے قریب ہے۔ انگریز اس کو سنت تھامس مونٹ کہتے ہیں۔ لیکن مقامی طور پر پلے وارم کے نام سے مشہور رہے۔

چین پٹن یا چینا پٹن: ۔ مدراس۔

دوآبہ رائچور: ۔ ملک کا وہ حصہ جو دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیان واقع ہے۔

تنگ بھدرا: ۔ دراصل یہ دو دریا ہیں۔ ایک کا نام تنگا۔ دوسرے کا بھدرا ہے۔ مقام کڈلی میں ان دونوں کا انصال ہوتا ہے۔ جس کے بعد اس کو دریائے تنگ بھدرا کہتے ہیں۔

عرب ٹمل: ۔ یہ ایک مخلوط زبان ہے۔ جو عربی اور ٹمل زبان کی آمیزش سے جنوبی ہند میں پیدا ہوئی۔ اور آج بھی مستعمل ہے۔

ختم شد